تفریح کی ایک دوپہر
خالد جاوید

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

تفریح کی ایک دوپہر

خالد جاوید

Tafreeh Ki Aik Dopehr
(Short Stories)
By. Khalid Jawaid

پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء
کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی
طباعت: اے۔ جی پرنٹرز، کراچی

بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی
info@scheherzade.com

فہرست

آخری دعوت

"میں جو پہاڑیوں سے نیچے لاشیں لایا ہوں، تمھیں بتا سکتا ہوں کہ دنیا رحم سے خالی ہے۔اور سنو کہ خدا ہی رحم سے خالی ہو تو دنیا میں بھی رحم نہیں ہو سکتا۔"

یہودا امی خائی

سب سے پہلے تو مجھے یہ اجازت دیں کہ میں آپ کو بتا سکوں کہ اس کہانی کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں اور اگر دنیا میں موجود کسی کردار، یا ہونے والے واقعے سے ان کی کسی بھی قسم کی مطابقت ثابت ہوتی ہے تو اس کے لیے کم از کم میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

مگر مجھے ایک مکھوٹا چاہیے۔سچ بولنے کے لیے۔

اور اس طرح یہ کہانی میری یا آپ کی اخلاقی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔لیکن میں آپ سے ابھی کہہ دوں کہ کہانی کی سچائی کسی اجلاس میں نہیں، زبان کی اندرونی دنیا میں اپنی شرطوں پر ہی حلف اٹھا سکتی ہے۔یہ ایک قسم کا بڑبڑانا ہے۔مدھم اور دھیمے لہجے میں بڑبڑانا۔دوسری بات یہ کہ میرے اندر اتنی اخلاقی جرأت کبھی نہیں رہی کہ میں کسی صورت حال یا شخص پر طنز کر سکوں اس لیے اگر اس کہانی کو پڑھتے وقت کہیں طنز کا گمان ہو تو آپ اسے طنز نہ سمجھ کر طنز کا التباس ہی سمجھیں۔

مجھے اس صورتِ حال سے باہر آئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ اب یہ اس صورتِ حال کی یاد بھی نہیں ہے بلکہ اس یاد کی یاد ہے۔ بارش میں بھیگتے ایک فلمی پوسٹر کی طرح۔ اس طرح کہ اب اس صورتِ حال کے خط وخال، نقوش اور زاویے بہت کوشش کرنے پر ہی نظر آسکتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے بارے میں صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ اس صورت حال کے بعد جو کچھ ہوا اس کی ایک ایک تفصیل میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ایک جمے ہوئے منظر کی طرح۔ مردہ اور خاموش منظر۔ مگر اس میں میری دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو دراصل جس صورتِ حال کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اس میں سچ کہوں تو کوئی واقعہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہاں صرف ایک احساس تھا جو میری پیٹھ پر ایک گندی لجلجی چھپکلی کی طرح چمٹا ہوا ہے، ایک وہم یا اپ شگن کی طرح۔ اور جسے جھٹک دینے کے لیے ہی میں نے یہ کہانی کہنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، انسان کو ایک ملکھونا چاہیے سچ بولنے کے لیے۔ خاص طور سے میرے لیے سچائی بیان کرنا اس لیے اور مشکل سا معلوم ہو رہا ہے کہ اگر وہ حالات ایک دم عمومی یعنی عامیانہ طرز کے نہ تھے تو پھر ان کی سرحدیں مضحکہ خیزی سے خود کو قطعی طور پر محفوظ کر لینے میں ناکام رہی تھیں۔ ایسی صورت میں مضحکہ خیزی اور اس کی سفاکی آپس میں اس قدر گڈمڈ اور گھل مل جاتی ہیں کہ دونوں کو الگ الگ کرکے دیکھ سکنا بے حد جاں کاہی اور عرق ریزی کا کام ہے۔ اور اس کوشش میں میں اپنے اعصاب اور حواس پر زیادہ بھروسا نہیں کرسکتا اور اپنے اسلوب کے سلسلے میں بجا طور پر غیر متوازن قرار دیا جا سکتا ہوں، اس کمزور سے جواز کے بعد بھی، کہ اب ہمارا ہیرو اور مسخرہ ایک شخصیت میں مدغم ہو چکا ہے اور اس کی کوئی واضح سماجی شناخت باقی نہیں رہی ہے۔

اب دیکھیے کہ میں اپنی طرف سے ہرگز ٹھوس احساسات کو تجریدی شکل دینے کی کوئی سعی نہیں کر رہا ہوں مگر یہ ضرور محسوس کر رہا ہوں کہ کسی ان دیکھی طاقت کے تحت یہ احساسات تجریدی بنتے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے، میں بھی نہیں جانتا۔

مگر اب اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ مجھے اپنے حافظے کا تعاقب کرنے

کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا ہے۔ میں ایک بے چہرہ بھوت کی طرح اپنے حافظے کو پھر سے پکڑ لینے کے لیے بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اس کے لیے جگہ جگہ مجھے بیچا کا چہرہ لگانا پڑ سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا کہ بے چہرگی ہر بھوت کا مقدر نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میری یہ بھنبھنی سی آواز کب تک زندگی سے اپنے حصے کی روشنی مانگتی رہے گی۔

''آنپ کے پانس ماچس ہوں گیں''

یقیناً اگر زندگی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھر کی ہو جائے گی۔

تو یہ دراصل اپنے حافظے کے پیچھے میری ہی دوڑ ہے۔ ایک جنگ کی طرح یہ ایک دوسرا راستہ ہے۔ اپنی نجی اور اداس بدشگونیوں سے بھرا ہوا راستہ۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ شام انتہائی سرد مگر جاڑوں کی عام شاموں کی طرح تاریک سی یا اپنی بل میں دبکی ہوئی سی نہیں تھی۔

''آج بھی چاندنی رات ہوگی۔'' میں نے دل میں خیال کیا تھا۔

اندھیری چکردار گلیوں میں سے گزرتا ہوا جب میں ان کے گھر کے دروازے کے تقریباً سامنے پہنچنے ہی والا تھا تو اچانک بجلی آ گئی۔ قطار سے بنے تقریباً ایک جیسے گھروں کی دیواروں کے نچلے حصے پر بنے ہوئے سنڈاس روشن ہو گئے۔ گلی کو درمیان سے کاٹتی ہوئی نالیوں میں کالا پانی چمکنے لگا۔

ٹین کے کواڑ میری دستک سے غیر معمولی طور پر بجنے لگے۔ کھڑکی کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا۔ کالے مفلر میں لپٹا ان کا چہرہ تھوڑا سا باہر آیا، پھر پٹ زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

اندر ہلکی سی ہلچل محسوس ہوئی، جیسے کوئی میز یا کرسی فرش پر ادھر سے ادھر کھینچی گئی ہو۔

ٹین کے کواڑ کھل گئے۔

''آؤ۔ آؤ کہاں رہ گئے تھے؟'' کالے مفلر میں لپٹے ان کے مغموم اور سنجیدہ چہرے پر دو آنکھیں تشویش سے پر تھیں۔

میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے ملانے کے لیے آگے بڑھایا۔ مگر تب ہی میں نے غور

کیا کہ ان کے دونوں ہاتھ کسی شے میں سنے تھے جن کو وہ دانستہ طور پر کپڑوں سے الگ کیے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور ان کے بیٹھک نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں تخت پر کھانا لگا ہوا تھا۔ ہمارے مشترکہ دوست (جو غزل کے بہت عمدہ شاعر ہیں اور اب آگے اس کہانی میں میں انھیں غزل گو کہہ کر ہی مخاطب کروں گا) چمڑے کی سیاہ جیکٹ میں ملبوس کھانا کھا رہے تھے۔

غزل گو کا چہرہ ہمیشہ خشک اور ستا ہوا رہتا ہے۔ سردیوں میں ان کے چہرے کی یہ خصوصیات اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

مظفر میں لپٹے اپنے چہرے کو ایک بار آستین سے پونچھتے ہوئے صاحب خانہ نے کہا:

''بس جلدی سے آجاؤ''

''کیا بات ہے، آپ لوگوں نے اتنی جلدی شروع کر دیا؟'' میں نے گھڑی کو ناخوش گواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی ......ہم لوگوں نے ابھی ابھی کھانا شروع کیا ہے۔ کافی دیر سے تمھارا انتظار کر رہے تھے۔ بلکہ یہ تو آدھ گھنٹے پہلے تمھیں گھر سے لینے بھی گئے تھے، مگر تم گھر پر تھے ہی نہیں۔''

غزل کے شاعر نے بے حد شائستگی سے صفائی دی۔ ''مگر جناب ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔ نو بجے سے پہلے میں رات کے کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو ابھی بھی بالکل بھوک نہیں ہے۔'' میں پس و پیش میں پڑتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ تم سمجھتے نہیں۔ بس آؤ بیٹھ جاؤ۔ یہ لو رکابی۔'' صاحب خانہ (یہ نظم کے بہت عمدہ شاعر ہیں) نے تشویش ناک انداز میں کہا۔ وہ جب مظفر باندھتے ہیں تو ان کا چہرہ حد سے زیادہ مغموم نظر آنے لگتا ہے۔ مگر آج مغمومیت کے ساتھ ساتھ اس پر پُر اسراریت کے آثار بھی نمایاں تھے۔ میں آج رات یہاں ایک دعوت میں مدعو تھا۔ یہ دعوت اس سلسلے میں منعقد کی گئی تھی کہ ان کی ایک نظم ایک اعلیٰ ادبی جریدے میں شائع ہوئی تھی۔ نظم میں ملک کے ناساعد حالات کو بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا تھا اور میرے خیال میں یہ نظم بیانیہ شاعری کی ایک

اچھی مثال تھی۔ اس دعوت کے سلسلے میں دو باتیں گوش گزار کرنا ضروری ہیں۔

پہلی تو یہ کہ یہ دعوت ہمارے مشترکہ دوست (جو غزل کے بہت عمدہ شاعر ہیں) کے پیہم اصرار پر منعقد کی گئی تھی۔ اور دوسری یہ کہ یہ دعوت ایک بہت ہی روایتی قسم کے کھانے پر مشتمل تھی۔ اس روایتی قسم کے کھانے کی مقبولیت سردیوں میں بڑھ جاتی ہے۔ اس کھانے کے بیشتر بلکہ تقریباً تمام اجزاء بڑی بڑی ہڈیوں پر مبنی ہیں میں ایک بار زور دے کر کہوں گا کہ اس کھانے کے دوران آپ ان بڑی بڑی ہڈیوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں۔

اتنی جلدی کھانا کھانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں کئی لوگوں سے مل کر اور وہاں باقاعدہ ناشتہ وغیرہ کر کے آیا تھا۔ میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ میں تو صرف اس لیے اپنی دانست میں یہاں جلدی پہنچ گیا تھا کہ کھانے سے پہلے ان کی نظموں اور ان کی غزلوں اور افسانوں پر (اگرچہ افسانوں پر آخر میں) تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ یہ تو ہے کہ یہ تبادلۂ خیالات ہمیشہ کی طرح کچھ فرسودہ اور سنی سنائی باتوں پر ہی مشتمل رہتا ہے، پھر بھی بالکل تبادلۂ خیالات نہ ہونے سے بہتر ایک فرسودہ تبادلۂ خیالات ہی ہے۔ جی ہاں۔ اور آپ یہ بات فخر سے کہہ سکتے ہیں بلکہ اس مشہور زمانہ مقولے کے برابر میں شان سے لکھ سکتے ہیں جو کچھ اس طرح ہے یا اس سے ملتا جلتا ہے فی الحال میں اسے صحیح طور پر یاد کرنے سے قاصر ہوں۔ ''بہتر یہ ہے کہ تم ایک غیر مطمئن اور مغموم سقراط بن جاؤ، بجائے اس کے تم ایک مطمئن اور مسرور سور بن جاؤ۔''

ہم سور نہیں بننا چاہتے۔ جی ہاں ہماری ساری دماغی کاوش دراصل اس نکتے میں پوشیدہ ہے کہ ہم ایک غیر مطمئن اور مغموم سور بھی نہیں بننا چاہتے۔

مگر آگے چل کر آپ کو اس افسوس ناک امر کے بارے میں علم ہوگا کہ ہمیں تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ مگر یہ اس تبادلۂ خیالات کو کرنے کا شوق ہی تھا جو میں بے حد تیز تیز چلتا ہوا ان اندھیری چکر دار گلیوں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

جب میں تیز تیز چلتا ہوں تو میرے کاندھے آپ ہی آپ جھک جاتے ہیں۔

مگر آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میری طبیعت کو کتنا گراں گزرا ہوگا کہ جب میں ان کے

بیٹھک نما کمرے میں داخل ہوا تو صاحب خانہ اور غزل کے شاعر، دونوں باقاعدہ کھانا کھا رہے تھے بلکہ تقریباً کھانا ختم کر چکے تھے۔

میں کچھ شش و پنج میں پڑتا ہوا تخت پر بیٹھ گیا۔

''جوتے اتارو اور سنبھل کر بیٹھ جاؤ۔ یہ لو رکابی۔'' صاحب خانہ نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

میں نے جوتے اتارے تو ایک ناگوار بو کمرے میں پھیل گئی۔ سردیوں میں میرے پیر بہت پسیجتے ہیں۔

''دراصل بات یہ ہے کہ......،، وہ انتہائی راز دارانہ لہجے میں میرے کان کے پاس اپنا منہ لے آئے۔'' ...... کہ ان کی حالت آج شام پانچ بجے سے بہت خراب ہے ......تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔''

اچھا......؟ میں احمقانہ انداز میں بولا، حالاں کہ ان کے تئیں یا اس امر کے تئیں یہ میرا سب سے زیادہ سنجیدہ انداز تھا۔

''ہاں'' انھوں نے سر ہلایا۔ اور مظفر میں لپٹے ان کے چہرے کی مغمومیت کچھ اور اور نمایاں ہو گئی۔

اسی لیے ہم نے دیر نہیں کی۔'' غزل گو نے کھانا ختم کر کے پانی کا کٹورہ ہونٹوں سے لگایا۔ کٹورہ تانبے کا تھا۔ وہ ہمیشہ تانبے کے کٹورے میں ہی پانی پیتے ہیں۔ اس سے ان کے خون کا دباؤ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔

''بس شروع کرو۔ لو ٹھیک سے سالن نکالو۔ اب دیر مت کرو وہ کبھی بھی ......میرا مطلب ہے کہ......مر سکتی ہیں۔'' صاحب خانہ نے سفید تام چینی کا خوبصورت ڈونگا میری طرف بڑھایا۔ ڈونگا چھوٹی بڑی اور مختلف اشکال والی ہڈیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

''وہ کبھی بھی مر سکتی ہیں۔'' میں نے اپنے دل میں دہرایا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

اب کمرے میں تقریباً سناٹا تھا دیوار پر لگی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ وہ دونوں تخت سے اتر کر سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور انھوں نے اپنے اپنے سگریٹ سلگا لیے

تھے۔ میں تخت پر پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میری تنگ پتلون کمر اور پیٹ پر پھنس رہی تھی (ادھر چند ماہ سے میری توند پھر نکل آئی ہے) میں بے تحاشا کھائے جا رہا تھا۔

میں بے تحاشا کھائے جا رہا تھا۔ اور یقیناً یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ ایک ناقابل فہم سی بات۔ ان کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی کہ وہ کبھی بھی مر سکتی ہیں، میرے اندر نہ جانے کہاں کی اور کب کی سوئی ہوئی بھوک جاگ اٹھی تھی۔ میں ازلی بھوکا تھا۔ اگرچہ بھوک انسانی قالب میں پوشیدہ ایک حیوان کی ضرورت بلکہ جبلت تھی، مگر شاید اس وقت میرے شانوں پر ایک اجتماعی بھوک سوار تھی میں اپنے لیے نہیں کھا رہا تھا بلکہ صدیوں پرانی اجتماعی لاشعوری بھوک کے پھندے میں پھنسی نسل انسانی سے پہلے نمو پذیر ہونے والی تمام چھپکلیوں کے لیے کھا رہا تھا میں ارتقا کے سفر میں، اجنبی راستے پر ایک خود رو جنگلی پودے کی طرح اُگے ہوئے انسانی جبڑے کا قرض ادا کر رہا تھا۔ وہ ایک اکیلا جبڑا جس نے چبانا سیکھا تھا۔ اپنی ماہیت تبدیل کرتی ہوئی، کچلتی اور لتھڑتی ہوئی زندگی کا اتارا گیا ایک ایک چھلکا میرے اوپر آسیب کی طرح سوار تھا۔

لیکن یہ سب تو میں اب سوچ اور بیان کر سکتا ہوں۔ اس وقت تو میں بس صرف کھا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح۔ بغیر کسی جذبے کے۔ نہ دکھ نہ سکھ نہ گھبراہٹ نہ پریشانی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی اعصاب زدگی ہی ہو۔'' اس سے پہلے کہ وہ مر جائیں، تم کھانا کھا لو۔''

میرے جسم میں اپنی عریانی کو سمیٹتی ہوئی بے حیا زندگی ترغیب آمیز لہجے میں بولی۔

میں کھائے جاتا تھا۔ میرے منہ سے ہڈیاں چوستے وقت سسکاریاں نکلتیں، تھوک کے جھاگ اڑتے، شوربے میں انگلیوں کے پورے اور ناخن سب ڈوبے جاتے تھے۔ کپڑوں پر سالن گرنے لگا۔ سامنے رکھی روٹیاں آہستہ آہستہ کم ہونے لگیں۔ تام چینی کا ڈونگا خالی ہونے لگا۔ تخت پر بچھی سفید چادر گندی ہونے لگی۔

دراصل مجھے اپنے منھ اور حلق میں چلتے نوالوں اور کسی کی دم توڑتی ہوئی سانسوں کے درمیان ایک خاص رفتار کو برقرار رکھنا تھا۔

میں ایک دوڑ لگا رہا تھا۔ ایک لمبی، ننگی مگر بے حد خود غرض دوڑ۔ میں ایک بجے بجائے برق

رفتار گھوڑے پر شاہانہ انداز سے سوار تھا۔ زندہ، میں موت سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ کیا میں اپنی موت سے مقابلہ کر رہا تھا؟ شاید ہاں، شاید نہیں۔ کیوں کہ اس مقابلہ میں جیت کا امکان صرف اس طرح پیدا ہوسکتا تھا کہ میں اپنے دانتوں، جبڑوں، زبان اور رال میں بدل جاؤں۔

نوے سال کی ایک بوڑھی عورت کی پل پل ڈوبتی سانسیں، بند آنکھیں اور پوپلا منہ میرے خطرناک دشمن تھے۔ مجھے ان سے مقابلہ کرنا تھا۔ میں یقیناً ہار بھی سکتا تھا۔

مگر دیکھیے اب مجھے واقعتاً یہ احساس ہونے لگا ہے کہ یہ تو کچھ جواز یا صفائی پیش کرنے جیسی بات ہوتی جا رہی ہے۔ نہیں، میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت میں صرف اور صرف کھا رہا تھا۔ اور یہ بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں لاکھ کوشش کرنے پر بھی آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں اس وقت کھانے کے علاوہ اور کیا کر رہا تھا۔ اس لیے میری نیت پر شک آپ ہرگز نہ کریں، ورنہ اس کہانی میں آپ کی دلچسپی اگر ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گی۔

اب اگر بے حد سادگی سے کہوں تو بس اتنا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ میرے کھانا کھا لینے سے پہلے ہی کہیں مر نہ جائیں۔ اصل نکتہ اس امر میں پنہاں ہے۔ اگرچہ میں اسے اتنی آسانی اور بے حیائی سے اجاگر نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی تو میں ایک احساس کو دوسرے احساس کی زمین پر بساط کی طرح بچھا رہا ہوں۔ یہ شطرنج کی ایک عیارانہ چال ہے۔ کسی حد تک سفلہ پن لیے ہوئے جس میں میرے دائیں ہاتھ کی لکھتی ہوئی انگلیوں کی اکڑن کا احساس بھی شامل ہے۔

اور بالآخر میں کامیاب ہوا۔ میں نے کھانا ختم کر لیا اور وہ نہیں مریں۔ میں نے سرخرو ہو کر ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ (مسالہ دار کھانوں کی وجہ سے جاڑوں میں بھی مجھے پسینہ آ جاتا ہے حالاں کہ اس بے ہنگم انداز میں وحشیوں کی طرح کھانا کھانے کی وجہ سے میرے سر کے بالوں میں بھی پسینہ آ گیا تھا اور بال گیلے ہو گئے تھے)۔

لیکن یہ اس احساس کا صرف ایک رخ یا اس کا عمومی بیان ہے۔ اگر گہرائی سے سوچوں اور غور کروں تو پاتا ہوں کہ بھوک کے آگے میں ایک فاحشہ کی طرح بچھ گیا تھا۔

میری آنکھوں بلکہ ناک تک سے پانی نکل رہا تھا۔

''مرچ کچھ کھل گئی ہے۔'' صاحب خانہ نے کچھ افسوس کے ساتھ کہا۔

'' کچھ شوربہ بھی پتلا رہا۔'' غزل کے شاعر نے سگریٹ کا لمبا سا کش کھینچا اور ان کے ہونٹ زیادہ خشک نظر آنے لگے۔

''نہیں ...... ایسی بات نہیں ۔ بہت اچھا مال تھا۔ روغن بھی خوب دیا۔ میری انگلیاں آپس میں چپک رہی ہیں۔'' میں نے صاحب خانہ کو اپنی اُنگلیاں دکھاتے ہوئے دل کھول کر تعریف کی۔ پھر تخت پر بچھے دسترخوان پر پڑی ہڈیوں کو دیکھنے لگا۔

میرا ہمیشہ یہ ایقان رہا ہے کہ کھانا یا ناشتہ وغیرہ جب دسترخوان یا میز پر لگایا جاتا ہے تو بڑا کشش انگیز محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اسے دیدہ زیب بنانے کی حتی الامکان کوشش بھی کی جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ اسے دیدہ زیب یا پرکشش بنانے کی پروا نہ کریں تب بھی پکائے جانے والے برتنوں میں سے نکلا ہوا کھانا اپنے فطری خدوخال میں یا اپنی ماہیت میں ہی ایک قسم کی جاذبیت رکھتا ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ کھانا کھا چکنے یا ناشتہ کر لینے کے بعد لوگ عام طور پر اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے ۔ مثال کے طور پر پلیٹ میں چھوڑے ایک دو بسکٹ اداسی سے ادھر ادھر پڑے رہتے ہیں اور ...... ہڈیاں ...... ان کی تو بات ہی مت پوچھیے۔ وہ تو بہت ہی بھدے پن اور بدسلیقگی کے ساتھ پلیٹ میں ڈال دی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چھوٹی بڑی ہڈیوں کو اگر حساب کتاب سے منظم کر کے لگایا جائے تو کھانے کے بعد کی حیوانی تشفی کے بعد کافی حد تک جمالیاتی یا روحانی تشفی بھی ہو جائے۔ کچھ کچھ اس طرح جیسے جسمانی ملاپ کے بعد عورت اور مرد کروٹ بدل کر خراٹے نہ لینے لگیں اور تھوڑے سے رومانی ہو کر (دکھاوے میں سہی) ایک دوسرے کی بانہوں میں سمٹ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

یہی سبب تھا کہ کھانا کھانے کے بعد دسترخوان اور رکابی میں پڑی یہ ہڈیاں اپنے غیر آرٹسٹک منظر کی وجہ سے مجھے افسردہ سی نظر آئیں ۔ مگر اب سوچتا ہوں تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ چوسی گئی ہڈیوں کا یہ ڈھیر شاید اپنی اُداسی کی وجہ سے قدرے دلچسپ بھی نظر آتا تھا۔ یا ممکن ہے کہ ایسا صرف ہڈیوں کی بدنمائی اور بھدے پن کے باعث ہو۔ ویسے میں عرصے سے

اس ادھیڑ بن میں مبتلا ہوں کہ اداسی اور بھدے پن کے درمیان جو ایک نا قابل فہم سا رشتہ ہے، اسے کوئی نام دے دوں۔

ماچس کی ایک تیلی نکال کر میں دانت کریدنے لگا اور تھوڑی سی دیر کے لیے خالی الذہن ہو گیا۔ جب آپ ماچس کی تیلی سے دانت کریدتے ہیں تو ایک صوفی کی طرح بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ''سنا ہے آج کل یورپ میں شتر مرغ، زیبرا اور کنگارو کا گوشت کھایا جا رہا ہے۔'' غزل گو نے بلند آواز میں کہا۔

''اوں...... وہ، وہاں بکروں وغیرہ میں منہ اور پیروں کی بیماری پھیل گئی ہے۔'' صاحب خانہ (جو نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں) کی تقریباً کپکپاتی ہوئی آواز اس اطلاع کی تمام فالتو مقدار کو کمرے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک رگڑنے لگی۔

''کنگارو کا گوشت کیسا ہوتا ہوگا؟'' میں نے ماچس کی تیلی پھینکتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کچھ کھٹا کھٹا سا ہوگا۔'' نظم کے شاعر نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''ضروری نہیں۔ مگر ریشے بہت ہوتے ہوں گے۔'' غزل کے شاعر نے اپنی سیاہ چمڑے کی جیکٹ پر ہاتھ پھیرا۔

ریشوں والا گوشت مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔ اس کی وجہ میری ڈاڑھ میں لگا کیڑا ہے۔ کیڑے نے وہاں نہ جانے کیا کیا چاٹ ڈالا ہے۔ وہاں جو چیز بھی پھنس جائے، سڑنے لگتی ہے۔ اس کے بعد گال کا نچلا حصہ سوجنے لگتا ہے۔ حلق کے پوشیدہ غدود باہر ابھر آتے ہیں۔ دانت سے ٹیس اٹھتی ہے۔ مگر اس عارضے میں مبتلا ہو کر مجھے اپنی ڈاڑھ کو ہمیشہ زبان سے کریدتے اور ٹھیلتے رہنے کی بھی عادت سی ہو گئی ہے۔ اور جب میں ایسا کرتا ہوں تو نرم ملائم اجنبی گوشت کا سراسیمہ سا کر دینے والا ذائقہ ملتا ہے۔ جن کی ڈاڑھیں نہیں گلتیں یا گرتیں وہ اس پر اسرار اندھے ذائقے کو کبھی محسوس نہیں کر سکتے۔

ابھی انسان کے اندر کتنا گوشت، کتنی ہڈیاں اور کتنی جھلیاں ایسی ہیں کہ ''زبان'' کی رسائی وہاں کبھی ممکن نہیں ہوگی۔

میں نے چاہا کہ منطقی اثبات پسندوں کے نظریہ زبان کو بلند آواز میں بیان کرنے لگوں۔ مگر اس کے بجائے میں نے ہلتی داڑھ کے عقب میں چھپے گوشت کے اس ذائقے کو فتح کرنے کے لیے غور کیا۔

''اچھا صاحب۔ یہ لوگ سب کچھ کھا لیتے ہیں۔ بس باتیں ہی باتیں ہیں۔'' صاحب خانہ نے اپنا کالا مفلر کچھ اور قاعدے سے لپیٹا۔

''کون لوگ؟'' غزل کے شاعر نے پوچھا۔ پھر فوراً ہی سمجھ گئے۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اچھا...... یہ لوگ! ہاں یہ تو ہے۔''

''مگر یہ لوگ ایسے نہیں کھا سکتے۔'' میں نے بکھری ہوئی ہڈیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہنتے ہیں۔ سالے سور کھا رہے ہیں، یہ نہیں کھا سکتے۔'' نظم گو نے اپنے چہرے پر طنز اعلیٰ پیدا کر لیا جو کالے مفلر کی وجہ سے کچھ اور گہرا محسوس ہوا۔

غزل کے شاعر نے کھنکھارا۔ جب وہ اس طرح کھنکھارتے ہیں تو ہمارے علم میں ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا:

''ان لوگوں کا تہذیبی اعتبار سے ذائقے کا کبھی مکمل ارتقا ہی نہیں ہو سکا۔ میرا مطلب ہے کہ یوں تو یہ لوگ جانے کیا الا بلا کھاتے رہے۔ گھاس پھوس سے لے کر طرح طرح کے جانور، کیڑے مکوڑے۔ مگر وہ جو ایک معیار ہوتا ہے ذائقے کا...... بلند، اعلیٰ اور نفیس، اس کے لیے ان کی زبان میں کبھی خلیے ہی نشوونما نہ پا سکے۔ یہ سب ان کی تہذیب کے ارتقا کے اچانک ٹھہر جانے کے باعث ہوا۔ اور صاحب، کھانے کا کوئی تعلق روحانیت سے نہیں ہے۔ آپ کسی بھی قسم کا گوشت کھا کر کسی بھی قسم کے رشی منی ہو سکتے ہیں۔

مجھے معاف کیجیے اگر میں اس منظر اور گفتگو کو ہو بہو آپ تک نہیں پہنچا پا رہا ہوں۔ شاید یہ سب انھوں نے بالکل اسی طرح نہیں کہا تھا۔ آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ شاید میں اس موت کو بھول گیا ہوں جسے میں نے کھانا کھا کر جیت لیا تھا۔ مگر نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فی الحال میں ایک احساس کو دوسرے احساس کی زمین پر بساط کی طرح بچھا رہا ہوں اور

میرا یہ عیارانہ کھیل ابھی جاری ہے۔ مگر آپ مجھ سے قسم لے لیجیے کہ میں کہیں بھی تمثیل یا علامت کا استعمال کروں۔ اور استعارہ، اس سے تو میں بہت پہلے تائب ہو چکا ہوں کہ وہ تو کہانی کے خوب صورت باغ میں گھس آیا ہوا جنگلی سور ہے۔ (اس کم بخت جانور کا نام نہ جانے کیوں آج بار بار ذہن میں چلا آ رہا ہے)۔

'' آپ لوگوں نے شاید کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ......'' صاحب خانہ نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ اس وقت ان کا چہرہ انتہائی سنجیدہ تھا۔ جس پر کسی بے حد پوشیدہ مگر اہم ترین نکتے کو اجاگر کر دینے کا جنون بھی نظر آ رہا تھا۔

'' کہ یہ لوگ دراصل ڈرتے ہیں...... ان ہڈیوں کو برداشت نہیں کر پاتے۔ انھیں وہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اس قسم کے کھانے دیکھ کر ہماری قوم اور مذہب کا جاہ وجلال اچانک ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ لوگ بے پناہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر ہماری عبادت گاہوں پر حملہ کر کے انھیں منہدم کرنے لگتے ہیں۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی، مگر میرے ذہن میں ایک بات کھٹکی۔

'' یہ ہڈیوں سے ڈرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ لوگ تو گھڑوں اور مٹکوں میں اپنے مردوں کی ہڈیاں لیے لیے پھرتے ہیں۔''

'' بات ہڈیوں کی نہیں ہے۔ کھانوں کی ہے۔ اسی لیے تو وہ اور زیادہ ڈر جاتے ہیں۔ اصل میں ہم لوگوں کے کھانے بڑے بارعب قسم کے ہیں۔ ہڈیوں کا کیا ہے۔ وہ تو چوس کر پھینک دی جانے والی اشیاء ہیں۔'' غزل گو نے سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر پھینکا اور اس کوشش میں ان کے ہونٹ اور خشک ہو گئے۔ مگر فوراً ہی انھوں نے دوبارہ کہنا شروع کر دیا۔

'' اب اس واقعے کو ہی لے لیجیے۔ یاد نہیں آ رہا کہ کس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک انگریز پرانی دلی کی ایک گلی میں بیٹھنے والے نان بائی کی دوکان سے بریانی کھا کر مع اپنے اہل وعیال کے مسلمان ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جس قوم کے کھانوں کا معیار ایسا اعلی اور نفیس ہو، اس قوم کا دین اور مذہب کیسا بلند اور اعلی ہو گا۔''

''بس یہی تو میں کہنا چاہتا تھا۔'' صاحب خانہ جوش میں آ گئے۔

'' گوشت ووشت کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سالے سور کھا رہے ہیں۔ بات اس شجاعت اور طاقت اور حوصلے کی ہے۔ ہم نے جس طرح کائنات کی حیوانی قوتوں کو پسپا کر کے ارتقا کے سفر کو بڑھایا اور اپنی روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی، اس میں کہیں اس بھرپور اعتماد کا تعاون بھی شامل تھا کہ ہمارا کھانا ایک پاکیزہ اور جرأت مند شکار کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ جی ہاں ایک پاکیزہ اور جرأت مندانہ شکار، جس میں قوی ہیکل جانوروں کی ہڈیاں یوں ہی چوس کر پھینک دی جاتی ہیں۔ یہی دیکھ اور سمجھ کر ہی تو ان پر احساسِ کمتری طاری ہے۔'' نظم کے شاعر (جو صاحب خانہ بھی ہیں) نے جلدی جلدی اپنی بات ختم کی اور پھر بے پروا سے نظر آنے لگے۔

ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ میں کس قدر مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ کیوں کہ میں کہانی بیان کر رہا ہوں اس لیے مجھے اس میں دلچسپی کا بھی عنصر برقرار رکھنا چاہیے۔ اب اس گھسی پٹی بات کو کیسے دہراؤں کہ کہانی اور زندگی دونوں ایک شے کا نام ہیں۔ زندگی کبھی تو دلچسپ ہوتی ہے اور کبھی بڑی ٹھس۔ یہ کہانی بھی جگہ جگہ تو ضرور دلچسپ ہے مگر جگہ جگہ بڑی ٹھس۔ اس لیے دل سے تو میری نیک نیت اور کوشش یہ ہے کہ میں کہانی کو زندگی کی طرح آگے بڑھاتا چلوں۔ جب کہانی کے حصے کی فطری دلچسپی آئے گی تو آپ اس سے ضرور فیض یاب ہوں گے۔ مگر شاید میں ایسا نہیں کر پا رہا ہوں اور مصنوعی دلچسپی پیدا کرنے کے سلسلے میں بے وجہ غیر ضروری لوازمات کہانی میں ٹھونستا جا رہا ہوں۔ مگر یہ بھی ہے کہ یہ غیر ضروری لوازمات وجود کی بے معنویت کا استعارہ بن سکتے ہیں۔ یوں تو میں استعارے سے توبہ کر چکا ہوں، مگر اگر میرے کسی لفظ یا جملے نے خود ہی استعارہ بننے کی ٹھان لی ہو تو پھر سمجھ لیجیے کہ کہانی کے خوبصورت باغ میں جنگلی سور گھس آیا ہے۔ (اب یاد نہیں کہ سور کا لفظ میں نے پانچویں بار استعمال کیا یا چھٹی بار)۔

'' لائیے صاحب مجھے بھی ایک سگریٹ دیں۔'' میں نے ہاتھ بڑھایا۔ صاحب خانہ نے جو نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں، میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھا دیا۔

جب میں سگریٹ سلگانے کے لیے جھکتا ہوں تو ہمیشہ کنکھیوں سے ادھر ادھر ضرور جھانکا کرتا ہوں۔ عجیب بے تکی عادت پڑ گئی ہے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔

غزل کے شاعر نے اپنی سیاہ چمڑے کی جیکٹ کو سہلاتے ہوئے شرارتی انداز میں نظم کے شاعر کی طرف دیکھا۔ اُن کے ستے ہوئے گال پھیلنے لگے اور پھر وہ قدرے بدلی ہوئی آواز میں بولے:

''اُن کی عورتیں ...... ان کی عورتیں دل و جان سے چاہتی ہیں کہ ایک بار کوئی ہم میں سے ایک دن ان کو......''

اُنھوں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کھجایا، پھر شاید ہنستے ہنستے رہ گئے۔

''عورت طاقت ور مرد کے جوتوں کو بوسہ دیتی ہے۔ ہمارے کھانے بے حد مردانگی بخش ہوتے ہیں۔'' نظم کے شاعر (صاحب خانہ) نے فیصلہ صادر کر دیا۔

اس کے بعد دونوں میں عورت اور اس کے Libido کے موضوع پر ایک ''مردانہ'' مکالمہ شروع ہو گیا جس میں ان دونوں نے اپنے بلند اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے حصہ لینے کا موقع اس لیے نہیں دیا کہ ایک تو میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا اور دوسرے ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی۔

یہاں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میں ایک بے حد بزدل آدمی واقع ہوا ہوں اور بزدلی اپنی کمینگی کو ہمیشہ پیٹھ پر لادے لادے پھرتی ہے۔ ایسی کمینگی کبھی اپنا وجود ختم نہیں کرتی جو بزدلی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ میری کمینگی ہی تھی جو میں وہاں شرما شرما کر جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا جو تخت کے نیچے تھکے تھکے سے پڑے تھے۔ حالاں کہ میں اگر اپنی پر اتر آتا تو اس موضوع پر غزل کے شاعر اور نظم کے شاعر دونوں کی زبان بند کر سکتا تھا۔ مگر میں نے ریاکاری سے کام لیا۔ اس قسم کی مکاریوں میں میرا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نہ صرف بے حد دھیان اور دلچسپی کے ساتھ ان کی چٹخارے دار گفتگو کو سن رہا تھا بلکہ اس موضوع اور بات چیت کو ایک

باوقار معیار عطا کرنے کی غرض سے بے حد احترام کے ساتھ جھینپا جھینپا سا مسکرا رہا تھا اور اپنے جوتے دیکھے جا رہا تھا۔

''پتہ ہے دبلی پتلی ڈھانچہ جیسی عورت اگر ایک بار پوری طرح سے جوش میں آ جائے تو بڑے سے بڑے مرد کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اس کی ہڈیوں میں ہی تو اصل جان پوشیدہ رہتی ہے۔'' غزل کے شاعر نے دبی ہوئی آواز میں اطلاع دی اور ان کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ ستا ہوا اور بدرونق نظر آنے لگا۔ مگر میرا ذہن اچانک بھٹکنے لگا۔ مجھے بے اختیار ''وہ'' یاد آ گئی۔

وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر مجھے نہ جانے کیوں اس کی یہ بری عادت شدت کے ساتھ یاد آ رہی ہے کہ وہ مجھے بوسہ دینے کے لیے اپنے ہونٹوں کو ہمیشہ کھلا رکھتی تھی۔ آہستہ سے اس کی انگلی چھو لینے پر بھی اس کے ہونٹ اچھے خاصے کھل جایا کرتے تھے اور آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگتی تھیں (یہ ایک بری عادت تھی۔ تھی نا؟)

یہ ساری گفتگو ٹھوس اشیا کے بارے میں نہیں تھی۔ ٹھوس اشیا وہ ہی ہوتی ہیں جو کہ وہ ہیں۔ ان کے تمام امکانات سب پر ہی اجاگر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بھید اپنے ''ہونے'' میں ہی آشکار کر دیتی ہیں۔ مگر جب وہ بے جا طور پر انسانی دنیا اور انسانوں کے بدلتے ہوئے باہمی رشتوں کی دنیا میں دخل اندازی کرتی ہیں تو اس کا نتیجہ وہی بکھری ہوئی صورتِ حال ہوتا ہے جس کا سب سے نمایاں عنصر مضحکہ خیزی ہے۔ تو کیا ہماری تمام باتیں لایعنی تھیں؟ مجھے ایک پل کو شدید طور پر محسوس ہوا کہ ہم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے بارے میں گفتگو کرنا ان کے لیے ایک پناہ گاہ بن گئی تھی۔ اب اپنی اپنی شاعری کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا اس لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ یہاں سے گفتگو کی غیر محفوظ سرحدیں شروع ہوتی تھیں۔ احساسِ جرم کو کہیں دبا لے جانا ضروری تھا۔ یہاں ایک ہلکا سا ہی سہی، مگر احساسِ جرم وہاں موجود تھا، صرف اس لیے کہ کھانا کھایا گیا تھا۔ اس وقت بھی جب موت ان پر مکھی کی طرح بھنبھنا رہی تھی۔ یہ جلد ہی وقوع پزیر ہونے والی ایک انتہائی معین موت تھی۔ جو بہت واضح اور غیر مبہم انداز میں ہمارے درمیان ہی آ اور جا رہی تھی۔ مگر ہم نے اسے جھٹلایا تھا۔

کھانا کھا کر ہم نے اپنی آنتوں، معدے اور جبڑوں کی سلامتی کا جشن منایا تھا۔

لیکن میں قبول کرتا ہوں کہ ان لمحات میں مجھے کسی احساسِ جرم کا سیدھا سیدھا پتہ نہیں چل سکا (یہ تمام یاوہ گوئی تو میں اب کر رہا ہوں) صاحبِ خانہ کے چہرے پر کبھی کبھی پریشانی یا غمگینی کی سی کیفیت نظر آ جاتی تھی مگر اس کی وجہ شاید ان کے گھر میں سرسراتی ہوئی وہ موت نہیں بلکہ ایک قسم کی الجھن اور جھلاہٹ رہی ہو کہ آج دعوت کے موقع پر ہی رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا یا تمام مزہ کرکرا ہو گیا تھا۔ خیر میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں بہت ذہین آدمی ہوں۔

اور یہ سطریں نہ تو دیوانی ہیں نہ ہی انھیں میں نے حواس باختہ ہو کر لکھا ہے۔ یہ تمام تحریر بہر حال بالکل ہی ناقابلِ اعتبار نہیں ہے، اور یہاں سے میری ذہانت کا شرانگیز پہلو شروع ہوتا ہے۔ اپنی اور ان کی لایعنی گفتگو کے بارے میں بیان کرتے وقت میں نے خاصے سفلے پن سے کام لیا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سفلہ پن بھی لایعنی ہے۔ سرسری نظر سے دیکھیں تو بالکل اس کائنات کی طرح ہی لایعنی۔ مگر اس کی طرح اندر سے بے حد چالاکی اور فن کاری سے رچا گیا سنسار۔ اپنے اندر کے الجھے دھاگوں میں کوئی بہت ہی چالاک کھیل یا قواعد یا ایک نہ سمجھ میں آنے والی ریاضی ہے، مگر اس کے سارے ہندسے اور اعداد سرخ بلب کی طرح چوکنے ہیں۔ وہ جلتے ہیں انسان کی بنیادی خود غرض اخلاقیات کی سرحدوں پر۔

مگر اس تحریر کی اخلاقیات کی بنیادی شرائط ہی بے ایمانی، بزدلی اور سستی ہیں، اور جنھیں میں اپنی شرانگیز ذہانت کے بل بوتے ابھی تک پورا کرتا رہا ہوں۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ تمام سطریں اسی مضحکہ خیز صورتِ حال سے مستعار ہیں۔ اپنے حافظے کو بڑی بے شرمی کے ساتھ جھٹلاتی ہوئیں۔ اور بے شرمی کا کیا ہے۔ اب تک میں نے نہ جانے کیا کیا بے شرمی کے ساتھ جھٹلا رکھا تھا!

پوپلا منہ، سر کے بال اس درجہ سفید کہ انھیں دیکھ کر دہشت ہوتی تھی۔ ان بالوں کی سفیدی کی بھیانک چھوٹ ان کے سارے جسم پر پڑتی تھی۔ جسم جس میں کچھ تھا ہی نہیں۔ خاص طور سے ہڈیاں تو بالکل ہی نہیں۔ منہ سے لے کر پاؤں کی ایڑیوں تک بے پناہ جھریوں والی بے

حد خشک اور بدرنگ کھال شاید ہوا جیسی کسی شے پر جھولتی رہتی تھی۔ ہڈیاں ان کے وجود میں بھیس بدل کر کہیں چھپ گئی تھیں۔ اس طرح کہ ان کا احساس بمشکل ہی ہو سکتا تھا۔ حالاں کہ وہ یوں تو بالکل سامنے ہی تھیں۔ خوف ناک پنجر کی صورت بالکل سامنے۔ دسترخوان پر پڑی بے ہنگم چھوٹی بڑی ہڈیوں پر ایک پتنگا ڈول رہا تھا۔

جب میں نے انھیں ہفتہ بھر پہلے دیکھا تھا تب وہ ایسی ہی تھیں۔ میلے باندوں کی ایک بوسیدہ سی چارپائی تھی جس کے درمیان اتنا گڈھا ہو گیا تھا کہ وہاں کے باند تقریباً زمین کو چھوتے رہتے تھے۔ چارپائی پر ایک پرانی اور گندی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر وہ لیٹی تھیں، یا شاید پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی ناک میں لگی ہوئی نلکی سانس کے ذریعے آہستہ آہستہ ہلتی تھی۔ ان کے پیروں کے اوپر چادر تھی جس پر ایک بڑا سا دھبا تھا۔ دھبے پر مکھیاں چپٹی ہوئی تھیں۔ ان کا بایاں ہاتھ بار بار ہوا میں اٹھتا تھا پھر بے جان ہو کر پلنگ کی پٹی سے نیچے جھول جاتا تھا۔

چارپائی گھر کے چھوٹے سے آنگن میں پڑی تھی۔ جاڑوں کی سنہری دھوپ اوپر سے گزر رہی تھی۔ دھوپ سے دھندلے ہوتے ہوئے نیلے آسمان پر ایک ہیری آہستہ آہستہ تیر رہی تھی۔

چارپائی کے نیچے المونیم کی ایک سلپچی الٹی پڑی تھی۔

ان کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ ان میں کچھ نہ تھا۔ نہ دکھ، نہ تکلیف، نہ جذبہ، نہ احساس۔ یہ آنکھیں کہیں بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اور اس بے پناہ جھریوں والے خاموش چہرے پر یکسر نقلی طور پر لگائی گئی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ صاحبِ خانہ کی ساس تھیں۔ نہ جانے پہلے کہاں رہتی تھیں۔ اب اچانک وقت کے ایک جھونکے نے انھیں یہاں پہنچا دیا تھا۔ نظم کے شاعر اور غزل کے شاعر دونوں طرح طرح کے کھانوں کے بارے میں چونکا دینے والے انکشافات کرتے رہے۔ ان انکشافات کے عام ہونے پر تاریخ کو از سرِ نو لکھنے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اس وقت میں ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لے رہا تھا، مگر بات یہ تھی کہ وہ قرض اتر جانے کے بعد میں کچھ کسل مندی سی محسوس کر رہا تھا اور میری آنکھیں بار بار بند

ہونے لگتی تھیں۔اور یقیناً وہ قرض تھا۔ وہ اس اجتماعی بھوک کا قرض تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے ادا کیا تھا۔وہ آ کر چلی گئی تھی۔ جسم کے ایک ایک مسام پر اس کے جاتے ہوئے قدموں کے نشان ثبت تھے۔ بھوک کے خونخوار پاؤں، اس کی مہیب ایڑیاں اور وحشی پنجے میرے اونگھتے ہوئے اور ریت کی طرح بے حس ہوتے ہوئے جسم پر ایک سیدھی لکیر کی طرح چلتے چلے گئے تھے۔

اچانک پھر بجلی چلی گئی۔ صاحب خانہ نے اٹھ کر مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کر دیا، اس نئی اور الگ روشنی میں کمرے کی دیواریں قابل رحم حد تک سپاٹ نظر آئیں۔ کمرے میں موجود کرسی، میز، اور تخت، سب کے کونے بہت ابھرے ابھرے سے محسوس ہونے لگے۔ میں نے یوں ہی بے خیالی میں بائیں طرف کی دیوار کو دیکھا۔ لیمپ میں افسردہ تھرتھراتی ہوئی روشنی میں وہاں دستر خوان پر رکھی ہوئی ہڈیوں کی پرچھائیں ڈول رہی تھی۔ بے تکی مگر اپنے اصل جسم سے بڑی ہوتی ہوئی پرچھائیاں۔

دراصل اس علاقے میں بجلی بہت جاتی ہے، یہ علاقہ اس بڑے شہر کی فاضل آنت کی طرح ہے۔ ایک اندھی سرنگ جس میں زیادہ تر گھر ایک ہی قطار میں بنے ہوئے ہیں۔ پتلی سی گلی کے دونوں طرف درمیان میں سڑک کو کاٹتی ہوئی گندی سڑتی نالیاں ہیں جن میں ہمیشہ کالا پانی چپکا کرتا ہے۔ یہ پانی بہتا نہیں ہے بس ایک ہی جگہ کانپتا ہلتا نظر آتا ہے۔گلی میں سر کے اوپر آسمان نہیں بلکہ بجلی کے جھولتے ہوئے تاروں کے جال نظر آتے ہیں۔

اس گلی میں دور تک استعمال شدہ پلاسٹک کی گندی رنگین تھیلیاں اور کیلے کے چھلکے بکھرے ہوئے ہیں۔

وہ خود بھی ایک سوکھے ہوئے کیلے کے چھلکے میں بدل چکی ہیں۔ یہ موت سے پہلے کی موت ہے۔ایک زیادہ بے رحم موت، جب وہ ہم سے ایک خطرناک کھلواڑ کرتی ہے۔ ہمارے سال خوردہ جسم پر بیٹھ کر وہ ایک شیطان، بدنیت اور مکھی کی طرح اڑتی رہتی ہے۔

اس علاقے کے بارے میں میں نے جو بیان کیا اس کا کوئی سماجی پہلو نہیں ہے۔اور میں پہلے بھی کئی بار آگاہ کر چکا ہوں(''آگاہ'لفظ میں تکبر کی بو آتی ہے، اس لیے مجھے معاف

کریں) کہ میں کسی بھی قسم کی تمثیل یا علامت کا استعمال ہرگز نہیں کروں گا اور استعارے کے بارے میں تو اب آپ بخوبی جان گئے ہیں، کہ میرا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔

مگر چند وضاحتیں ضروری ہیں۔ بے حد ضروری۔

یہ بہر حال ایک کہانی ہے۔آج کل لوگ کہانی میں، کہانی پن، کچھ اس طرح تلاش کرتے ہیں جیسے' عورت' میں'عورت'پن کی تلاش یا اس کی آرزو کی جاتی ہے۔مگر اسے کیا کیجیے کہ کبھی کبھی عورت کے پوشیدہ سے پوشیدہ باطن میں بھی'عورت پن' مفقود رہتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو عورت کو معاف ہی کرنا پڑے گا۔

(اس کہانی میں بھی کہانی پن، پتہ نہیں کہاں ہوگا۔ اس کے بیانیہ کے الجھے ہوئے دھاگوں اور متن یا بین المتن کے باہمی رشتوں کے ٹکراؤ میں؟ اگر کہیں وہ ہوگا تو ضرور مل جائے گا۔ورنہ کہانی کو آپ کو معاف کرنا ہی پڑے گا، بالکل اپنی عورت کی طرح)۔

جہاں تک میرا سوال ہے،آپ کی کیا مجال کہ آپ مجھے معاف کر سکیں۔ معاف تو خود کو میں نے ہی کیا تھا۔ اس بھوک کے آگے اپنے جسم کو ایک فاحشہ کی طرح بے شرمی سے پیش کر دینے کے لیے۔یقیناً ایک فاحشہ کی ہی طرح جس کے پاس اس ذلت بھرے فعل کے لیے 'زندہ' ہونے جیسے چھچھورے' نخرے بھرے، مگر بے حد حقیر سے جواز کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

جب آپ خود کو معاف کرتے ہیں تو حد سے زیادہ شیخی خورے ہو جاتے ہیں۔ اس کمرے میں مٹی کا لیمپ روشن ہونے سے پہلے ہی میں نے خود کو معاف کر دیا تھا۔ شیخی میری رگ رگ میں بھر گئی تھی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ اس گفتگو کے درمیان صاحب خانہ کا چھوٹا بھائی کئی بار کمرے میں آیا تھا۔ وہ وہاں سے چھوٹی رکابیاں اور گلاس اٹھا کر لے گیا تھا۔دوسری بار اس نے صاحب خانہ سے کچھ کان میں کہا تھا جس پر وہ ایک پل کو فکر مند نظر آئے تھے۔ تیسری بار آ کر اس نے گیلے کپڑے سے تخت کی چادر کے ایک حصے پر گرے سالن کو صاف کیا تھا، اور چوتھی بار اس نے سگریٹ لا کر دیئے تھے۔مگر دستر خوان پر پڑی ان ہڈیوں کو

اس نے ابھی تک نہیں اٹھایا تھا۔شاید باہر ہڈیاں پھینکنے کا ابھی وقت ہی نہیں آیا تھا......

اور اب جب کمرے کی دیوار پر ان ہڈیوں کی بے تکی پرچھائیں آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی تو میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گھر کے اندر، (شاید آنگن پار کر لینے کے بعد) کہیں دور، ایک دو سسکیاں سی فضاء میں گونجتی ہیں اور پھر دب کر رہ جاتی ہیں۔

جاڑوں کی رات بڑھتی چلی آرہی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے شاید تیز ہو گئے تھے۔وہ کھڑکی جو کمرے سے آنگن میں کھلتی تھی، اس پر پڑا ہوا پردہ باربار ہلنے لگتا تھا۔آج چاندنی رات ہے، میں نے سوچا۔ پردہ ہٹا تھا تو نظر آتا تھا۔خاموش آنگن میں چاندنی ان کے سفید سال خوردہ اور وحشت ناک بالوں کے گچھوں کی طرح جگہ جگہ بکھری پڑی تھی۔ ان بالوں کے گچھوں کو بغیر کھنکارے پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غزل کے شاعر کسی کھانے کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت جتاتے جتاتے اچانک رک گئے۔ نظم کے شاعر نے ایک پل کو کان کھڑے کیے پھر بے حد سکون کے ساتھ کہا۔

"تمھاری بھابی ہیں۔ رو رہی ہیں۔ آخر ان کی تو ماں ہیں۔"

حضرات آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ وہ ڈرامائی صورتِ حال تھی۔ مگر نہیں جناب ڈرامہ تو یہاں یہ چھچھوری سطریں پیدا کر رہی ہیں۔ ورنہ یقین کریں کہ وہ بالکل عام اور روز مرہ سی صورت حال ہوتی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ اس وقت شکم سیر ہو کر کھانے کے بعد کی ہلکی سی کسل مندی کے علاوہ میرے اعصاب پر دوسری کوئی شے سوار نہ تھی۔ مجھے اپنی گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنے میں بھی دقت محسوس ہو رہی تھی، بالکل ایک سور کی طرح۔ (اس بار اس بد بخت لفظ کا یہ انتہائی ایمان دارانہ استعمال ہے)۔

اب وقت آ گیا ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ یہ احساس اس احساس سے بالکل الگ ہے جب میں اس مضحکہ خیز یا سنجیدہ صورتِ حال سے دوچار تھا۔مگر اب کہانی بیان کرتے وقت میں ان دونوں احساسات کو بیان کرنے کی بچکانہ خواہش سے خود کو بچا نہیں پا رہا ہوں اور اس کوشش میں گویا بھانڈ ہوا جا رہا ہوں۔ میں مایوس کن حد تک ایک غبی فوٹو گرافر کی طرح حقیقت

کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہوں۔

مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا یہ بھانڈ پن اصل میں ایک اعلیٰ اخلاقی پہلو کا حامل ہے۔ میں زندگی کے ساتھ ساتھ لتھڑ جانا چاہتا ہوں، میرا پورا وجود زندگی کے ہر گندے سے گندے چیتھڑے تک کو سونگھ کر اس کی بو میں نہا جانا چاہتا ہے۔ کچھ کچھ اس طرح جیسے بعض قبیلوں میں مرد کو اپنی عورت کے دکھ سکھ میں اس درجہ ایمان داری سے شریک ہونا پڑتا ہے کہ یہ اس کا عین فرض ہے کہ دردِ زہ میں مبتلا اپنی عورت کی دردناک اور دل خراش چیخوں کے ساتھ وہ بھی اُسی طرح چیخے اور تڑپے۔ اسے بچہ پیدا کرنے کے عمل کی پوری پوری نقل اتارنا پڑتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ میں یہاں ایک فرد بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں خود کو "کئی" میں محسوس کرنا چاہتا ہوں اور اس طرح میں ایک ہوتے ہوئے بھی 'بہت سوں' میں بٹ جانا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس کہانی کا ہر کردار میرے لیے پھانسی کا ایک جھولتا ہوا پھندا ہے۔ میں پھندے میں اپنے سر پر کالا کپڑا ڈال کر گلے کا ناپ لینے جاتا ہوں اور مایوس ہو کر واپس آ جاتا ہوں۔ کوئی پھندا ایسا نہیں کہ جو ایک دم میرے گلے کے برابر آئے۔ یہاں دم گھٹتا ہے۔ دم نکلتا نہیں۔ یہ ایک بھیانک اور کریہہ کھیل ہے جس میں اپنی آزادی اور مکتی کے لیے میں خود کو مختلف ضمائر میں تقسیم کر کے اپنے اسم کی تلاش جاری رکھنا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا تھا کہ ایک دبکا ہوا احساسِ جرم وہاں ضرور تھا اور آہستہ آہستہ اب اس سناٹے میں گونجتی ڈوبتی سسکیوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بل کھول رہا تھا۔

ان دونوں کو بھی احساسِ جرم تھا۔ مگر اس سے چھٹکارہ پانے کا ہر ایک کا ایک نجی طریقہ ہوتا ہے۔ یہ میرا نجی طریقہ ہے جو میں آپ سے مخاطب ہوں۔ ان کی بے معنی باتیں، کالا مفلر اور چمڑے کی جیکٹ شاید اس احساسِ جرم کا ہی جز تھیں۔ یہ انسان کی اپنی اکیلی دنیا ہے۔ اس میں دخل اندازی کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی۔

آپ کو یاد ہے کہ شروع ہی میں میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ اپنے حافظے کو پھر سے دبوچ لینے کے لیے مجھے جگہ جگہ بچپا کا منھ لگا کر بھی بھٹکنا پڑتا رہا ہے۔ آپ کو بچپا کا منھ تو یاد

ہوگا۔ وہ جسے بچے لگائے پھرتے تھے اور آپ کو اچانک ڈرایا کرتے تھے۔

وہ بچا کا چہرہ میں نے اپنی کمر میں باندھ رکھا ہے۔ ایک چالاک اور کمینے ہتھیار کی طرح۔

اس کہانی میں موقع دیکھ کر میں جھٹ یہ بچا کا چہرہ اپنے چہرے پر لگا لیتا ہوں۔ اس کی بھیا نک مگر حیران سی آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں۔ بڑے بڑے بدنما خوف ناک دانت جبڑوں کو پھاڑ کر باہر نکلنے لگتے ہیں۔ بچا کا چہرہ ان آنسوؤں سے گیلا ہو جاتا ہے۔ اس کے تیز سرخ اور پیلے رنگ پھیلنے لگتے ہیں۔ وہ قابلِ رحم نظر آتا ہے، اور اپنے پیلے لال رنگ کو بہنے دیتا ہے۔ نیچے کی طرف۔ انسانی گردن سے لے کر انسانی ایڑیوں تک یہ رنگ بہتے جاتے ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ ایک بچکانہ حرکت ہے اور بار بار اسے دہرانے سے تو اس کا اثر بالکل ہی ختم ہو سکتا ہے۔ مگر ہر بچکانے پن کی اپنی ایک بے رحمی بھی ہوتی ہے۔ احساس وادراک کی ایک زیریں سطح پر اس بے رحمی کا اثر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

ٹھہریئے...... کہانی میں بس وہ موقع آنے ہی والا ہے۔ میں آپ کو اس بار پہلے ہی سے خبردار کیے دیتا ہوں اور کمر سے بچا کا منھ یوں نکال کر چہرے پر لگا لیتا ہوں۔

نہیں اس بار رونے یا سسکیوں کی آواز نہیں تھی۔ یہ تو دو عورتیں مل کر شاید کچھ پڑھ رہی تھیں۔ مدھم اور افسردہ سی آواز میں۔

نہ جانے کیوں اچانک مجھے سردی سی لگنے لگی۔ صحن میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ اب بہت تیزی کے ساتھ لہرانے لگا تھا۔ رات بڑھتی جانے کے ساتھ ساتھ ہوائیں بھی بڑھتی جاتی تھیں۔ کمرے میں روشن مٹی کے تیل کا لیمپ بھڑکنے لگا۔ صاحب خانہ نے اٹھ کر اس کی لو کم کر دی۔ کمرہ کچھ اور دھندلا ہو گیا۔ وہ دونوں ایک لمحے کو جانے کیوں خاموش ہوئے، ایسا لگتا تھا جیسے اپنی اپنی جگہ دونوں کہیں کھو گئے ہیں۔ شاید وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندر سے پڑھنے کی آوازیں پھر ابھریں۔ کمرے میں سناٹا کچھ اور پھیلا۔ ''یٰسین شریف ہے''، ایک نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہاں یٰسین شریف ہی ہے'' دوسرے نے خود کلامی کے انداز میں دہرایا۔

میں جھوٹ نہیں کہوں گا۔ اس وقت مجھے ایک نا قابلِ تشریح قسم کا خوف محسوس ہوا اور

میری ریڑھ کی ہڈی میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

میں جانتا ہوں کہ یٰسین شریف عالمِ نزع میں پڑھی یا سنائی جاتی ہے۔ اس کے سننے یا پڑھنے سے جان نکلنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ روح بہت آسانی سے جسم سے نکل کر مائلِ پرواز ہو جاتی ہے۔ (مگر ایسا نہیں ہے کہ صرف مرتے ہوئے انسان کی تکلیف کم کرنے کی غرض سے ہی یٰسین شریف کا پڑھنا مستحسن ہو، بلکہ یٰسین شریف تو ہر شخص کو پڑھنا اور سننا چاہیے خاص طور سے جب اس کے اعصاب وحواس اچھی طرح اپنا فرض انجام دے رہے ہوں)۔

کون سن رہا تھا؟

''یسین شریف تو یہ لوگ کل سے ہی پڑھ رہی ہیں......مگر......'' صاحب خانہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔

کون سن رہا تھا؟

انا جعلنافی اعناقھم اغللافھی الی الاذ قان

(تحقیق کیا ہم نے بیچ گردنوں ان کی کے طوق۔ پس وہ ٹھوڑیوں تک ہے)

دونوں عورتوں کی آوازیں تقریباً غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی کانپ رہی تھیں یا مجھے کانپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

دسترخوان پر پڑی جھوٹی ہڈیوں کے ڈھیر پر وہی پتنگا بار بار اڑے جا رہا تھا۔ لیمپ کی لو مدھم ہو جانے کی وجہ سے کمرے کی سفید چونے سے پوتی گئی دیوار پر ان ہڈیوں کے سائے قابلِ رحم حد تک مبہم نظر آتے تھے۔ کسی بھی قسم کے امکان سے یکسر خالی، قطعی مایوس کن۔

"قال من یحی العظام وھی رمیم ○قل یحیھا الذی انشا ھا اول مرۃ ط"

(بولا ایسا کون ہے جو ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں۔ تم کہہ دو انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار بنایا۔)

اور اب مجھے صاف احساس ہوا کہ دھیمے لہجے میں یٰسین شریف پڑھتی ان دو عورتوں کی آوازوں میں سے ایک کی آواز آہستہ آہستہ رندھتی جا رہی ہے۔ جاڑوں کی لمبی رات اپنے

سنانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دھندلے ہوتے ہوئے اس نیم تاریک کمرے اور ٹین شریف دہراتی ہوئی ان افسردہ آوازوں کے درمیان ایک عالم ہو، دبے پاؤں آ کر کھڑا ہو گیا۔

سب سے پہلے غزل کے شاعر اٹھے تھے۔ آخری سگریٹ جوتے سے مسل کر ان کی سیاہ چمڑے کی جیکٹ کا کالر کھڑکی سے آنے والی ہوا میں پھڑ پھڑایا۔ میں تخت سے اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ اور تب میرے ساتھ صاحب خانہ بھی اپنا سیاہ مفلر کانوں سے لپیٹتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ انھیں زکام بہت جلد جلد ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی ان کی ناک سرسرا رہی تھی۔

جب میں جوتے پہن کر کھڑا ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے جوتے تنگ نہیں ہیں اور پیروں کو کہیں سے کاٹ نہیں رہے ہیں، حالاں کہ جب بھی میں کھانا کھا کر بیٹھا رہتا ہوں تو میرے پیر سوج جاتے ہیں اور جوتے انھیں کاٹنے لگتے ہیں مگر اس بار سب ٹھیک تھا۔ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔

"دیکھو شاید آج رات میں ہی ......" نظم کے شاعر نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے دبی دبی زبان میں کہا۔ مگر ان کا لہجہ دہشت سے پاک صاف تھا۔ "ہاں لگتا تو یہی ہے۔ کل دن بھی اچھا مل جائے گا۔" غزل کے شاعر نے جواب دینے کے سے انداز میں آہستہ سے کہا (کل جمعہ ہے)۔

"بہر حال ...... جیسا بھی ہو۔ فوراً خبر کرا دینا۔" میں اپنے حساس ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ کچھ تسلی دینے والے انداز میں بولا تھا۔ کھڑے ہونے پر کمرے کی دیوار پر ہم تینوں کی دیو قامت سی بنتی پرچھائیوں نے ہڈیوں کے اداس سائے کو پورا پورا ڈھک لیا۔ مگر تب ہی مجھے اس ناقابل یقین امر کا احساس ہوا کہ وہ ہڈیاں جو چوپایوں کے گھٹنوں اور پنڈلیوں میں پائی جاتی ہیں، اچانک ان دونوں کے چہرے پر اگ آئی ہیں۔ خود میرے چہرے پر بھی، کیوں کہ ہاتھ پھیر کر ان کی نوکیں اور ابھار میں نے واضح طور پر محسوس کیے۔

لیمپ کی دھندلی اور میلی سی روشنی میں ان دونوں کے چہرے گندے شوربے کی طرح نظر آ رہے تھے۔

دانتوں کے درمیان پھنسے گوشت کے چند ریشے اور سرسرتی ہوا اور پیٹ میں بننے والی رقیق گیس کی بدبو لیے ہوئے ایک سور (سور کا لفظ اب میں نے آخری بار استعمال کیا ہے) کی طرح جب میں سامنے کو گردن اٹھائے گھر سے باہر ڈولتا ہوا چلا تو میرے پیچھے ٹین کا دروازہ ہوا سے بجنے لگا۔ اچانک بجلی آ گئی۔ نالیوں میں رکا کالا پانی چمکنے لگا۔

گلی کے دونوں اطراف میں تقریباً ایک سے بنے مکانوں کے نیچے سنڈاس پھر روشن تھے۔ ان پر میری نگاہ پڑی تو میں نے ڈکار لی (یا شاید ڈکرایا) یہاں تک کی رات گزر گئی تھی۔ اب گھر پہنچ کر مجھے سو جانا تھا۔

بس اب رام گنگا میں قلعے کی ندی گرتی ہے۔ مایوس نالی کی طرح، سست رفتار اور سڑتی ہوئی یہ میری بھٹکن کی بند گلی ہے۔ اپنے حافظے کا تعاقب کرنے کی میری آخری سکت۔ یہ ایک قسم کی بے چہرگی ہے۔ ایک بھن بھنی ناک سے نکلتی آواز کے علاوہ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ بیچا کا چہرہ میں نے اتار کر رکھ دیا ہے۔ اب اس سے مجھے یا آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا۔

یہ ایک قسم کی خود کشی ہے۔ بزدلی، بے ایمانی، سستی اور کاہلی کے ساتھ جب آپ موت کو فتح کرنے کے لیے نکلتے ہیں تو انجام یہی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ کہانی ایک قسم کی خود کشی تھی، میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ سطریں ہرگز ہرگز اداس نہ تھیں۔ یہ دراصل اداس ہونے کی صورت میں لکھی گئی تھیں۔

میں تو مسرت کے ایک جھومتے ہوئے کیچڑ کے رنگ کے ہاتھی پر سوار ہوں۔ مست ہاتھی، پُر غرور، نشے میں جھومتا ہوا شہر کی چوڑی چوڑی سڑکوں پر ڈولتا ہے۔ شیخی اس کی مچی ہوئی آنکھوں اور ہلتی ہوئی سونڈ سے ٹپکتی جاتی ہے۔ بکھرتی جاتی ہے۔ اس کے کھمبوں جیسے بے خبر پیروں کے نیچے اس کی اپنی ہی شیخی کچل جاتی ہے۔ اپنی ہی انا اور اپنا ہی نشہ کچلا جاتا ہے۔

چلیے ...... چوٹی والا کھیل ختم ہوا۔

تمثیل، علامت اور استعارے سے یکسر خالی یہ کہانی اس مقام پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اب مجھے کچھ نہیں کرنا ہے سوائے یہ دیکھنے کے کہ کیا میری پیٹھ پر وہ گندی لجلجی چھپکلی ابھی بھی چپکی ہوئی ہے یا اتر چکی ہے۔ مگر اپنی پیٹھ تک ہاتھ لے جانے میں مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ نہ جانے یہ خوف کب تک مجھے گرفت میں رکھے گا۔

☆☆☆

روح میں دانت کا درد

ہم سب صرف اس شرط پر زندہ ہیں کہ پیار اور محبت کا ہر بندھن انجام کار توڑ دیا جائے گا۔

ڈاکٹر سیموئل جانسن

ڈینٹل کلینک کے باہر شام ہو رہی تھی۔

آخر کار مجبور ہو کر آج وہ ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زبردستی ہنسنے لگا۔

ڈاکٹر کے ہاتھ میں بال برابر پتلی سوئی تھی۔ وہ بھی ہنسنے لگی، بولی۔

''آپ نے دانت بہت خراب کر لیے ہیں۔''

''مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا کہ انھیں خراب ہونا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''منھ کھلا رکھیے گا۔ ہاں اس طرح۔'' ڈاکٹر نے کہا اور پتلی سوئی دانت کے اندر بھٹکنے لگی۔

ہاں جیسے خدا نے ازل کے پرے خواب دیکھا تھا دنیا کو خرابے میں تبدیل ہوتے ہوئے۔ جنم لیتے ہوئے شیطان کی کلکاریاں سنتے ہوئے۔ ایسے ہی اس نے کتنی بار خواب میں دیکھا۔ اس نے کلی کی۔ وہ کلی کے ساتھ فرش پر بکھر گئے۔ خون میں تر، اس کے کریہہ بدنما دانت۔

''چلیے کلی کر لیجیے'' ڈاکٹر مسکرائی۔

تو دنیا واقعی کیا ایک دندان ساز کا شیشے سے گھیرا ہوا مطب تھی؟ انھیں گلی سڑی، کیڑے لگی ڈاڑھوں کے ذریعے ''برائی'' کا وجود اور ''شر'' کا احساس واضح کرنے کے لیے؟ اپنے دکھتے

ہوئے جبڑوں اور چڑچڑے ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ شیشے کی ان دیواروں کے اندر تمہیں داخل ہونے ہی پڑے گا۔

یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔ ایک قسم کی بے حسی اور بے رحمی بھی۔ اس بے حسی اور بے رحمی کو گھٹنوں سے نیچا سفید کوٹ پہنے وہ سانولی قبول صورت ڈاکٹر اور اس کی مسکراہٹ کم نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جب اس کے دانتوں کا جائزہ لینے اس کے اوپر جھکتی تو اس کا سینہ اس کے سر کے پچھلے حصے کو ہلکے سے چھو گیا۔ نہیں، وہاں کچھ نہیں تھا، یا شاید کچھ نہ ہونے کا احساس تھا۔ صرف سفید کوٹ نے ہلکی سی جنبش کھائی ہوگی۔ دہشت اپنی جگہ قائم تھی۔ دانتوں کے درمیان کیڑا نہ جانے کدھر سے کدھر ٹہل رہا تھا۔

''کیا واقعی دانتوں میں چلنے پھرنے والا کوئی کیڑا ہوتا ہے؟'' ایک بار اس نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔

''عام طور سے جراثیم اور انفیکشن کو کیڑا کہہ دیا جاتا ہے۔'' ڈاکٹر اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھاتے ہوئے بولی۔

''تم بولا ہی مت کیا کرو۔ جواب مت دیا کرو کسی بات کا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ اتنے پیار سے کوئی بس اپنے آپ سے ہی بول سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے کسی بڑے اخلاقی فریضے سے نہیں جوڑ سکتا۔

''دیکھو تمھارے خاموش رہنے ہی میں کسی حد تک ''خیر'' کا عنصر شامل ہے۔ ورنہ پتا نہیں کیا کچھ نہ تباہ ہو جائے۔'' وہ اسے سمجھانے لگی۔

تب دانتوں میں ایک کیڑا رینگتا تھا۔ اس کا رینگنا دراصل درد تھا۔ اور بدبو کا بھپکا تھا۔ بدبو کا بھپکا تو سانس کے ساتھ ساتھ ہونٹوں کے کناروں اور باچھوں کے کونوں سے اڑ رہا تھا۔

مگر یہ محبت تھی۔ خالص محبت۔ اپنے سینے میں دونوں چھاتیوں کے درمیان چھپا کر رکھی گئی ایک چھوٹی سی ایک گول چپاتی۔ وحشی اور بے یقینی سے بھری عجیب جنگلی آنکھیں جو دور سے بہت پرکشش نظر آتی ہیں مگر قریب جانے پر ان آنکھوں سے اسے ہمیشہ ایک ناقابل فہم قسم کا

خوف محسوس ہوا۔

''تم مجھے پیار تھوڑی کرتے ہو،'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی قمیض کا کالر پکڑ کے اپنا سر اس کے گریبان میں چھپا لیا۔

دانتوں کی اندھی سرنگ میں کیڑا گھبرا کر اور آگے چلا۔ بدبو کا بھپکا آیا مگر ابلتی ہوئی محبت اور بے لوث دعا نے سب کچھ اس وقت ''خیر'' میں بدل دیا۔ اس کی جنگلی آنکھیں اوپر اٹھیں۔ ان میں آنسو بھٹک رہے تھے۔ یہ آنسو بھی اس دنیا کے نہیں تھے۔ یہ بھی جنگل سے آئے تھے۔ ڈرے، سہمے، اور پریشان سے ڈرتا کہ اگر وہ باہر آئے تو دوبارہ جنگل کو لوٹ جائیں گے۔

''وہ تم سے آخر اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟'' اس نے کالر کو زور سے ہلایا۔

تب اس نے واقعی نفرت کے بارے میں سوچا۔ لوگ کسی سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ مگر سب سے زیادہ بھیانک بات یہ ہے کہ وہ شخص جس سے نفرت کی جاتی ہے، کبھی کبھی اسے اس نفرت کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وجود میں بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ بغیر کسی ردعمل کے وہ مرکز نفرت تنہا جگمگاتا ہے۔ ایک آوارہ اور خود مکتفی جگنو کی طرح جس کے جگمگانے کا کوئی مطلب، کوئی معنی نہیں ہوتے۔

یہ کتنی خوف ناک بات ہے کہ جب اس سے نفرت کی جا رہی ہوتی ہے تو وہ اکثر کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے، یا آدھی رات میں کسی ریل گاڑی کے تیسرے درجے کی بوسیدہ کھڑکی سے سر ٹیکے، ادھ کھلی آنکھوں سے چھوٹے ویران اسٹیشنوں کی خالی تپائیاں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یا کہیں بیٹھ کر اپنے حصے کا رزق، اپنے نوالے کھا رہا ہوتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ان لمحات میں بھی، جب وہ کسی عمل یا ردعمل کا مجموعہ نہیں ہوتا، اس سے نفرت کی جا سکتی ہے۔ جب وہ خالص وجود کی تنہائیوں میں گم رہتا ہے۔ یا پھر جبلی سطح کی مجبوریوں میں۔

مگر ہم نفرت کر سکتے ہیں۔ ہم کسی کو بھی نفرت کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ یہ تشدد ہے۔ دانتوں کا کیڑا اندر ہی اندر نہ جانے کون سی سرنگ بنا رہا ہے۔ ایک منہ سے دوسرے منہ تک بدبو دار آندھیاں چل رہی ہیں۔ ان کے آلودہ جھکڑوں میں کیا کیا نہ مٹ جائے گا۔ مگر زندہ رہنے

کی لیے نفرت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

"تم بولا ہی مت کرو۔ جواب ہی نہ دیا کرو۔"

یہ کون سا اخلاقی فریضہ تھا؟

"دونوں طرف کی ڈارھیں کیڑا چاٹ گیا" قبول صورت ڈاکٹر تاسف سے کہہ رہی تھی۔

نہیں۔ ڈاڑھ سڑ بھی جائے تو وہ نکلوائے گا نہیں۔ اسے گلی سڑی ہڈیاں سنبھال کر رکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک سنکی شوق اسے علم ہے کہ جب ڈاڑھ جبڑے سے کھینچ کر نکال لی جائے گی تو اس کا آخری سرا خون میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ گلتا ہوا اور جھڑتا ہوا۔

اسی لیے سرنگ کھودنا ہی بہتر تھا۔

"میں روٹ کینال (Root Canal) ہی کرالوں گا"۔ اس نے کہا۔

"لیکن وہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔" ڈاکٹر خوش دلی سے بولی۔

تو کیا فرق تھا؟ بات تو ایک ہی تھی۔ مہنگا پن اپنے آپ میں ایک تشدد تھا۔ اگر تشدد ہی ہر مسئلے کا حل تھا تو سڑی ہوئی ڈاڑھ نکلوا کر پھینکنے سے زیادہ اسے سینت سینت کر پیوند لگا لگا کر رکھنا زیادہ معنی خیز تشدد تھا۔ تیس سالہ ازدواجی زندگی کے اس سلسلے کو بھی باقاعدگی سے برقرار رکھنا ایک اوچھا تشدد تھا۔ جو یوں تو بہت مہنگا پڑ رہا تھا کیوں کہ وقت کے ایک خاص نقطے پر کم از کم اسے تو یہ صاف صاف پتہ چل گیا تھا کہ وہ دونوں آپس میں صرف ٹکرا سکتے تھے۔ قریب آنے پر چیزیں یا تو جڑ جاتی ہیں یا پھر ٹکرا کر رہ جاتی ہیں ٹکرانے کی اس گونج میں بڑی بے رحمی ہوتی ہے۔ بڑا تشدد ہوتا ہے۔

اس تشدد کا سب سے فن کارانہ پہلو دو شخصوں کا بظاہر ایک دوسرے سے جڑے رہنے کا التباس ہے۔ روحیں کچھ اور مانگتی ہیں۔ وہ شمولیت چاہتی ہیں۔ ایک شے میں دوسری شے کی شمولیت اور گڈمڈ ہو جانا چاہتی ہیں۔ مگر جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر صرف ہاتھ ناپتے رہ جاتے ہیں مکے تنتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بڑھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے جبڑوں کی طرف۔ ٹھیک ڈاڑھ کی جانب۔ مگر دانت جبڑوں کے اندر آپس میں ہی پس کر رہ جاتے ہیں۔ آوازیں اپنا

چولا بدلتی ہیں۔ لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر باقی کچھ نہیں بچتا سوائے بھیانک شرمندگی کے۔

اس دن جب زیادہ جھگڑا ہو گیا تھا۔ تو اس کا پیٹ خالی تھا۔ دانتوں کے درمیان صرف ہوا تھی۔ اس کے دانت اس ہوا کو چبانا چاہتے تھے محض اس لیے کہ دانت موجود تھے۔ خواب میں کتنی بار کلی کرنے میں نکل کر وہ دور جا گرے ہیں۔ دراصل دانت تو کب سے کمزور ہو رہے تھے۔ اور ان کے درمیان ایک خالی جگہ، ایک آسیبی فاصلہ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اسے اس فاصلے کا کبھی پتہ نہ چل سکا۔

تو پیٹ خالی تھا۔ دانتوں کے درمیان بھی ایک لمحہ، ایک وقفہ خالی تھا۔ اسی لیے وہاں ایک بھوت جیسی ہوا آ کر بیٹھ گئی تھی۔ دکھتے ہوئے مسوڑھوں اور درد کے ناقابل سراغ مرکز پر بھی صرف ہوا چکرا رہی تھی۔ ویسے یقیناً کچھ اور بھی تھا، ہوا میں الجھی ہوئی سگریٹ کی بو، ایک کپ پھیکی چائے کی تلخی اور اس کے اپنے منہ کی بساند اور رطوبت۔

"تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں منہ لگایا جائے۔ اب آنا رات کو میرے پاس۔"

وہ ہانپ ہانپ کر کہہ رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے چوڑے دہانے سے سامنے کے سفید دانت باہر کو جھپٹ رہے تھے۔ نیلے ہوتے ہوئے ہونٹوں سے تھوک کے ذرات ٹھوڑی پر بہہ رہے تھے۔

"رات کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ خاطر جمع رکھو۔" اس نے ناقابل، یقین صبر و تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ اگرچہ اس صبر و تحمل کا تشدد بھی بالکل عیاں تھا۔

یہ صبر و تحمل کا مظاہرہ وہ کیسے کر سکا؟ اس نے خود بھی حیرت سے سوچا تھا۔ اور تب ہی خیال آیا کہ اس سب سے ماورا وہ جو معصوم بوسے دانتوں کے درمیان اس موہوم سی ہوا میں اڑے اڑے پھرتے تھے، وہی دراصل اس صبر و تحمل کے نفیس ترین اور کمینے ترین تشدد کا ماخذ تھے۔ یہ محبت کا بخشا ہوا تشدد تھا۔

جنگلی آنکھوں والی لڑکی نے اس سے کہا تھا۔

"گھبرانا مت۔ میں ہوں نہ، اے معصوم انسان۔"

مگر معصوم انسان کے جسم سے کمینہ پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ یہ ٹھنڈا کمینہ پسینہ کہاں سے آیا تھا؟ یہ جسم کے کسی گہرے بدبودار تال سے آیا تھا۔ اس پسینے میں ایک بو تھی۔ بہت پرانی بو جس میں اس کے سارے گناہ، لغزشیں اور کوتاہیاں پگھل پگھل کر بہی جا رہی تھیں۔ اس پسینے کی بو کو وہ برداشت نہ کر سکا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ اس کا دل پتے کی طرح کانپنے لگا۔ معصوم انسان اپنے ٹھنڈے پسینے میں اپنے جرائم کے سناٹے میں اکیلا کھڑا لرز رہا تھا۔ ایک بے ہنگم پرچھائیں کی طرح۔

"تو دونوں طرف کی ڈاڑھیں کیڑا چاٹ گیا۔" اس نے لمبی سانس لے کر دہرایا۔

"جی ہاں۔ مگر بائیں جبڑے کی حالت زیادہ خراب ہے۔" ڈاکٹر ایک چھوٹے سے ایکسرے کا معائنہ کرتے ہوئے مسکرائی۔

ڈاکٹر قبول صورت تھی۔ اس کا جسم بے حد دبلا پتلا تھا۔ اس نے کرسی پر لیٹے لیٹے اس کے جسم کا بھرپور جائزہ لیا۔ مگر عورت کے جسم کے بارے میں اس طرح کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس نے سوچا نسوانیت کی اپنی ایک پراسرار صلابت ہوتی ہے اور ایک خاص طرح کی چھپی ہوئی بے رحمی بھی جو صرف اور صرف مقاربت کے موقعے پر ہی خود کو آشکار کرتی ہے۔ ایک خود غرض تشدد آمیز قوت جس کا سامنا محض مردانگی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی شدت کو صرف محبت کم کر سکتی ہے محبت ہی تو ہے جو مقاربت میں مبتلا عورت مرد کے سر پر خلوص، ممتا، شفقت اور قربانی کا شامیانہ تانے خاموشی سے کھڑی رہتی ہے۔

مگر افسوس کہ وہی تو غائب تھی۔ وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تھے۔ وہ تو شاید کسی سے بھی محبت نہیں کرتا تھا مگر اس کی بیوی کے بارے میں یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں وہ فعل اپنی تمام تر کمینگی کے ساتھ ایک ناقابلِ برداشت تشدد بن رہا تھا۔ وہ سب اس کے حصار میں قید تھے۔ وہ اس خود غرضی سے خوف زدہ ہو کر اس جنگلی آنکھوں والی لڑکی سے اپنی دکھتے ہوئے بھدے جبڑوں پر بوسے ثبت کراتا اور صبر و سکون کا وہ جذبہ اپنے اندر پیدا کر لیتا جو اور بھی زیادہ ٹھنڈا، بے رحم تشدد تھا۔ یہ ایک دلچسپ مگر خطرناک کھیل تھا۔ تشدد، نفرت، بے رحمی کا کھیل جو دنیا میں جاری تھا۔ دراصل نفرت اور بے رحمی کی بشریات ہی پراسرار ہے۔ یہ "شر" اور "برائی" کا وہ عنصر ہے جو دنیا میں موجود ہے۔ لیکن راستے میں بیٹھے ہوئے بے زبان کتے کو چلتے چلتے لات مار دینے والے اس کی وضاحت یا تعریف بیان نہیں کر سکتے۔

مگر اس مسئلے کا سب سے خطرناک مقام تو وہ ہے جہاں تشدد اور نفرت کا شکار ہونے والے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کی انتہائی نفیس ذہنی نفرت کو ڈھال کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

یہ بہت گہری نفرت ہے۔ یہ دعاؤں، کوسنوں اور بھیانک خوابوں اور اندیشوں سے بھری ہوئی ایک پراسرار نادیدہ نفرت ہے۔ یہ دانتوں کے ڈاکٹر کے چیمبر میں داخل ہونے جیسا ہے۔ اپنے دانتوں کے درمیان اگتے ہوئے پھوڑے کی دکھن کے ساتھ ساتھ تاریک گاڑھا اور اندیشہ ناک، انسانی زندگی کا سب سے گھناؤنا پہلو۔

اس بے حد سردارت میں وہ بار بار اپنی پنڈلی کھجا رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔

"دیکھ لو۔" اس نے اپنی بے ہنگم شلوار گھٹنوں تک سرکائی۔ سفید خشک پنڈلی پر خراشیں ہی خراشیں تھیں۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" اس نے سوال کیا، حالاں کہ اسے اس میں واقعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"بہت زور سے کھجلی مچتی ہے۔ جہاں ناخن لگاتی ہوں خون جھلک آتا ہے۔" اس نے پھر پوری طاقت سے پنڈلی پر ناخن مارے۔

"تمھیں شاید خارش ہوگئی ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تمھارے ساتھ رہ کر اور کیا ہوگا؟ اپنے چیکٹ میلے کپڑے لے کر روز بستر میں چڑھ آتے ہو۔ یہی دعا تو مانگو گے کہ مجھے کتے بلیوں کی بیماری لگ جائے۔" وہ جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ سفید خشک پنڈلی پر لال لال خراشیں اور گہری ہوگئیں۔

"میں نے یہ کب کہا؟ اور اس وقت تو تمھیں یہ گندے نظر آتے نہیں۔"

وہ آہستگی اور سکون کے ساتھ بولا اگر چہ اس کے لہجے میں طنز کا عنصر بھی شامل تھا۔ لیکن یہ سکون اور اطمینان اس کے دل کے کسی پوشیدہ گوشے میں سر ابھارتی ہوئی اس خواہش یا امید کا رہین منت بھی تھا کہ شاید کبھی وہ درحقیقت کسی گندی خارش زدہ کتیا ہی کی طرح گلیوں میں گھستی پھرے۔

یقیناً یہ سب جاہلانہ تھا۔ جہالت، بدذوقی، ناسمجھی اور بد دماغی، یہ سب کتنی حقیر اور نظر انداز کر دینے کے قابل چیزیں تھیں۔ مگر جب یہ تمام چیزیں تمھاری زندگی میں منظم طریقے سے داخل ہوتی ہیں اور باقاعدگی سے اپنے وجود کا احساس دلاتی ہوئی تمھارے کاندھا سے کندھا ملا کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تب تشدد اور نفرت کی یہ قسم پیدا ہوتی ہے۔ خطرناک، چالاک اور ٹھپا تشدد جو اپنی طرف اٹھی ہوئی ایک خشمگیں آنکھ کا بدلہ بھی دوسرے سے چہرے پر دعا پڑھوا کر لیتا ہے۔ یہ نیچ پن ہے۔

اور واقعی ایسا ہی تھا۔ اس جنگلی آنکھوں والی لڑکی کے ابھرے ابھرے اداس ہونٹوں پر اس کے لیے جنگل جنگل دعائیں تھیں مگر وہ لڑکی! اس لڑکی کی محبت بھی اس کے لیے ایک پیچیدہ تشدد سے کم نہ تھی۔ وہ تو اچھا تھا کہ وہ خوبصورت نہ تھی۔ ورنہ خوبصورتی بجائے خود ایک تشدد ہے۔ جس طرح امیری اپنے آپ میں تشدد ہے۔

اسے یاد آیا۔

اس کی عمر بارہ سال کی رہی ہوگی۔ موٹی چینی کی رکابی میں سوجی کا خشک حلوہ لیے، شب برات کے موقع پر وہ اپنے ایک عزیز کے گھر گیا تھا۔ وہ لوگ بہت مال دار تھے۔ ان کا گھر کسی روشن محل سے کم نہ تھا جس میں زرق برق کپڑے پہنے ان کی تین لڑکیاں ادھر اُدھر جا رہی تھیں۔ ان کی چال میں بڑا تکبر تھا۔ پھر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ تب اسے اپنے کئی بار کے دھلے ہوئے سوتی پاجامے اور گھسی ہوئی بوسیدہ چپلوں پر بے حد شرم آئی تھی۔ ایک نوکرانی نے جب اس کے ہاتھ میں موٹی چینی کی وہ بھدی رکابی تھمادی تو اسے ایک قسم کی گھٹن اور جکڑن کا احساس ہوا

تھا۔ اب وہ صاف سمجھ سکتا تھا۔ اب وہ بچہ نہیں ہے۔ وہ صاف سمجھ سکتا ہے کہ وہ تشدد تھا۔ نرالا انوکھا، ناقابلِ فہم جو اس کی بے زبان غربت پر شکاری کتے کی طرح جھپٹ رہا تھا۔

کیسی ہے دنیا، وہ اکثر سوچا کرتا۔ کہاں، کون سی برائی آ کر بیٹھ گئی ہے؟ غیر معین، ناقابلِ تعریف برائی۔ کیا اس برائی کو جھاڑو لگا کر صاف کیا جا سکتا تھا؟

جھاڑو؟ کمر دکھ جاتی ہے۔ انسان مضحکہ خیز بنتا ہے۔ دنیا میں جھاڑو لگانے کیسے کیسے عظیم لوگ، اداس چہرے لیے آئے اور چلے گئے۔ برائی صاف نہیں ہوتی۔ وہ جھاڑو کے تنکوں سے گرتی ہے۔ ٹپکتی ہے۔ پھیلتی جاتی ہے۔ اسی لیے تو اپنے گندے میلے پاجامے کو رگڑ رگڑ کر دھونے کی ایمان دارانہ کوشش بھی مضحکہ خیز ہی قرار پاتی ہے۔

شلوار یوں ہی گھٹنوں تک چڑھی رہی۔ پنڈلی پر سرخ خراشیں نظر آتی رہیں۔

آہستہ آہستہ اس کے مُنھ سے بے ہنگم خراٹے پھوٹنے لگے۔ سانس کے ساتھ اس کا مُنھ بھی بے تکے پن سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ "سوتے میں بھی اس کے چہرے کی درشتگی اور کرختگی نہیں جاتی۔" اس نے افسوس کے ساتھ سوچ۔

نہ جانے کیوں اسے ٹھیک سے یاد نہیں کہ جنگلی آنکھوں والی لڑکی سے اس کی پہلی ملاقات کب اور کس طرح ہوئی تھی۔ مگر اسے اتنا ضرور یاد ہے کہ شروع شروع میں یہ بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھیں صرف تیز کتھئی رنگ کی تھیں۔ اور ان میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔

ایک دن وہ اس کے پاس ایک ایسی زبان سیکھنے کے لیے آئی جس میں وہ مہارت رکھتا تھا۔

"سر آپ مجھے سکھا دیں گے؟ بس اتنا کہ میں تھوڑا سا پڑھ لکھ سکوں؟" اس نے اپنی تیز کتھئی بڑی بڑی آنکھوں کو اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے پہلی بار لڑکی کو غور سے دیکھا۔ عام سے کچھ زیادہ ہی چوڑے نسوانی کاندھے مگر کمزور چھاتیاں جو اس کے آسمانی رنگ کے دوپٹے کے ڈھلک جانے کے باعث نمایاں لگتی تھیں مگر انھیں نمایاں ہونا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ نمایاں ہونے کے امکان بھر تھے۔ مگر ٹھیک اسی وقت اسے ایک عجیب و غریب امر کا احساس ہوا۔ اس احساس نے لڑکی کے پورے جسم پر کہیں اور دیکھنے

کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ اسے لگا جیسے اس کے چوڑے نسوانی کاندھوں سے اس کے کمزور پستانوں تک دودھ کا ایک پوکھر ہلکورے مار رہا تھا۔ اپنے کناروں سے باہر چھلکتا ہوا ایک نادیدہ پراسرار پوکھر۔

وہ ایک آوارہ کتے کی طرح اس دودھ میں منھ ڈالنے کے لیے بڑھا۔

"مجھے کتنے دن لگیں گے؟" لڑکی نے سوال کیا۔

وہ جب اس زبان کے ابتدائی حروف پڑھا رہا تھا تو یہ سب کچھ نئے سرے سے پیدا ہو جانے جیسا تھا۔ حروف کو سیکھنا ایک معصوم کھیل تھا۔ زبان کی دہشت اور شرانگیزی ابھی کوسوں دور تھی۔ اس کے مسخ شدہ ادھیڑ ہوتے چہرے پر خالص حروف ہیرے کی طرح چمک رہے تھے۔

"جسم میں ڈھیروں عمر آ چکی ہے۔ وقت کہاں سے کہاں آ پہنچا۔" اس نے سوچا۔

"کیا آپ کے دانت میں تکلیف ہے؟ بایاں جبڑا سوجا ہوا ہے۔" اچانک وہ فکرمندی سے بولی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے جبڑے کو ہاتھ سے ڈھک لیا۔

"ہاں۔ یہ مصیبت تو بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ دانتوں کے درمیان خلا ہو گیا ہے۔ رات کھانے کے دوران کچھ پھنس گیا تھا۔" اس نے شرمندگی سے جواب دیا۔

"کیا بہت تکلیف ہے؟" لڑکی کی آواز سے دودھ کے پوکھر میں لہریں اٹھیں۔ اس نے اس پوکھر میں اپنا عکس دیکھا اور پھر بڑی بے صبری اور بھدے پن کے ساتھ اسے سب کچھ بتانے لگا جیسے وہ یہ سب سنانے پر ہی تلا بیٹھا تھا۔

بچپن میں سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ گنے یا بھٹے نہیں کھا سکتا تھا۔ مسوڑھے سوج جایا کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے دودھ کے دانت گرنے میں ہی نہیں آ رہے ہیں اس لیے ایسا ہوتا ہے۔

اسے یاد ہے کہ ایک بار اس کا ایک بچپن کا ساتھی کھیل میں بھاگتے بھاگتے منھ کے بل گر پڑا۔ کولتار کی تپتی ہوئی سڑک سے ٹکرا کر اس کا سامنے کا ایک دانت چوٹ کی وجہ سے نیلا پڑ گیا تھا۔ سب کہتے تھے کہ وہ بے جان ہو کر ایک دن اپنے آپ گر جائے گا مگر دوسرے ہی دن

اس نے اس نیلے دانت کو باہر ابھار کر اخروٹ کا چھلکا توڑ دیا اور پھر فاتحانہ انداز میں بھاگتے بھاگتے ایک چھلاوے کی طرح نظر سے اوجھل ہو گیا۔

نیلے پڑ گئے ہوئے، چوٹ کھائے ہوئے مگر طاقت ور دانت کو باہر نکالے اس کا منھ چڑاتا ہوا وہ بچپن کا ساتھی اکثر اسے خواب میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس سے پریشان ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ پریشان کن خواب کوئی اور تھا۔

"گوشت کھایا ہے۔ ٹھیک سے دانت صاف کرو۔ انگلی سے ملو اور زور زور سے کلی کرو۔" دادا اپنے پوپلے منھ سے باندوں کے جھلنگے پر لیٹے لیٹے حکم دیتے۔

وہ پیتل کا بھاری لوٹا اٹھائے گھر کے دروازے کے قریب پتلی نالی پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔

"غرغر۔ غرغر" وہ کلی کرتا۔ شہادت کی انگلی سے دانتوں کو اوپر نیچے آگے پیچھے زور زور سے رگڑتا۔ اچانک انگلی میں انار کے دانے جیسا کچھ چپک جاتا۔ وہ منھ سے انگلی نکال کر دیکھتا۔ خون میں لتھڑا ہوا چونا لگا ہوا پیلا پیلا دانت تھا۔ وہ گھبرا کر زور سے کلی کرتا۔ وہاں وہ سب نکل کر نالی میں بکھر جاتے۔ دہشت زدہ ہو کر نالی میں سے خون میں سے ڈوبے ہوئے اپنے سارے دانت وہ بٹورنے لگتا۔ کاغذ کی ایک پڑیا میں باندھ کر رکھنے کے لیے۔ شاید یہ دودھ کے دانت ہوں۔ انھیں کہیں زمین میں گڈھا کھود کر داب دیا جائے گا یا پھر چوہیا کے بل میں ڈال دیا جائے گا تاکہ خوب صورت دانت نکلیں وہ سسکنے لگتا دانت ادھر ادھر بکھر جاتے۔ ہاتھ میں نہ آتے۔

"کیا بات ہے سوتے میں رو رہا ہے۔ کیا ہوا بیٹا؟ کیا کوئی خواب دیکھا؟" دادی بے چین ہو کر اٹھ جاتیں۔ وہ کہتی تھیں کہ دانت گرنے کا خواب دیکھنا دراصل درازی عمر کی بشارت ہے۔ اور فجر کے وقت کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ وہ بستر پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔ فجر کی اذان کے ساتھ رات کی آخری ہواؤں میں چھت کے کنڈے سے لٹکی لالٹین ہلتی رہتی، پھر بھڑکنے لگتی۔

"کیا بہت تکلیف رہتی ہے؟" لڑکی کا آسمانی دوپٹہ اس کے بائیں جبڑے کو چھو چھو کر لہرا رہا تھا۔ وہ بہت پاس کھسک آئی تھی۔

"ہاں بہت تکلیف۔ اس کا درد میرے کندھے تک پہنچتا ہے۔"

یہی وہ لمحہ تھا جب لڑکی کی ننھی آنکھوں کا رنگ بدلا تھا۔ وہاں سبز سبز گھنا جنگل اگنے لگا۔ پھر یہ آنکھیں بھی جنگلی سی بن گئیں۔ ایک پل کو اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی جنگلی ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کے درد کے مارے کندھے پر اپنا سر ٹیک رہی تھی۔

"آپ کچھ زیادہ ہی گھبرا رہے ہیں۔ کچھ نہ ہوگا، اب میں علاج شروع کر رہی ہوں۔"

ڈاکٹر کھل کر مسکرائی۔ اس کے ہاتھ میں پتلی پتلی سوئیاں ہیں۔ وہ بس سے پونے دو گھنٹے کا سفر طے کر کے یہاں پہنچا کرتا تھا۔ اس ڈینٹل کلینک کے ایک دم سامنے تیر کمان کی شکل کا ایک فلائی اوور بن گیا ہے جہاں یہ شہر اپنی پوری دہشت کے ساتھ رنگ روڈ پر بہتا چلا جاتا ہے۔ اس علاقے کے فٹ پاتھ عجیب ہیں۔ ان پر لگائے ہوئے درخت نیچے کو جھک آئے ہیں۔ وہ اس کے سر سے ٹکراتے ہیں۔ وہ سڑک پر اترتا ہے تو ٹریفک کا ایک طوفانی ریلا گزرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ریلا اس کے لیے بے معنی ہے مگر وہ سہم کر دوبارہ فٹ پاتھ پر چڑھ آتا ہے۔ فٹ پاتھ ویران ہے۔ اس پر صرف درخت جھومتے ہیں۔ پریتوں کی طرح لہراتے ہیں۔ وہ کمر اور شانے جھکا کر چلتا ہے۔

ڈینٹل کلینک تک پہنچنے کے لیے تمھیں اس فلائی اوور کو پار کرنا ضروری ہے۔

ایک بھرے پرے بازار سے گزر کر، ایک پتلا سا زینہ چڑھ کر جب اس ڈینٹل کلینک کے سامنے کھڑے ہوتے ہو تو پہلی نظر میں تمھیں یہ جوتوں یا چپلوں کا شوکیس نظر آئے گا اور ممکن ہے کہ تم ٹھٹک جاؤ۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دراصل ڈینٹل کلینک میں آپ کو اپنے جوتے یا چپل اتار کر داخل ہونا ہوتا ہے۔ یہ سب دکھتے اور سڑتے دانتوں والے انسانوں کے اتارے ہوئے جوتوں کے ڈھیر ہیں جو اندر پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یقیناً یہاں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے پیدائشی ٹیڑھے یا ہونٹوں پر نمودار ہوتے ہوئے دانتوں پر صرف تار بندھوانے آئے ہیں یا دانت کی کسی کھُردری نوک کو ریتی سے گھسوانے آئے ہیں جو ان کی زبان میں یا گال کے اندرونی حصے میں چبھنے لگی تھی۔ مگر زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنی ڈاڑھ یا دانت نکلوانے

آئے ہیں۔

کبھی کبھی اسے یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے کہ اگر دانت اتنی تیزی سے نکلوائے جاتے رہے تو ڈینٹل کلینک سے باہر آیا ہوا ہر چہرہ پچکا ہوا نظر آئے گا۔ ڈینٹل کلینک چاروں طرف سے شیشے سے گھرا ہوا ایر کنڈیشنڈ چیمبر ہے۔ یہاں سب سے پہلے تمھاری نظر ایک عجیب وغریب ساخت والی مشین پر پڑتی ہے۔ جو ایک دیوزاد مکھی کی صورت ایک بڑی سی آرام دہ کرسی پر بھنبھنا رہی ہے۔ ادھر ادھر چھوٹے چھوٹے اسٹول پڑے ہیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ انسانی دانتوں کی تصویریں چسپاں ہیں۔ رنگین اور سیاہ دونوں۔ سفید اوور کوٹ پہنے دو لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں اپنی اپنی جگہ روبوٹ کی طرح کھڑی ہیں۔ کچھ عجیب الخلقت قسم کے بے رحم اوزار اپنے تمام جبر اور تشدد کے ساتھ یہاں وہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ اوزار ہی ہیں جن کے سہارے کبھی کبھی وہ اندر کلینک میں یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم ایک زیادہ روشن مسکراہٹ تمھارے چہرے کو بخش سکتے ہیں۔ وہ مسکراہٹ جو تمھیں خدا نے نہیں بخشی تھی۔ وہ ہم تمھیں عطا کریں گے کیوں کہ دانتوں پر ہی گال اور جبڑے کے عضلات منحصر کرتے ہیں۔ دانتوں کو درست کر کے، ان کی مرمت کر کے ایک خوش نما مسکراہٹ کے ساتھ ہم تمھیں ڈینٹل کلینک سے وداع کر سکتے ہیں۔ بھلے ہی وہ ایک زخمی خوش نمائی ہو۔ چوٹ کھائی ہوئی مسکراہٹ۔ مگر اس کلینک کا سب سے دل فریب پہلو یہاں کی قبول صورت، بظاہر نرم دل اور ہم درد نظر آنے والی پیشہ ورانہ مہارت سے لب ریز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہوئے ڈاکٹر عورتیں ہیں۔ یہ عورتیں ہی اس بے رحم، خطرناک ڈینٹل کلینک کو تھوڑا سا قابلِ برداشت بناتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے حوا نے دنیا کو قابلِ برداشت بنایا تھا۔

مگر یقیناً ایسی دنیائیں بھی ہوں گی جہاں بی بی حوا نہ ہو، اس کے چڑ چڑے بھوت ہوں۔

وہ صبح صبح ہی غصے سے بھر کر چلانے لگی۔

"تم آخر اس قدر چیختی کیوں ہو؟" وہ آہستہ سے بولا۔ "چڑیل کی طرح۔" اس کے اندر کوئی اور بھی آہستہ سے بڑبڑایا جسے وہ نہ سن سکی۔

"تم صبح صبح بغیر دانت صاف کیے میرے منھ میں کیوں گھسے آتے ہو؟" وہ دوبارہ چیخی اور اس کے سوکھے بغیر کنگھی کیے ہوئے کھچڑی بال اس کے چہرے پر دیوانہ وار گھومنے لگے۔

ایسی چیخ چلاہٹ کا اپنا انفرادی تشدد تھا۔ انفرادی اور اجتماعی تشدد دو الگ الگ شے نہیں ہیں۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں۔ غنودگی میں ایسا ہوگیا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا۔

"دانتوں میں کیڑا لگا پڑا ہے۔ بدبو کے بھپکے اڑتے ہیں۔" وہ زہرخند لہجے میں بولی۔ "جب دیکھو میٹھا نگل رہے ہو۔ حلوہ بھرے جا رہے ہو۔ سوتے جاگتے حلوہ، اٹھتے بیٹھتے حلوہ۔"

"حلوے کی برائی مت کرنا۔ حلوہ کھانا سنت ہے۔" وہ ایک بے معنی غرور سے تن گیا۔

"بس یہی ایک سنت تو رہ گئی ہے ...... ہے نا بدعتیوں کا خاندان۔" اس کے ہونٹوں پر سفید تھوک کے ذرات نمایاں ہوگئے۔

مگر وہ شاید یہ نہیں سن رہا تھا۔

"دیکھو بیٹا" دادی اسے گود میں بٹھا کر اپنے پوپلے منھ سے سمجھا رہی تھیں۔ "حلوہ کھالو۔ اسے منع نہیں کرتے۔ حلوہ حضور کو بے حد مرغوب تھا۔ ایک دفعہ جنگ میں جب ان کا دندان مبارک شہید ہوگیا تو حضرت اویس قرنیؓ نے اپنے سارے دانت پتھر سے مار کر توڑ ڈالے۔ جانتے ہو کیوں؟"

دادی نے حلوہ کا چمچہ اس کے منھ میں دے دیا۔ اس کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اس لیے کہ وہ حضور سے بہت محبت کرتے تھے حالاں کہ انھوں نے کبھی حضور کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ تب ہی سے شب برات کو حلوے پر حضرت اویس قرنیؓ کی فاتحہ بھی دی جاتی ہے کیوں کہ وہ کچھ اور کھانے کے قابل نہ تھے۔"

ڈینٹل کلینک کی آرام دہ کرسی پر لیٹے لیٹے اس نے سوچا۔ پتھر سے اپنے تمام دانت توڑ ڈالنا اپنی ماہیت میں کون سا جذبہ تھا؟ اور یہ بھی کہ پوپلے منھ والے حلوہ ہی کھا سکتے ہیں۔ حلوے اور دانت کا تعلق تو بہت پرانا ہے، لیکن صرف زندہ لوگ ہی کیوں، مردوں سے بھی ایک

پراسرار رشتہ ہے۔

وہ جاڑوں کی بھری دوپہر تھی۔ دادی کی لاش دالان میں بستر پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ محلے کی چند عورتیں آئیں اور انھوں نے گھر کے چولھے پر ایک دیگچہ چڑھا کر اس میں کفگیر چلانا شروع کر دی۔ گھر میں سوجی کے حلوے کی سوندھی مہک سلگتے ہوئے عود ولوبان کے ساتھ مل کر دادی کے مردہ جسم کے گرد آ کر بھٹکنے لگی۔ تھوڑی دیر میں آس پاس کے ننگ دھڑنگ بچے گھر کی چوکھٹ پر بھکاریوں کی طرح آ کر کھڑے ہوگئے۔ ایک عورت نے حلوہ نکال نکال کر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دادی کے بے جان جسم کے پاس آیا۔ اس نے ان کے چہرے سے چادر سرکا دی۔ اسے لگا جیسے وہ مسکرا رہی تھیں مگر ان کے مردہ اور پوپلے منھ کی وجہ سے یہ مسکراہٹ چہرے سے پھسل کر کہیں اور گر رہی تھی۔ کہاں؟ وہ تلاش نہ کر سکا۔

اور تب وہ مطمئن ہوگیا کہ یہ تو قبول کرنا ہی پڑے گا۔

شیشوں سے گھرے اس ایرکنڈیشنڈ چیمبر میں داخل ہونے سے پہلے تم کو اس کراہیت اور بدہیئتی کو قبول کرنا پڑے گا۔ وہ موجود ہے تمھاری کھوکھلی ہوتی ہوئی ڈاڑھوں میں، دانتوں سے جھڑتے ہوئے چونے میں اور سوجے ہوئے سرخ مسوڑھوں میں۔

نرس نے اس کے سر پر ایک تیز روشنی والا بلب روشن کیا۔

اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چشمہ اتار کر الگ رکھ دیا۔

"آپ زیادہ ہی گھبرا رہے ہیں۔ کچھ نہ ہوگا۔" ڈاکٹر ہنسی۔ اس کے ہاتھ میں بال برابر کئی سوئیاں ہیں۔ وہ اس کا "روٹ کینال" کرے گی۔ دانتوں کے اندر نیلی نہریں بہتی ہیں۔ ان میں سیاہ کیڑے تیرتے ہیں۔

وہ اکیلا، حواس باختہ آرام کرسی پر پڑا تھا۔ تیز روشنی والے بلب نے اچانک اسے ساری کائنات سے جدا کر دیا۔ دیوزاد مکھی کی جلتی ہوئی بھیانک آنکھ کے سامنے اس کو کس جرم کے لیے جواب دہ بنا کر اس کا مقدر لکھ دیا تھا؟ یہ شاید کنفیشن چیئر تھی۔ یہ ایک قسم کی پوچھ گچھ

تھی۔تھرڈ ڈگری۔ تیز روشنی والے بلب کے اس پار، ڈینٹل کلینک کے شیشے کی دیوار سے لگی کھڑی وہ اسے نظر آتی ہے۔ شیشے کی دھول صاف کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر کی ماتحت جوان اور پر کشش تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر چشمے کا فریم تھا۔وہ اچانک اس کے اوپر جھک آئی اور نرمی سے بولی۔"

''آپ کانپ رہے ہیں۔''

نہیں۔ اس کے جسم سے کوئی خوش بو نہیں آتی ۔ وہاں صرف دواؤں اور کلورو فارم کی مہک ہے ۔ ایک پتلی سی سوئی جبڑے کی گہرائیوں میں کوئی نہر کوئی سرنگ بناتی چلی جاتی ہے۔ وہ تیز تیز سانسیں لینے لگتا ہے۔

ہفتے میں ایک بار اسے اس علاج کی خاطر یہاں آنا پڑتا ہے اور تشدد برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ تشدد کے بارے میں تفصیل سے سوچنے لگتا تھا۔

دو تین بار یہاں آنے کے بعد جی کو بھی صبر آ گیا تھا۔ اب وہ اس طرح نہیں گھبراتا تھا۔ یہ ایک قسم کی بے حسی تھی جو ایک خاص طرح کے تشدد کے لیے ذہنی راہ ہموار کرتی ہے۔ پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ تشدد کا فاعلی روپ ہے یا مفعولی۔ جب انسان اپنے عقب میں تیز بھاگتی ہوئی روشنیوں کو کچلتا ہے تو یہ تشدد ہے۔ جب انسان اپنے میلے جانگیے کو رگڑ کر صاف کرتا ہے تو یہ تشدد ہے۔ جب انسان آدھی رات میں دور سے آتی ہوئی کسی ننھے بچے کے رونے کی آواز کو نظر انداز کرتا ہے تو یہ تشدد ہے۔

تشدد کہاں نہیں تھا۔ اب صورتِ حال بدل جانے کے بعد بھی وہ موجود ہے اس طرح کہ ایک تمسخرانہ مسکراہٹ میں شامل ہے۔ انسانوں کے درمیان تمام رشتوں میں گندھا ہوا یہ بے زبان تشدد، مگر بے رحمی کے ساتھ سب کو ستاتا ہوا، کچلتا ہوا،

جب وہ دانت کی تاریک گہرائی میں سوئی داخل کرتی ہے تو منھ کھلا رہنا چاہیے۔تم مضحکہ خیز حد تک اپنا منھ پھاڑے رکھو گے۔ یوں نیم دراز ہو کر بد نیت دیوزاد مکھی کی کتھئی روشنی میں تمھارے دانتوں کے نہاں خانے روشن ہو جاتے ہیں کیا یہ ایک قسم کی عریانیت اور خطرناک

فحاشی نہیں؟ ایسے میں اگر اس ڈاکٹر کے چہرے پر چشمہ بھی ہو تو تم اپنا بھدا اور بے تکا منھ ٹھیک اس کے لینس پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سب اس لیے اور بھی زیادہ بے شرم ہے کہ وہ سوئیاں اندر کہیں بہت اندر جا کر چبھتی ہیں ۔ ان کی چبھن کا احساس اکثر وہاں نہیں ہوتا جہاں وہ موجود ہیں۔تھوڑا ادھر ادھر محسوس ہوتا ہے جیسے ناک میں، کان میں یا حلق کی نالی میں۔

وہ تنگ آ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں بہت زیادہ سیاہ ہیں۔ اس نے اتنی سیاہ آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھیں مگر اسے ان آنکھوں سے اکتاہٹ کا احساس ہو رہا ہے۔

آنکھیں بند کیے کیے اس نے پھر اس تشدد کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں...... اندر وہ نہ جانے کب سے لیٹا تھا۔ دکھتے دانتوں اور جبڑوں کے اندر پیوست ہوتی سوئیوں سے پریشان ہو کر، گھبرا کر مضبوطی سے کرسی کا ہتھا پکڑ لینا، ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا اور پھر ردِ عمل کے طور پر اپنے منھ کو اور بھی زیادہ پھاڑ کر، ڈاکٹر کی کالی آنکھوں میں بے معنی انداز میں گھورنا بھی اس بد بخت تشدد کا جواب تھا۔ ہاتھی کے مقابل میں چیونٹی کو مارنا یقیناً زیادہ بڑا تشدد ہے۔ کمزور کا تشدد زیادہ کمینہ ہوتا ہے...... وہ طاقت ور کے تشدد سے زیادہ چالاک، مکار اور فن کارانہ ہوتا ہے۔ بارہا اس نے سوچا کہ دنیا میں لاکھوں لوگ روز مر جاتے ہیں آخر وہ کیوں نہیں مر جاتی؟ کاش وہ مر جائے تو دنیا میں بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ پھر دنیا کتنی خوب صورت ہو جاتی۔

ظاہر ہے کہ اس طرح سوچنا گھٹیا، بے معنی اور مضحکہ خیز تھا۔ مگر دراصل یہ ایک بڑی دہشت گردی تھی۔ ایک عظیم تشدد، کہ رشی، دیوتا اور مجذوب تو شراب یا بد دعا دے کر جس کے متحمل ہو سکتے تھے مگر عام انسان کے لیے یہ بہت نیچ، شرم ناک اور ٹھپا ہتھیار تھا۔ یہ ناقابلِ معافی تھا۔

مگر کیا کوئی کسی کو معاف کر رہا تھا؟

کبھی کبھی وہ اپنے مرے ہوؤں سے مدد مانگتا تھا۔ اور یقیناً یہ بھی تشدد تھا۔ دنیا جہان سے ماوراان پاک روحوں کو دوبارہ گھسیٹ کر کھینچ کر دنیا میں لانا ان سے دنیا کے کاموں میں مدد

لینا ان کی روحوں کو شدید کرب اور چڑچڑاہٹ میں مبتلا کر دینے والے کے علاوہ اور کیا تھا؟ یہ تشدد کا حصار تھا جو اپنی ماہیت میں دنیا کے رگ و ریشے میں سما گیا تھا۔

''ٹھنڈا گرم کب سے لگ رہا تھا؟'' ڈاکٹر نے سوئی کو دانت سے باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

''گرم نہیں۔ ٹھنڈا لگتا تھا۔ نہ جانے کب سے۔'' وہ زبردستی مسکرایا۔

دراصل جن دنوں منھ سے بدبو آنا شروع ہوئی تھی ان ہی دنوں ذرا سا ٹھنڈا پانی بھی دانت پر نشتر کی سی کاٹ کرتا تھا۔ ایک ٹھنڈی برفیلی آگ جبڑے کو جھلساتی ہوئی ناک کی ہڈی اور آنکھ سے گزرتی ہوئی کنپٹی تک پہنچی تھی۔

مسئلہ بدبو کا بھی تھا۔ تب دانتوں میں پس پڑ گیا تھا برش کرتے وقت واش بیسن میں خون کے ذرات شامل ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ خراب ہو رہے تھے۔

''تم بتاؤ۔ میں تمھیں پیار کرتا ہوں تو کیا میرے منھ سے بدبو آتی ہے؟'' ان دنوں وہ جنگلی آنکھوں والی لڑکی کے ہونٹ چومتے ہوئے پوچھتا۔

''نہیں۔'' وہ سادگی سے جواب دیتی۔

''سچ بتاؤ تمھیں میری جان کی قسم۔''

''نہیں۔ تمھاری قسم۔'' وہ جواباً اسے چومتی اور اس کا بدن اچانک بھرا بھرا نظر آنے لگتا۔

کیا یہ کوئی معمولی بات تھی؟ منھ کی یہی بدبو تھی جو اس بدنصیب شیر کے منھ سے آ رہی تھی۔ وہی شیر جو اپنے پیارے دوست لکڑہارے کی عیادت کے لیے جنگل سے اس کے گھر آیا تھا۔ اپنی جان پر کھیل کر، مگر اس دن لکڑہارے نے اپنے پلنگ کے پائتی بیٹھے ہوئے شیر کے منھ کی بدبو کو برداشت نہ کیا تھا۔ اپنا ٹوٹا ہوا دل لے کر شیر وہاں سے چپ چاپ واپس جنگل کو لوٹ گیا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس انوکھی دوستی کو توڑ کر۔ وہ کئی سال پہلے کی بات تھی۔ جب وہ تمام خدشات کی پروا نہ کرتے ہوئے اکثر اس کے گھر اس کی کتابوں کی دھول صاف کرنے آ جایا کرتی تھی۔ تیز روشنی والے بلب کے اس پار اب وہ اسے ڈینٹل کلینک کے شیشے کی دھول صاف کرتی ہوئی نظر آتی ہے، اس کے سوکھے ہوئے ہاتھوں پر نیلی لکیریں نظر آتی

ہیں، وہ دھول صاف کر رہی ہے مگر اس کی جنگلی آنکھوں کے سہمے ہوئے آنسو اس شیشے کو دھندلا کر رہے ہیں۔

وہ کوئی دعا پڑھ رہی تھی؟ کم نصیب دعا جو شیشے سے باہر رہ جاتی ہے۔ چمگادڑ کے مردہ پروں کی طرح شیشے سے چپکی ہوئی۔ آرام کرسی پر لیٹے، برف جیسے ٹھنڈے مطب میں اس نے انھیں صاف صاف دیکھا۔ وہ مایوس ہاتھ، دھول صاف کرتے وقت گویا کنفیشن چیمبر پر لیٹے ہوئے اس کے مجرم وجود کو چڑا بھی رہے تھے۔

دھول جھاڑنا اور دھول صاف کرنا دو قطعی مختلف باتیں ہیں۔ یکسر متضاد۔ وہ دھول جھاڑتی نہیں، صاف کرتی ہے۔ اس وقت اسے ان ہاتھوں کی لازمی بے چارگی، مایوسی اور بے معنویت صاف نظر آ جاتی ہے ان ہاتھوں پر ابھری نیلی لکیریں آہستہ آہستہ موت کی طرف جانے والی زہریلی راہیں ہیں۔

وہ کہاں جا رہی تھی؟ کہاں چل رہی تھی؟ وہ اپنے ان دو افسردہ ہاتھوں پر چل رہی ہے وہ ان زہریلی نیلی لکیروں پر آگے بڑھتی جاتی ہے اور گم ہوتی جاتی ہے۔

''وہ میرے لیے گم ہو رہی ہے۔'' شیشے کے اندر اس نے لیٹے لیٹے سوچا۔

شیشے کا یہ چیمبر ہر امکان سے خالی ہے۔ ان کی بے حس مسکراہٹوں کے جواب میں اس کے پاس بھی ایک بے حس مسکراہٹ ہے، کوئی چیخ نہیں۔ کلی کرنے سے پہلے اور کلی کرنے کے بعد بھی، اگرچہ کرسی کے ہتھے پر ٹکے ہوئے واش بیسن میں خون بھی شامل ہوتا جاتا ہے۔

کسی نے کہا تھا: ''ظلم جب بارش کی طرح آتا ہے تو کوئی چیخ بلند نہیں ہوتی۔''

آخری روز فیصلہ کن جھڑپ سے تقریباً دو ہفتے بیشتر اچانک اس کے دانت کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی نا قابلِ برداشت۔ اسے ہر وقت ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا تھا۔ بائیں طرف کا جبڑا سوج کر نیچے کو لٹک آیا تھا۔ بولنے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ چہرے کی نرمی اور اس کے اپنے خدوخال نہ جانے کہاں چھپ گئے تھے۔ اب تو یہ چہرہ ایک بے حد غصہ ور، چڑچڑے اور بد دماغ انسان کا نظر آنے لگا تھا مگر اصل عذاب تو کھانا کھانا اور چبانا تھا۔ سارا چہرہ درد کی شدت سے پسینے میں تر

ہو جاتا تھا۔ کسی طرح کھا چکنے کے بعد وہ گھنٹوں اپنا جبڑا ہتھیلی سے دبائے بیٹھا رہتا درد کم کرنے والی دوائیں آہستہ آہستہ اس پر اپنی تاثیر کھو رہی تھی۔ کھانا ٹھیک سے نہ چبا سکنے کی وجہ سے مستقل طور پر اس کا پیٹ بھی خراب رہنے لگا تھا۔ حلوے کے علاوہ وہ جو بھی کھاتا ہضم نہ ہو پاتا اور مروڑ کے بعد آنتیں اسے فضلے اور خون کی شکل میں باہر نکال پھینکتیں۔

اس دن شام ہی سے اوس بہت پڑ رہی تھی۔ گھر میں عجیب نظر نہ آنے والی نمی سی تھی۔ ہمیشہ کی طرح معمولی سی بات تھی مگر وہ دو الگ الگ ذہن تھے۔ دو الگ الگ ذہن دراصل دو الگ الگ مذہب ہیں۔ دو مختلف کلچر۔ وہ آپس میں مل کر صرف غصہ، برہمی، احتجاج اور غارت گری پیدا کر سکتے ہیں اگر چہ کبھی کبھی رو روایت یا رواداری کا التباس بھی پیدا ہوتا ہے۔

میں پوچھتی ہوں وہ حرافہ کیوں منہ اٹھائے چلی آتی ہے اس گھر میں؟ تمھاری کتابوں کی دیکھ بھال کے بہانے تمھیں اپنے ہاتھوں سے نوالے کھلا رہی تھی مال زادی۔ وہ اس طرح سے چیخی کہ اس کے کھچڑی ہوتے ہوئے بال، ایک پل کو اس کے سر پر بونڈر کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خبردار جو اسے بیچ میں لائی" وہ بھی تقریباً اسی طاقت سے دہاڑنا چاہتا تھا۔ مگر محبت سے چھپا کر لائی گئی ایک سفید گول چپاتی نے اسے شانت کر دیا اور اس کا لہجہ عام سے زیادہ بلند نہ ہو سکا۔

"کیوں بہت برا لگا؟ پاگل ہوگئی ہے کتیا، نہ جانے تجھ جیسے بڈھے میں کیا دیکھ رہی ہے۔ دانت تک تو سڑنے لگے ہیں تمھارے۔ ویسے جوانی میں بھی چکنے چپڑے لونڈیوں جیسے چہرے کے علاوہ تمھارے پاس کیا تھا؟ ایک بچہ تک تو پیدا نہ کرسکے۔"

اپنے بھاری بھاری پستانوں کو ہلاتے ہوئے اس نے ایک عجیب پر اسرار نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ایک پل کو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں بند کیے اس ذلت ونفرت کے نئے جھونکے میں فرش پر کھڑا جھومتا رہا۔ اور بس یہی وہ لہجہ تھا جب اس کے اندر کا کمینہ تشدد با اخلاق بن گیا۔

"ایسی بد مزاج عورت کو دنیا میں رہنے کا کیا حق تھا؟ میں اس عورت کو قتل کردوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں۔ گلا کاٹ کر رکھ دوں گا۔ سر الگ۔ دھڑ الگ۔ بس یہی ایک راستہ ہے۔" اس کے اندر پتہ نہیں کون بے حد اطمینان اور فیصلہ کن لہجے میں چالاکی کے ساتھ غرائے جا رہا تھا۔

پھر اسی طرح فرش پر نظریں جمائے جمائے اس نے اپنی سیاہ پرچھائیں کو خود سے جدا ہوتے، ہاتھ میں بڑا سا خنجر لیے عورت پر ایک لمبی چھلانگ لگاتے دیکھا۔

وہ اپنی اس جواں مرد اور غصہ ور پرچھائیں سے بھڑک کر بھاگا۔ اوس سے بھیگی ہوئی رات میں وہ جہاں بھی بھٹکا اس کا بدن چپچپاتا رہا اور ایک ناقابل تشریح قسم کی کم زوری اور خوف کے باعث تمام رات اس کے پیر کانپتے رہے۔

اور پھر جنگلی آنکھوں والی لڑکی نے اس کی قمیص کے کالر کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"کہاں جا رہے ہو۔ تم مجھے چھوڑ کر ہرگز نہیں جا سکتے۔"

وہ خاموش سر جھکائے کھڑا رہا۔

"کیا پھر جھگڑا ہوا؟ میں نے تمھیں کتنی بار سمجھایا کہ تم بولا مت کرو۔ کسی بات کا جواب ہی نہ دیا کرو۔"

وہ زمین تکتا رہا۔

"بولو، کہاں جا رہے ہو؟" اس نے اپنے دانت پوری طاقت سے اس کے سینے میں گاڑ دیے

"میں اپنے دانت ٹھیک کروانے جا رہا ہوں۔" اس نے اداسی کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن کہاں؟"

"پتہ نہیں۔"

"تم نہیں جا سکتے، جانے سے پہلے تمھیں مجھے زہر لا کر دینا ہوگا۔"

اب وہ زور زور سے ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

تو یہ تھا اصل میں محبت کا تشدد۔ اور بھی زیادہ آسیبی اور ہڈیوں کو گلا دینے والا۔ اس نے آخر کار سوچا۔ مگر اس تشدد کو خوش دلی سے برداشت کرنے کے لیے مضبوط اور زندہ دانت ہونا ضروری تھے۔

"بتاؤ پہلے مجھے زہر لا کر دو گے؟" اس نے ایک بار پھر اس کے سینے میں کاٹا۔

وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔

"ہاں زہر لا کر دوں گا۔" اس نے کم زور لہجے میں کہا۔

اب تو زمانہ گزر گیا جب قتل کی خواہش اور زہر کی فرمائش دونوں کو اپنی پوٹلی میں بھرے ہوئے آدھی رات میں ایک بے حد تیز رفتار بس میں سوار ہو کر اپنے آگے پیچھے بھاگتی ہوئی روشنیوں، بد دماغیوں، جہالتوں اور محبتوں کو کچلتا ہوا آخر کار وہ اس شہر تک آ پہونچا تھا۔ یہ بڑا شہر جہاں صرف فلائی اوور اور انسانوں کو اچھالتی پھینکتی اور قتل کرتی دیوانی بسیں ہی دوڑتی بھٹکتی نظر آتیں۔

اس رات اسے نیند تو آئی مگر وہ بالکل ہی سیاہ نیند نہ تھی۔ وہ آنکھوں پر پنڈول کے گاڑھے نالے کی طرح بہتی ہوئی آئی۔ ٹھنڈی۔ پرانی۔ جانی پہچانی۔ اس میں ایک خفی سے اجالے کا احساس باقی تھا۔ ایسا اجالا جو دل کو روشن نہیں کرتا۔ دنیا کے بے ہنگم پن میں کھڑے ہوئے افراد، اشیا اور منظروں کو روشن کرتا ہے۔ یہ افسردگی کی انتہا تھی۔

آدھی رات کہیں دور کوئی چھوٹا بچہ دردناک آواز میں روئے جا رہا تھا۔

"اس کے دانت نکل رہے ہوں گے۔" اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

وہاں پانی سا پانی تھا۔ وہ ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ بہت اونچے کراڑے تھے، پنڈول کے رنگ کے کراڑے۔ پنڈول جیسی مٹیالی ندی مگر یہ بڑا، چوڑا پاٹ، سب کچھ کالا سفید تھا، کوئی رنگ نہ تھا۔ ہریالی تو بالکل ہی نہیں۔ کنارے پر بے شمار کیکڑے گھوم رہے تھے۔ اچانک ایک کیکڑے نے اس کا پیر پکڑ لیا، وہ چیخ اٹھا۔

اچھا تھا کہ کیکڑے نے اس کے جوتے کو پکڑ رکھا تھا۔

کیکڑا مسکرایا، پھر جوتا چھوڑ کر ایک طرف کو رینگ گیا۔

اب اسے بہت زور کا پیشاب لگ رہا تھا۔ وہ حواس باختہ ایک گھر میں گھستا چلا گیا۔

آنگن میں بیٹھی ایک بیمار اور افسردہ نظر آنے والی ادھیڑ عمر کی عورت نے اسے حیرت سے

دیکھا۔ عورت کے سامنے مٹی کی ہانڈی میں حلوہ رکھا تھا۔ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"پیشاب کرنے کے لیے۔ یقین کرو۔ صرف پیشاب کرنے کے لیے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ اور باہر کوئی زمین، کوئی نالی، کوئی سڑک نہیں ہے۔ خدا کے لیے میں چور نہیں ہوں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

گھر میں مٹی اور حلوے کی مہک پھیلتی جاتی تھی۔ ادھیڑ عمر کی بیمار اداس عورت کچھ نہ بولی۔ اس نے کوئی شور نہ مچایا مگر اس کی آنکھوں میں اس کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ نہ رحم، نہ دہشت، نہ نفرت نہ ممتا۔ یہ خالی آنکھ تھی۔ اس کی خالی آنکھ میں بے تکی دنیا بہی جاتی تھی۔

"آپ نہ جانے کیوں گھبرا رہے ہیں جناب۔ لیجیے کلی کیجیے۔"

وہ کلی نہیں کر پاتا۔ اس کا پورا منہ سن ہو گیا ہے۔

"زور سے کلی کیجیے۔"

"مجھے پیشاب لگا ہے۔ بہت زور کا پیشاب۔" وہ گڑگڑا کر کہتا ہے۔

"اس ڈینٹل کلینک میں کوئی پیشاب گھر نہیں ہے۔" ڈاکٹر کی آواز اچانک بے رحم ہو جاتی ہے۔

"یا خدا!" اس کے کھلے ہوئے منہ سے آہستگی کے ساتھ نکلا۔

سوئی ڈاڑھ کی گہرائیوں میں چھپے نہ جانے کس گوشت کے ریشے سے ٹکرائی تھی۔ مگر خدا، وہ ڈینٹل کلینک میں نہیں تھا۔ وقت کے کتنے ٹیلوں کے پیچھے وہ لمحہ کب کا گزر چکا تھا جب انسان اور خدا دونوں نے ایک دوسرے کو نمناک آنکھوں سے وداع کیا تھا۔ خدا کا وجود کلینک سے باہر عدم میں گم شدہ ہو کر کائنات کا سب سے بڑا سانحہ بن چکا تھا۔

"آپ کو کیا ایسا اکثر ہو جاتا ہے؟" ڈاکٹر پوچھ رہی تھی۔

"کیسا؟" وہ حیران ہوا۔

"آپ کا بلڈ پریشر کبھی کبھی اچانک کیا اتنا بڑھ جاتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا۔" وہ بولا۔

''شاید گھبراہٹ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ آپ کا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ہمیں آپ کو خواب آور انجکشن دینا پڑا۔ اب تو نارمل ہے۔'' ڈاکٹر نے اطمینان دلایا۔

اسے ہلکی سی کھانسی آئی تو بائیں طرف کا جبڑا بلکہ پوری بتیسی ہل کر رہ گئی۔ وہاں دانتوں کے خالی بل تھے۔ اسے اپنی آنتوں میں بے چینی کا احساس ہوا۔ اس نے بے حد اداس ہوکر سوچا۔

''انسان کے اندر ایک نہیں، شاید بہت سی روحیں رہتی ہیں۔ مگر وہ کون سی روح ہے جو سب کچھ تباہ کردینا چاہتی ہے۔ اس جسم کو بھی ختم کردینا چاہتی ہے۔ جس کی آنتوں سے خون آرہا ہو اور اس روح کو بھی مٹا دینا چاہتی ہے جو صدیوں سے جسم سے الگ کھڑے ہوکر اسے فاصلے سے دیکھتی ہے اور روح/جسم کی دوئی کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ کون سی روح تھی؟ یہ کوئی اور پراسرار و دبیز شے ہے۔ ایک کٹنی کی طرح کریہہ، بدنیت اور حاسد۔ یہ روح اور جسم دونوں سے ماورا آوارہ گھومتی ہے اور تشدد اور نفرت کا نازک شر انگیز فن کاری کے ساتھ رچا ہوا کھیل کھیلتی ہے۔ شطرنج کی طرح۔

''بس ایک بار کلی اور کرلیجیے۔ آخر بار۔ اچھی طرح۔'' ڈاکٹر کہتی ہے۔

''آپ کی پچھلی ڈاڑھیں تو تقریباً غائب ہیں۔ آپ کو کئی بار آنا پڑے گا۔ دانت بالکل گل چکے ہیں۔ آپ نے آنے میں بہت دیر کی۔ ایسی صورت میں تو روٹ کینال بھی پورا کامیاب نہیں رہتا۔''

''درد تو چلا جائے گا؟'' اس نے کم زور سی امید کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ساری سڑن نکال دینے کے بعد ہم اسٹیل کا کراؤن لگادیں گے۔ اگر آپ چاہیں گے تو سونے یا چاندی کا بھی لگا سکتے ہیں۔ ہم ڈاڑھ بھر دینے میں تو کامیاب ہوجائیں گے مگر صاف بات تو یہ ہے کہ یہ اندر ہی اندر پھر بھی گلتی رہیں گی اور ان کی گہرائی میں خون اور مواد بھی موجود رہے گا۔''

وہ اس کا چہرہ تکتا رہا۔ ڈاکٹر نے اپنے دستانے اتارے اور بولی۔

''اگلے ہفتے اسی دن آپ کو پھر یہاں آنا ہے۔ میں نوٹ کرلیتی ہوں۔ اپنے بلڈ پریشر کا

بھی خیال رکھیے۔ اگر ممکن ہو تو کسی ماہر نفسیات سے بھی مل لیجیے گا۔ اب آپ اٹھ سکتے ہیں۔''

اپنا چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ایک بار میں اٹھ نہ سکا۔ سارا جسم سن پڑ گیا تھا۔

تو کیا اس سے باہر کوئی دنیا تھی یا سارا تماشا اندر ہی ہو رہا تھا؟ نہیں اب خون، تھوک، روئی اور پیپ بھری سڑی گلتی ڈاڑھوں کے پرے کچھ نہ تھا۔

اور تب اس نے پہلی بار سوچا، شدت کے ساتھ۔

کاش میں اسی کرسی پر لیٹا لیٹا ڈینٹل کلینک میں مرجاتا۔ مگر ڈینٹل کلینک میں موت کا گزر نہیں۔ یہاں کسی کو مرنے کی اجازت نہیں۔ اب باہر کچھ نہ تھا۔ موت بھی نہیں، صرف سناٹا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے روزِ ازل ہی سے وہ اس مطب کے باہر اکڑوں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کررہا تھا اور اب ایک بار اپنے جوتے اتار کر اندر داخل ہونے کے بعد باہر کے کوئی معنی نہ تھے۔ وہ تو گویا صدیوں سے یہاں لیٹا تھا۔ مضحکہ خیز، بے تکے انداز میں بھاڑ سا منہ کھولے، اس کنفیشن چیر پر۔

وہ بڑی تکلیف سے اٹھ پایا۔ کسی کسی طرح اس نے اپنے سن ہاتھوں سے شیشے کا دروازہ کھولا اور سونے سونے قدموں سے خلا میں اگے ہوئے ایک بھیانک فلائی اوور کی طرف بڑھنے لگا۔

سائے

اب اس شہر کی گلیوں میں وہ پرانے سائے نہیں پڑتے ۔ عمارتیں بدل گئی ہیں۔ بہت سی عمارتیں مٹ بھی چکی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں گھروں کے اندر چلی آئی ہیں۔ پرچھائیاں پڑنے کے لیے زمین پر جگہ بھی کم ہوگئی ہے۔ دور دور تک کوئی میدان یا خالی زمین کا ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ اب تو سائے خود سے ہی ٹکراتے اور اپنی ہی نفی کرتے رہ جاتے ہیں۔

وہ کم سے کم بیس سال کے بعد اس شہر میں آیا تھا۔

یہ شہر نئے اور پرانے دو خطوں میں تقسیم تھا۔ وہ نئے شہر میں ایک دوست کی شادی میں شرکت کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اپنے بچپن کے اس شہر کو ایک بار پھر سے اسی پرانے انداز سے محسوس کرنے کی خاطر وہ پیدل ہی چل نکلا۔ راستہ خاصا طویل اور پیچ دار گلیوں، چوراہوں اور تنگ اور چوڑی سڑکوں سے گذرتا تھا، مگر آسمان تاروں سے روشن تھا۔

وہ آہستہ آہستہ نہیں چل رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح تیز تیز چل رہا تھا۔ زیادہ تر زمین پر اپنی بے تکی پرچھائیں کو دیکھتا ہوا اور اسی سے محظوظ ہوتا ہوا۔

فروری کا ہر دن اکتا دینے کی حد تک دوسرے دن کا ہم شکل ہے۔ اگر تم فروری کے مہینے میں اس طرح پیدل چلتے ہو تو سارا منظر بہت اجڑا ہوا نظر آتا ہے۔ درختوں سے گرے ہوئے پتے قدموں کے نیچے آ جاتے ہیں۔ ان سے لاکھ بچنے کی کوشش کرنے پر بھی وہ ہر طرف

صاف صاف نظر آ جاتے ہیں۔ دوپہر کی تیز ہوا کے جھکڑوں میں اِدھر اُدھر اکٹھا ہو کر ڈھیر بناتے ہوئے۔ تم جدھر بھی جاؤ تمھارے بس میں کچھ بھی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ خشک اور وحشی ہوا کے جھکڑوں میں اپنے پھٹتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ان سوکھے پتوں کو دیکھتے رہو۔

فروری کا موسم دراصل کوئی موسم نہیں ہے۔ یہ ایک دن کی پرچھائیں کو لگاتار کئی دن دیکھتے رہنے جیسا ہے۔ یہ ہر موسم کا متضاد ہے۔ مماثلت کے اتنے مایوس کن پہلو ان دنوں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مگر یہ رات تھی جب دوپہر کی ہوا تھک کر گٹھری بنی کہیں سو رہی تھی۔ مگر پھر بھی رات کی اپنی ہوا تھی اور وہ چل رہی تھی۔

تاروں بھری رات میں ایک جگہ اس نے ریل کی پٹری کو پار کیا...... اچانک بجلی چلی گئی۔ بجلی کی آنکھ مچولیاں اس شہر میں عام تھیں۔ وہ ایک پل کو ٹھہرا، مگر نئے شہر سے پرانے شہر کا راستہ اسے زبانی یاد تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک سگریٹ سلگاؤں، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب اس نے قدرے پاؤں جما جما کر چلنا شروع کر دیا۔ سرمے والی گلی آ رہی ہے۔

یہ شہر جن تین باتوں کے لیے دور دور مشہور ہے ان میں سے ایک یہاں کا سرمہ ہے۔ خود یہاں کے لوگوں میں بھی سرمہ لگانے کا چلن جنون کی حد تک پایا جاتا ہے۔ سرمہ لگانے کے کچھ اوقات بھی مقرر ہیں۔ مثلاً رات کو سونے سے پہلے، یا پھر صبح کو اٹھنے پر۔ پہلی نظر میں گمان گزرتا ہے کہ جیسے یہاں کا ہر شخص ہر وقت سرمہ لگائے ہوئے گھومتا پھر رہا ہو۔ ویسے آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے لوگوں میں زیادہ تعداد یا تو بوڑھوں کی ہے یا پھر چھوٹے چھوٹے بچوں کی۔

بوڑھوں کے جھریوں بھرے بگڑے چہروں اور پوپلے منہ پر ان کی بے نور سکڑی ہوئی سلیٹی آنکھیں دیکھنے والوں کو وحشت زدہ کرتی ہیں۔ سرمہ لگانے سے ان کی آنکھوں کی مایوسی اور بے چارگی کسی مکھی کی طرح ٹھیک ان کے ناک کے بانسے پر آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایسے میں سرمہ لگی ہوئی اپنی موت کا انتظار کرتی دھواں بھری یہ بوڑھی آنکھیں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتیں کہ جن چیزوں پر لگی ہوئی ہیں انھیں اور بھی زیادہ مضحکہ خیز یا قابل رحم بنا دیں۔ شہر میں ایسے

بوڑھے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

پھر شیر خوار بچے ہیں۔ عورتوں کی گود میں لیٹے یا سوتے ان بچوں کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے ان شیر خوار بچوں کی آنکھوں میں دنیا کو نہ سمجھ پانے کا جذبہ پوری طرح عریاں ہو جاتا ہے۔ یہ حیرت اور کبھی کبھی خوف یا تکلیف کے باعث پھٹی پھٹی آنکھیں ہیں، اگر چہ کچھ لوگ انھیں خوب صورت آنکھوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جن کی خوب صورتی میں زیادہ اضافہ پتھر کے سرمے نے ہی کیا ہے۔

مگر سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ سرمے سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار یہاں کے زنخے بھی کرتے ہیں۔ عورتوں کا لباس پہنے یہ ہجڑے آنکھوں میں سرمہ لگائے اس شہر کی گلیوں میں فحش اور گندے اشارے کرتے ہوئے تقریباً ہر وقت مل سکتے ہیں۔ غلیظ اشارے کرتی ہوئی سرمہ لگی ہوئی دراصل ان کی یہ مردانہ آنکھیں ہی ہیں جو ان کی تمام بناوٹی نسوانیت کو مسخ کر کے انھیں انسان نہیں بلکہ اس کے سائے میں بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ تمھیں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ اگر وہ کہیں اکیلے میں تمھیں گھیر لیں تو اپنا سارا مال واسباب ان کے حوالے کرنا ہوگا، بلکہ کبھی کبھی تو اپنی مردانگی اور شجاعت بھی۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ ہجڑے سرمہ لگی بے حس آنکھوں سے تمھیں گھورتے ہوئے اور فحش حرکات کرتے ہوئے تمھارے سینے میں خنجر اتار دیں۔ یہ سب زنخے اپنے پاس بڑے بڑے چاقو رکھتے ہیں۔

سرمہ والی گلی سے پار ہو جانے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ افسردہ ہو رہا ہے۔ مگر کیوں۔ اس کی وجہ وہ نہ جان سکا۔ سوائے اس کے کہ اسے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ دراصل جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا وہ بہت کم تھا۔ وہ بس ایک سوانگ، ایک تماشے کی طرح تھا۔ بلکہ سوانگ تو کہیں اور ہو رہا تھا۔ یہ سوانگ کی بھی نقل تھی۔ صرف سوانگ بھرتے ہوئے کرداروں کی الٹی سیدھی پرچھائیاں چاروں طرف پڑ رہی تھیں۔ کسی سیاہ، نہ دکھائی دینے والے مادے نے، ایک وحشت ناک طاقت نے تمام کائنات کی اشیا کو نہ جانے کہاں سے کہاں دھکیل دیا تھا۔ زندگی اور موت کو بھی۔ بس صرف سائے رہ گئے تھے۔ یہاں وہاں

اٹکے ہوئے۔ اپنی حیثیت کو قابل رحم حد تک مضحکہ خیز بناتے ہوئے۔

پھر اصل زندگی کہاں تھی۔

اور اصل موت؟ موت کی پرچھائیں کا زاویہ کیا تھا۔ اور اس کے پڑنے کے امکان کہاں تھے؟ حالاں کہ موت نے اپنے آپ کو سات پردوں میں پوشیدہ کر رکھا تھا، پھر بھی اس کی چھوٹ کہیں تو پڑ رہی ہوگی چاہے وہ اس وسیع وعریض زمین پر ایک بونے جوکر کی پرچھائیں کی طرح ہی کیوں نہ ہو۔

وہ جس راستے سے گزر رہا تھا اس راستے میں پاگل خانہ نہیں پڑتا، نہ ہی اس کی اونچی، سیاہ مہیب دیوار ہی نظر آتی ہے۔ اس نے سوچا، اس شہر کے مشہور ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہاں کا پاگل خانہ ہے۔ اس پاگل خانہ کی دیوار کے ایک حصے کا سایہ قبرستان میں پڑتا ہے۔ جب کبھی رات گئے کوئی جنازہ گیس کی لالٹینوں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہوتا ہے تو پاگل خانے کی دیوار کا یہ حصہ روشن ہو جاتا ہے۔ اور جنازے اور اس کے ساتھ آئے ہوئے افراد کے سائے اس پر عجیب انداز سے پڑتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔

پاگل خانے کے ایک طرف کی دیوار دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ اکثر یہاں قتل کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں یا لاوارث لاشیں یہاں پھینک دی گئی ہیں، کچھ اس طرح کہ وہ دلدل اور پاگل خانے کی دیوار کے درمیان ہی پھنس کر رہ گئی ہیں۔ پاگل خانے کی دیوار کے اس طرف والی دلدل کو بھی ہٹایا نہ جا سکا۔

مگر اب پتہ نہیں وہاں کیا کیا بدل گیا ہوگا، اس نے سوچا۔ نہ جانے اس کی دیوار کے سائے کہاں پڑے ہوں گے؟ مگر یہ بھی تو وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پڑ ہی رہے ہوں گے۔ اس نے مایوسی کے ساتھ سوچا۔

اسے اپنے بچپن کا وہ ساتھی بے تحاشا یاد آنے لگا۔

وہ دونوں قلعے کی ندی میں امام حسین کی فاتحہ کی فیرنی کے خالی مٹی کے پیالے بہانے گئے تھے۔ جہاں کنارے پر پہنچ کر انھوں نے پانی کے پیالے بہائے تھے۔ وہاں ایک بڑا سا

پاکڑ کا درخت تھا، جس کا سایہ اجلے پانی کو بے وجہ کالا بنائے دے رہا تھا۔

جب وہ پیالے بہا کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک جگہ سبیل اتاری جا رہی تھی، سبیل جو محرم کے جلوس کے لیے لگائی گئی تھی۔ وہ ایک جھالر کے نیچے سے اترے۔ اچانک جھالر کی رسی جھول کر اس کے ساتھی کے گلے میں پھنس گئی۔ وہ زمین پر جا گرا اور پھر سخت پتھریلی سڑک پر دور تک رگڑتا اور گھسٹتا ہوا چلا گیا۔ کسی معجزے نے اسے بچا لیا تھا۔ "محرم سے لے کر چہلم تک بڑی سختی کے دن ہوتے ہیں۔" امی کہا کرتی تھیں۔

جوان ہو کر اس کے ساتھی کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی، پھر خود کو بھی ختم کرنا چاہا۔ کہتے تھے کہ وہ رات میں اکثر اپنی بیوی کے سائے کو باہر جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔

اب وہ نہ جانے کتنے برس سے اس پاگل خانے کی اسے مہیب دیوار کے پیچھے ہے۔ وہی دیوار جس کا سایہ نہ جانے کہاں پڑ رہا ہوگا۔

بے اختیار اسے راستے میں پاگل خانے کے نہ پڑنے کا افسوس ہوا۔

شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے اس نے بھی چھچھورے پن کا ثبوت دیتے ہوئے گلے میں ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اب اچانک اس کی گرہ سے اسے اپنا دم سا گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

بجلی آ گئی۔ سڑکیں پھر روشن ہو گئیں۔ اکا دکا لوگ اپنے ہاتھوں میں بکروں کی رسیاں تھامے گذر رہے تھے۔

کل بقرعید ہے۔ اسے یاد آیا تھا۔ اسے پتہ نہیں کیا کیا یاد تھا گذرے ہوئے وقت کو بے تکے بچکانہ منظروں میں یاد رکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اس میں کسی قسم کے تاریخی شعور کی کار فرمائی رتی برابر بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے سے شہر کے مشہور ہونے کی تیسری اور آخری وجہ یہاں کی محرم داری ہے جو انوکھی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد معنی خیز بھی تھی۔ جیسا کہ اس نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اس شہر میں دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ یا صرف ایک ہی دیوار تھی اور جگہ جگہ اس کے سائے پڑتے تھے

جب محرم کی نو تاریخ آتی ہے تو دیواروں سے ٹکا ٹکا کر تعزیئے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ ان تعزیوں کو یہاں "تخت" کہا جاتا ہے۔ یہ تخت دراصل لکڑی کی بنائی ہوئی شہدائے کربلا کی قبریں یا ضریحیں ہیں۔ ان تختوں کو ماتمی باجوں کے ساتھ جلوس کی شکل میں یا تو کندھوں پر اٹھا کر یا بڑے بڑے ٹھیلوں پر رکھ کر سارے شہر میں گشت کرایا جاتا ہے۔ یہ تخت ہار پھولوں سے سجے ہوتے ہیں۔ گشت کے وقت ماتمی باجوں کے درمیان "دولھا۔ دولھا" کا نعرہ بھی سنائی دیتا ہے۔ یہ تخت زیادہ تر شہر کے غریب اور کاریگروں کے نچلے طبقے نے تیار کیے ہیں۔ اور انھیں کے نام سے مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر "بڑھیوں کا تخت"؛ "راجوں کا تخت"؛ "بہشتیوں کا تخت"؛ "دھوبیوں کا تخت"، اور جوگیوں کا تخت"، وغیرہ وغیرہ۔

ان تختوں کی اقلیدس میں مقبرے کے سے گنبد اور محراب کا سا تاثر تو مشترک ہے، لیکن بعض خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے اپنے پیشے اور طبقے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ان کی اپنی کاری گری اور اپنا اپنا نقشہ ہے جس میں ان کے اپنے طبقاتی ہنر کی پوری پوری جھلک نظر آتی ہے۔ یہی ان تختوں کا انفرادی پہلو ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اگر ایک بار کوئی عقیدت کے ساتھ تخت بنا کر اٹھتا ہے تو پھر ہر سال محرم کی پہلی تاریخ سے لے کر آٹھ کے درمیان اسے تمام زندگی ایسا ہی کرنا پڑتا ہے وہ فاقے کر سکتے ہیں مگر ایک بار تخت اٹھا لینے کے بعد اس سلسلے کو روک نہیں سکتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر پھر سے تخت نہ اٹھایا جائے تو ان پر بھاری عذاب پڑ سکتا ہے۔

تخت سازی میں ایک قسم کا ارتقا بھی نظر آتا ہے۔ کوئی شخص بہت چھوٹی سی شکل یا ساخت کا تخت بنانا شروع کرتا ہے، پھر ہر سال محرم میں وہ اس کے جسم میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے اور تخت کی شان و شوکت بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح بعض تخت بہت لمبے چوڑے اونچے اور شان دار ہو گئے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ ایسے ہی ایک بہت اونچے اور پُر جلال تخت کا اوپری سرا اس نے اپنے گھر کی دیوار سے بھی اونچا نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہڈی والوں کا تخت تھا۔ یقیناً وہ سختی کے دن تھے۔ اسے چھوٹی چیچک نکل آئی تھی۔ وہ ہر وقت بخار میں جلتا ہوا، دور سے تختوں کے ساتھ بجنے والا نقارہ اور باجوں کا ماتم سنا کرتا تھا۔ وہ بار بار گھبرا کر امی سے پوچھا کرتا۔

''کیا تخت آ رہا ہے؟''

''نہیں۔ لیکن وہ آئے گا۔ 'ہڈی والوں' کا تخت ہمارے گھر کے سامنے ضرور آئے گا۔''

وہ مایوس ہو کر پھر سے دور بجتے ماتم کو سننے لگتا اور بُخار اس کے جسم کو شعلوں کی پرت میں لپیٹ لیتا۔

'ہڈی والے' اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں رہتے تھے۔ ان کا مکان دیکھنے میں خستہ حال تھا جس کے دروازے سے لے کر صحن تک سوکھی ہوئی ہڈیاں، شیشے کی بوتلیں، ٹین کے ڈبے، کاغذ کی ردی، کوڑا کرکٹ اور نہ جانے کیا کیا کباڑ اور الا بلا پھیلے رہتے تھے۔ ان کے گھر کے سامنے سے گزرنے پر ہمیشہ ناک پر کپڑا رکھنا پڑ جاتا تھا۔ مگر لوگ کہتے تھے کہ ان کے پاس بے شمار دولت ہے۔ کبھی کبھی ان کے دروازے کے سامنے ٹرک آ کر رکتا۔ اس میں ہڈیوں سے بھری بوریاں لادی جاتیں۔ اسے بچپن میں ہڈیوں سے بالکل دہشت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ بہت گھریلو قسم کی اشیا تھیں جنھیں وہ صبح سے شام تک اپنے دسترخوان پر پالتو بلیوں کے سامنے یا پھر کوڑے دان میں پڑے دیکھتا ہی رہتا تھا۔ لیکن ہڈیوں کے پنجر سے اسے ہمیشہ ہی دہشت محسوس ہوئی۔ اس امر کا علم تو اسے اب ہوا ہے کہ جب ہڈیوں کا پنجر چونا بن کر مٹی میں بدلتا جاتا ہے تو دہشت وہاں سے چپ چاپ اٹھ آتی ہے، اپنے مسکن کو چھوڑ کر۔ وہ اِدھر اُدھر بے وجہ بھٹکتی پھرتی ہے۔

مگر 'ہڈی والوں' کا تخت بہت شان دار تھا۔

اور پھر ایک دن وہ واقعی آیا۔ وہی لمبا، اونچا، پرشکوہ اور پرجلال تخت، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب بھی اٹھایا جاتا ہے تو شہر میں فساد پھیل جاتا ہے خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ محرم کی آٹھ تاریخ کو اس کی اوپری محراب کی لکڑی سے خون رسنے لگتا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے آسمان تک خون کی سرخی پھیل جاتی ہے۔

'ہڈی والوں' کا تخت اس کی گلی سے گزرنے لگا۔ آدھی رات تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس تخت کا باجا بہت زوردار ہوا کرتا تھا۔ اس کی ماتمی دھنوں اور نقاروں کی چوبوں سے زلزلہ آ گیا تھا۔ زمین اور آسمان جیسے ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''کیا تخت آ گیا؟'' اس نے چلا کر پوچھا۔

''ہاں تخت آ گیا، مگر تم اٹھنا نہیں۔ ورنہ بخار نہیں اترے گا۔

اور تب یوں ہی آنگن میں لیٹے لیٹے اس نے دیکھا۔

گیس کے ہنڈے سے گلی روشن ہو گئی تھی۔ تخت کا اوپری سرا اس کی دیوار سے اونچا نکلتا ہوا گذر رہا تھا۔ آگے آگے آسمان کو چھوتا ہوا ایک سرخ رنگ کا علم بھی چل رہا تھا۔ گیس کے ہنڈوں کی روشنی رینگ رہی تھی۔ اس روشنی کے رینگنے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کون سے سائے اس کے گھر کی دیوار اور چھت پر اتر آئے۔ پھر 'ہڈی والوں' کا تخت گلی سے دور چلا گیا۔ دور ہوتے ہوئے ماتمی باجوں کی دھنیں بھی سایوں میں بدل کر تحلیل ہو گئیں۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ بخار سے اس کا سَر گھومنے لگا۔ گلی تاریک پڑی تھی۔ آنگن میں پھر آدھی رات آ کر بیٹھ گئی۔

''چلو اب تو خاصی دور آ گیا۔'' اس نے چلتے چلتے خیال کیا۔

لیکن کیا اب محرم کے علاوہ سوچنے کو یا افسردہ ہونے کو کچھ باقی نہیں بچا؟

کل بقرعید بھی ہے۔ بقرعید اور محرم کے درمیان ایک زمانی ترتیب تو ہے ہی، لیکن کیا بقرعید کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا جا سکتا؟ اسے ایک پل کو احساسِ جرم ہوا اور اس نے اپنے ذہن میں سورہ بقر کے کچھ حصوں کو دہرانے کی ناکام سی کوشش شروع کر دی۔

مگر یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ بقرعید اور محرم میں اس کے لاشعور میں آخر مشترک کیا تھی؟

اب اگر وہ بہت زور ڈالے ذہن پر تو اتنا ضرور یاد آ جائے گا کہ وہ چیچک جو اس کے نکلی تھی تو وہ خاص بقرعید کے ایک دن پہلے ہی ظہور میں آئی تھی اور محرم کی تیرہ تاریخ کو اس نے غسل کیا تھا۔ حافظے کا بجھتا ہوا شعلہ اسی طرح تو اپنی روشنی آگے والے سالے کو سپرد کرتا ہے۔

یا پھر ایک اور واقعہ، جب وہ بقرعید کے موقعے پر گوشت لے کر کسی کے گھر جا رہا تھا۔ وہ جس سڑک سے گزر رہا تھا اس کے دونوں جانب دوسرے فرقے کے لوگ آباد ہیں۔ اچانک

پیچھے سے آتی ہوئی موٹر سائیکل نے اسے ٹکر مار دی۔ وہ سڑک پر چاروں شانے چت گر پڑا۔ سامنے کالی کے منہ پر گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ شام ہو رہی تھی۔ اخبار میں لپٹے ہوئے تازہ گوشت کی بوٹیاں پوری طرح سڑک پر پھیل گئیں۔ اس کے شانے اور پنڈلی سے بہتے ہوئے خون نے کولتار کی سڑک پر جم کر ایک بڑا سا کالا دھبہ بنالیا۔ پنڈلی پر گھٹنے کے نیچے سفید سفید ہڈی جھانک رہی تھی۔ خطرناک چوٹ تھی۔ محرم کا وہ پورا مہینہ بڑی سختی میں گزرا۔

''اور کیا ہوسکتا ہے؟'' اس نے پھر دماغ پر زور دیا۔

پھر تو بس خون کی ایک لکیر تھی جو ذہن ہی میں ابھرتی تھی۔ ایک لکیر جو بڑھ کر لمبی اور گاڑھی ہوتی جاتی تھی۔ ایک نالی۔ پھر ایک نہر کی طرح ...... آہستہ آہستہ سیاہی مائل ہوتی ہوئی ذہن سے باہر آ کر کہیں بالکل آس پاس کھو جاتی تھی۔ ایک دبے ہوئے احساسِ جرم کی طرح یا ایک کبھی نہ کیے جاسکنے والے ماتم کی طرح۔

وہ یوں ہی سر جھکائے چلتا رہا۔

تو کل بقرعید بھی ہوجائے گی۔ پھر محرم آئے گا۔

اس کے گھر کے دروازے کے باہر بھی دو بکرے بندھے ہوئے ہیں۔ گھر میں دو خونخوار قسم کے جرمن شیپرڈ السیشن کتے بھی موجود ہیں۔ رات گئے جب بکروں کو دروازے کے اندر لا کر دونوں طرف سے کواڑ بند کیے جاتے ہیں تو یہ کتے آنگن میں آزاد کردیئے جاتے ہیں۔

اس کے برابر سے دو راہ گیر دنیا کے تازہ ترین نامساعد حالات پر سیاسی تبصرہ کرتے ہوئے گزر گئے۔

'' تو بکرے باندھے جارہے ہیں اور کتے کھولے جارہے ہیں۔'' اس نے پرمعنی انداز میں سوچنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اسے اس انداز میں سوچنے کا کبھی سلیقہ ہی نہیں رہا۔

کل نالیوں میں خون بہے گا۔ مگر صبح کے وقت قربانی کے جانور کو خوب نہلایا دھلایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی آنکھوں میں سرمہ بھی لگادیا جاتا ہے۔ ماتھے پر مہندی سجائی جاتی ہے۔ اور گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار ڈال دیا جاتا ہے۔ اس وقت وہ بالکل ایک سجے سجائے، شادی

کے لیے جاتے ہوئے دولھا کی طرح نظر آتا ہے۔ اس کے گلے میں سخت، سیاہ اور موٹی سی رسی بھی لٹکنے لگتی ہے۔ تب بچے اسے گرم گرم جلیبی کھلاتے ہیں۔

کتے کہیں بکروں پر بھونک نہ رہے ہوں اسے اندیشہ ہوا۔ قربانی کے جانور کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خوں خوار کتوں کے بھونکنے سے بکروں کا نازک اور معصوم دل دہل کر رہ جائے۔ ورنہ بڑا عذاب پڑے گا۔ اصل میں ان چیزوں کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

کل نالیوں میں خون بہے گا۔ خون کا تعلق کائنات کے ہر واقعے، ہر شے سے ہے، اگرچہ ایثار اور قربانی کائنات کو الوداع کہہ چکے ہیں مگر ان کی پرچھائیاں یہیں ساکت وجامد ٹھہر گئی ہیں اور خون کی لکیر ان سے رستی ہی رہتی ہے۔

خون کا تعلق محرم سے ہے۔

وہ بچپن میں محرم کی نو تاریخ کو شہر کی گلیوں میں تخت دیکھنے کے لیے بڑے چچا کی انگلی تھامے بھٹکا کرتا تھا۔

کتنی دیواریں تھیں اس شہر میں۔ یا شاید ایک ہی دیوار تھی جس کا سایہ کبھی یہاں کبھی وہاں پڑتا رہتا تھا۔

دیواروں کے ان سایوں سے سجے سجائے افسردہ تخت لگے کھڑے تھے۔ دیواروں کے ان سایوں سے پیاس ابھرتی تھی اور ریت گرتی تھی۔ اسے ہمیشہ ان دیواروں کی تلاش رہی جن کے یہ سائے تھے۔

اس کے آبائی مکان کی چھت پر ایک ہلتی ہوئی خستہ حال کنکریا اینٹوں کی چار دیواری تھی۔ اس چہار دیواری پر اچک کر دیکھنے پر دور سامنے کھیت نظر آتے تھے۔ وہاں ایک کنواں تھا جس کی منڈیر اپلے ہی اپلے پٹے پڑے تھے۔ کنواں نہ جانے کب سے پانی سے خالی تھا۔ اس میں اب صرف مرے ہوئے لاوارث کتے اور بلیوں کی لاشیں یا ان کے پنجر ہی تھے۔

اسے یاد نہیں کہ کنویں کے سامنے سے جو ایک تخت اٹھایا جاتا تھا اس کا نام کیا تھا۔ چھوٹا سا تخت تھا۔ اس تخت کے ساتھ صرف ایک شخص ماتمی باجا بجاتے ہوئے چلتا تھا، کچھ گیس کے

ہنڈے تھے۔ باجے کی ماتمی آوازیں ہوا کے دوش پر اس کی چھت کی چہار دیواری سے ٹکراتی تھیں۔ لیکن اسے جو اچھی طرح یاد رہ گیا ہے وہ تخت کے پیچھے بلکہ گیس کے ہنڈے کے بھی پیچھے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ایک بوڑھا خوانچے والا تھا۔ وہ خوانچے والا، اپنے تھال کو کاندھے پر اٹھائے روشنی کے پیچھے چلتا تھا۔ اس کے خوانچے پر مٹی کے تیل کی ایک ڈبیہ ٹمٹماتی رہتی تھی۔ وہ کیا بیچتا تھا اب یہ اسے بالکل یاد نہیں۔

جب وہ تھوڑا اور بڑا ہو گیا تو دن میں کنویں کے پاس تخت دیکھنے جانے لگا تھا۔ اپلوں کے اسی ڈھیر والے کنویں کے پاس ہی رشن باجی کا مکان تھا۔ رشن باجی کے مکان میں کھجور کا ایک درخت تھا۔ کھجور کے درخت کے پتوں پر الٹے پیروں والی ایک چڑیل رہتی تھی۔ رشن باجی پر اس چڑیل کا سایہ ہو گیا تھا۔ ان کے جسم سے خون غائب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پیلی پڑتی جا رہی تھیں۔ ایک بار جب وہ کنویں کے پاس کھڑا تخت دیکھ رہا تھا تو رشن باجی نے اسے گھر میں بلا لیا۔

مٹی کے چولھے میں اپلے سلگ رہے تھے۔ میلی سی المونیم کی پتیلی میں چائے کھول رہی تھی۔ وہ روشن باجی کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اسے عجیب نظروں سے گھور رہی تھیں۔

''تو بہت نیک لڑکا ہے۔'' انھوں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، پھر جھک کر اس کا گال کاٹ لیا۔

وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگا تھا۔ کھجور کے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر ایک پائل بجے جا رہی تھی۔ چھم چھم، چھم چھم۔

تخت کے باجے نے اسے اور بدحواس کیا۔

رشن باجی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ پیلی ہو کر مر گئیں تھیں۔ وہ ان سے پھر کبھی نہیں ملا تھا۔ ان کی موت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ بس مرنے سے پہلے ان کا فون آیا تھا۔

''آنا کبھی گھر آنا۔'' ایک ادھیڑ عمر کی آواز نے کہا تھا۔

رشن باجی کے یہاں فون لگ گیا تھا۔ اور کھجور کا درخت کاٹ دیا گیا تھا۔

''چھم چھم، چھم چھم''

اچانک بجلی پھر گل ہو گئی۔ آس پاس بالکل اندھیرا ہو گیا۔ مگر وہ رکا نہیں۔ سر پر تاروں بھری رات تھی۔ اس نے اب خود کو زیادہ اور زیادہ اداس محسوس کیا۔ اداسی نشے کی طرح بڑھ رہی تھی۔ اب اسے اور بہت کچھ یاد آتا جائے گا۔

وہ بھی تو شاید محرم کے ہی دن تھے جب اس نے معمول سے کچھ زیادہ لمبی اور دبلی پتلی لڑکی کو سنہری جلد والی ایک کتاب تحفتاً پیش کی تھی۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر اس نے اپنے خون سے نام لکھا تھا۔

''پھر وہی خون۔'' اس نے تاسف کے ساتھ سوچا۔

مگر وہ ایک نیک خون تھا۔ ساتھ ہی بچکانہ بھی۔

''تم بہت نیک انسان ہو کتاب پر خون سے لکھے ہوئے اپنے نام کو پڑھتے ہوئے وہ زور سے ہنس کر بولی۔

وہ لمبی اور دبلی پتلی لڑکی...... بہت زور زور سے ہنستی تھی اور ہر بات پر ہنستی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی محلے کے لوگ نہ جانے کیوں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اسے اکثر بتایا کرتی تھی کہ وہ تقریباً ہر رات ایک خواب دیکھتی تھی جس میں اس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ ہوتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ جاگنے پر اس کی گود اور دونوں ہاتھ بے حد گرم ہوتے تھے، جیسے ابھی ابھی ان ہاتھوں نے کسی بچے کو خود سے الگ کیا ہو۔

وہ اسے اکثر یہ بتاتی کہ اگر اس کے بچہ پیدا ہوا تو وہ اسے امام حسین کی منت کا فقیر بنادے گی۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگتی تھی۔

اس لمبی لڑکی کو اس نے ہمیشہ زرق برق کپڑوں میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہاتھوں میں بھر کر ہری چوڑیاں پہنتی تھی۔ اس کے کانوں میں ہمیشہ بڑے بڑے آویزے ہوتے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی عورت کو اتنے بڑے آویزے پہنے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا

کہ ان زرق برق کپڑوں کے نیچے دبلی پتلی کمزور ہڈیاں، پسلیاں، قابلِ رحم حد تک بے تکی شگاف زدہ ناک اور ماتا کے دودھ اترنے کے انتظار میں کھردرے شہوانی ہاتھوں سے خود کو نچوڑتے ہوئے تل تل بوڑھے ہوتے ہوئے پستان تھے۔

وہ بہت نیک تھا مگر انفرادی نیکی سے کیا ہوتا ہے؟ انفرادی طور سے تو ایک شیطان، ایک بھوت بھی نیک ہوسکتا ہے۔ ایک بھوت کی خود تشفی سے مالا مال نیکی دنیا کو کیسے بدل سکتی تھی؟

اور ایک دن اس نے اس سنہری جلد والی کتاب کو، جس پر نیک خون سے اس کا نام لکھا تھا، اُٹھا کر سینے سے لگایا اور بڑی خاموشی کے ساتھ (خاموشی؟ کیوں کہ وہ ہنس رہی تھی) کسی اَن جانے کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہری ہری چوڑیوں سے بھرے پتلے پتلے ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ جو ایک خواب سے جاگنے پر ہمیشہ گرم رہتے تھے اور وہ تمام عمر نہ دیوار کو تلاش کر سکا نہ اس پر پڑنے والے، لمبی لڑکی کے سائے کو۔

تو وہ یہ سب کچھ سوچ ہی کیوں رہا تھا؟ شاید وہ اور زیادہ اداس ہونا چاہتا تھا۔ شاید وہ اور زیادہ نیک بننا چاہتا تھا۔ نیکی اور اداسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

لہٰذا وہ اور اداس ہوتے ہوئے آگے چلا۔

سامنے سے سڑک گھومتی تھی۔ اسے اس سمت جانا تھا۔ لاش گھر کی دیوار سے لگے لگے آگے بڑھنا تھا۔ یہاں پر پوسٹ مارٹم کے لیے مُردے لائے جاتے تھے ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جن کا کسی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ یہاں کوئی رو یا سسک نہیں رہا تھا۔ یہ رونے سسکنے یا بین کرنے کے دونوں کناروں کے بیچ کی جگہ تھی۔ بنجر، سوکھی اور غم کے ہر امکان سے خالی۔

موت کبھی کبھی سرک کر ایک جگہ کچھ زیادہ اکٹھا ہو جاتی ہے۔ موت کا حجم وہاں کچھ زیادہ بھاری اور نمایاں تھا۔

اسے لاش گھر کی دیوار کچھ سامنے کو جھکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ سگریٹ سلگائے، لیکن اچانک بجلی چلی آگئی اور اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، ایک بار پھر۔

اسے تو ابھی محرم کے بارے میں سوچنا تھا۔ اس شہر کی محرم داری بڑی انوکھی ہوتی ہے۔ وہ بچپن میں محرم کی نو تاریخ کو رات میں بڑے چچا کی انگلی تھامے، شہر کی گلیوں میں تخت دیکھنے کے لیے بھٹکا کرتا تھا۔

دیواروں کے ساتھ ٹکا کر تخت کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ اب شہر میں ان کا گشت نہیں ہوگا۔ کل یومِ عاشورہ کو دوپہر میں انھیں سفید چادر میں لپیٹ کر، کاندھوں پر یا ٹھیلوں پر اٹھا کر شہر سے دور قلعے کی ندی کے کنارے کربلا کے میدان میں لے جایا جائے گا۔ یہ میدان دراصل کربلائے معلّٰی کی ڈمی ہے جسے یہاں کے لوگوں نے اپنی عقیدت کے مطابق بے حد تندہی، لگن اور زندہ تخیل کے ساتھ تیار کیا ہے۔ سفید چادر سے ڈھک کر کربلا کے میدان میں لے جائے جاتے ان تختوں کے ساتھ اب کوئی ماتمی باجا نہیں ہے۔

مگر یہ نو تاریخ ہے۔

شہر کی گلیوں، چوراہوں پر تخت سجے کھڑے ہیں۔ ان کے چاروں طرف بجلی کے بے شمار قمقمے روشن ہیں۔ جگہ جگہ پانی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ہر تخت کے برابر ایک سبیل لگی ہے۔ بلّیوں سے ایک اونچی مچان بنا کر اس پر ہری گھاس اور ہری پتیاں بچھا دی گئی ہیں۔ اس مچان پر بیٹھ کر دو تین شخص آنے جانے والے بے شمار لوگوں کو دودھ کا شربت تقسیم کر رہے ہیں۔ لوگوں کی ایک بھیڑ، ایک ریلا آتا ہے، بڑی عقیدت کے ساتھ تخت کا نظارہ کرتا ہے۔ شربت پیتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ کسی دوسرے تخت کو دیکھنے کے لیے دوسری گلی میں۔

مگر شہر کی وہ گلیاں سنسان ہیں جن میں کوئی تخت نہیں ہے۔ اگرچہ ان گلیوں میں بھی کبھی کبھی اتفاق سے کسی گھر کی چوکھٹ پر ایک چھوٹا سا تخت رکھا ہوا مل جاتا ہے۔ ہلکے سے مٹیالے بلب یا موم بتی کی روشنی میں کوئی کمزور، بوڑھا غریب آدمی اپنے چھوٹے سے معمولی تخت کے پاس بیٹھا تھکی تھکی نظروں سے گلی کے موڑ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دھندلی مٹیالی روشنی میں اس کا ہیولیٰ کانپتا نظر آتا ہے۔ نہیں یہاں کوئی سبیل نہیں ہے۔

تمام رات ان تختوں پر اگربتی سلگا کر حلوے پر نیاز دی جاتی ہے۔ مدھم آواز میں

شہدائے کربلا کے مرثیے پڑھے جا رہے ہوتے۔ مگر ایک بات جو وہ شدت سے محسوس کرتا وہ یہ تھی کہ کسی کسی تخت پر تو بے حد رونق ہوتی اور کہیں بہت ویرانی۔ وہ اس ویرانی سے گھبرا کر بڑے چچا کا ہاتھ زور سے پکڑ لیتا۔

یہ پورا شہر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ نیا شہر اور پرانا شہر۔ پرانے شہر میں کنکریاں اینٹوں کی بے شمار پرانی حویلیاں تھیں۔ اگر مدھم روشنی ہوتی تو ان حویلیوں کے سال خوردہ برجوں کے سائے ڈراؤنے انداز میں زمین پر پڑا کرتے۔ وہ ان سایوں کو سمجھ نہ پاتا اور خوف زدہ ہو کر راستے میں ہی رُک جاتا۔

یہ کیسی پرچھائیں ہے؟ اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

دور سڑک پر ہاتھی کی سونڈ کی طرح کچھ ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ ...... وہ جلی کوٹھی کا ادھ جلا مینار ہے۔ ہم ادھر ہی تو جا رہے ہیں۔ جلی کوٹھی کی دیوار کے پیچھے۔ وہاں ایک تخت ہے۔'' بڑے چچا نے جواب دیا۔

''نہیں ...... ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔'' اس نے ان کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا۔

''ڈر؟ پرچھائیوں سے کیا ڈرنا'' وہ ہنسے۔

تب تو نہیں لیکن اب اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے سوچا۔

ہاں۔ واقعی پرچھائیوں سے کیا ڈرنا۔ اور اگر وہ ان اشیا کی ہوں جن کا سراغ پانا بھی ناممکن ہو تو یہ ڈر اور بھی بے معنی اور بے تکا قرار دیا جا سکتا ہے۔

وہ ساری رات ایسے ہی گھومتے۔ وہ لوگ عجیب تھے۔ وہ تخت کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے پھر آگے بڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے مدھم آواز میں مرثیے گونجتے رہتے۔ عود و لوبان سلگتے رہتے۔ مگر تخت اور مرثیے کہیں اور بھی تھے۔

وہ چلتے چلتے تھک جاتا اس کے پیر درد کرنے لگتے۔

''اب چلو۔ بہت تخت دیکھ لیے۔'' وہ اکتا کر کہتا۔ چاروں طرف خون سا رستا۔

''بس؟ کیا تھک گئے۔ ابھی بجا ہی کیا ہے۔ رات باقی ہے۔'' بڑے چچا بچکانی خوشی

کے ساتھ جواب دیتے۔

''چلو۔ چلو۔ آگے بڑھو۔ وہ ادھر روشنی نظر آ رہی ہے۔ یہاں بہت مجمع ہے۔''

''وہ راجوں کا تخت ہے۔ اس کی کاری گری اور نفاست دیکھنے لائق ہے۔''

بڑے چچا راجوں کے تخت کے بہت شیدائی تھے۔ اس تخت میں بے شمار لکڑی کی دیواریں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ اور نہ جانے کتنی کھڑکیاں تھیں جو ایک کے بعد ایک آپ سے آپ کھلتی جاتی تھیں۔ لوگوں کا ایک جم غفیر انھیں دیکھنے کے لیے موجود رہتا تھا۔ مگر افسوس کہ عود ولوبان کے دھوئیں اور مرثیوں کی گونج میں لاکھ اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کرنے پر بھی وہ اس تخت کی صرف دیواریں دیکھ سکا۔ محض دیواریں، کوئی کھڑکی اسے نظر نہ آ سکی۔

یہ وہ کہاں آ گیا چلتے چلتے؟ یہ شاید وہی جگہ ہے جہاں وہ نو تاریخ کو بڑے چچا کے ساتھ بڑی دیر رکا رہا تھا۔ یہاں آس پاس ہی کوئی تخت تھا۔

اسے یاد آیا، برقعہ پوش لڑکیوں کا ایک غول ادھر سے گزرا تھا۔ بڑے چچا ادھر ہی اچک کر دیکھ رہے تھے۔ اور تب اس نے دیکھا۔

ایک نقاب الٹی اور دو بڑی بڑی مغموم آنکھیں بڑے چچا کی طرف محبت اور حسرت سے دیکھنے لگیں۔

اس نے بڑے چچا کی طرف دیکھا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو ان مغموم آنکھوں کی حسرت اور محبت کا جواب ہرگز نہ تھیں۔ اس مسکراہٹ کی ایک کنارے پر بے حسی اور دوسرے پر شاید مکاری تھی۔

اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے بعد پرانی حویلیوں کے مہیب سایوں نے سب کچھ ڈھک لیا۔

''گھر چلو۔ اب گھر چلو۔ بہت تخت دیکھ لیے۔'' وہ پورا چہرہ اٹھا کر روہانسی آواز میں بولا۔

''ارے تمھیں نیند آ رہی ہے؟ آج تو گھومنے کی رات ہے۔ پاگل تم سو رہے ہو۔''

اسے چپچپا سا پسینا آ رہا تھا۔ نیند ادھر اُدھر بھٹکتی ہوئی جسم میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔

ہمیشہ کی طرح وہ پھر ڈرنے لگا۔ چاروں طرف سائے ہی سائے خون کی طرح بہہ رہے تھے اور پھر ایک واضح ڈر تو اس خوفناک بوڑھے کا بھی تھا۔

چلتے چلتے اسے خیال آیا کہ بہت دیر سے بجلی نہیں گئی۔ وہ اب پرانے شہر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ پہلے سے زیادہ سرشار۔ پہلے سے زیادہ اداس۔

مگر ابھی محرم میں بہت کچھ تھا۔

ایک تخت والی گلی سے دوسرے تخت والی گلی تک پیک بے تحاشا بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لیے بھیڑ پھٹ کر راستہ چھوڑ دیتی ہے۔ وہ سبز لباس پہنے ہوئے ہیں۔ سارے بدن پر گھنٹیاں بندھی ہیں۔ رات کے سناٹے میں ان کے جاں بازی سے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی بارعب آوازیں اور گونجتی ہوئی گھنٹیاں سن کر وہ سوتے سے جاگ اُٹھتا تھا۔

''یہ کون بھاگتا جاتا ہے؟'' وہ سراسیمہ ہوکر پوچھتا۔

''ایسے نہیں بولتے۔ یہ امام حسین کے قاصد یعنی پیک ہیں'' امی جو کچھ باتیں بتاتیں وہ اسے سمجھ نہ پاتا۔

مگر نہ سمجھ پانے کے لیے دوسری باتیں بھی تھیں۔

محرم کے دنوں اس کے گھر کبھی کبھی محلے کا کوئی بچہ منت کا فقیر بن کر آجایا کرتا۔ اس کا پورا لباس سبز رنگ کا اور درویشوں جیسا ہوا کرتا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لکڑی ہوتی جس پر ایک خوب صورت سی کڑہی ہوئی پوٹلی بندھی رہتی۔ بچے کے گلے میں کلاوہ اور آنکھوں میں موٹا موٹا سرمہ لگا رہتا۔

''میں بھی فقیر بنوں گا۔'' وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہتا۔

''یہ منت کے فقیر ہیں۔ ہر کوئی نہیں بن سکتا۔''

''منت کے فقیر کیا؟''

''جن کا کوئی بچہ جی نہیں پاتا وہ یہ منت مانتے ہیں کہ اگر ان کے بچہ پیدا ہوا تو وہ اسے امام حسین کا فقیر بنا دیں گے۔''

امی پھر سمجھانے کی کوشش کرتیں اور وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہ سمجھ پاتا۔

منت کا فقیر بنا ہوا بچہ اسے ٹکر ٹکر مسکرا دیکھتا رہتا۔ کچھ کچھ پراسرار انداز میں۔ یہ بات وہ اب سمجھ سکتا ہے کہ منت کے فقیر بچے کی مسکراہٹ اس کی اکیلی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس مسکرہٹ میں ان تمام بچوں کی مسکراہٹ کا کرب بھی شامل تھا۔ جو اس سے پہلے یا تو جی نہ سکے یا صرف خون کا لوتھڑا بن کر کہیں گم ہو گئے۔ اس مسکراہٹ میں ان ہری چوڑیوں کی اداس کھنک شامل تھی جن کے ہاتھ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈے ہو گئے۔

منت کا فقیر نہ بن پانے کا قلق اسے ہمیشہ رہا۔

تو اس شہر کی محرم داری واقعی انوکھی تھی۔ اس نے سوچا۔

اسے بس ایک بات کا افسوس رہا۔ جب تک لڑکپن رہا وہ پابندی سے محرم کی نو تاریخ کو تمام رات بھٹکتا رہا۔ تھکا تھکا اور خوف زدہ ہی سہی مگر اسے کبھی وہ منظر دیکھنے کو نہیں مل سکا۔

وہ منظر جسے شہر کے لوگ بڑے جوش اور وثوق کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ نو تاریخ کو فجر کے وقت پو پھٹنے سے پہلے ایک اور ناقابل فہم واقعہ پیش آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تخت پر ایک سایہ سا آکر ٹھہرا اور گذر گیا۔ بالکل ایک بادل کی طرح۔ اس ایک پل میں آس پاس کی تمام روشنی اچانک زرد اور کم زور پڑ جاتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر صاف نظر آتا ہے کہ تخت کی اوپری محراب کچھ جھک گئی ہے۔ تخت کے برابر ایستادہ علم کے پنجے پر خون کا ایک چھینٹا سا نظر آتا ہے پھر غائب ہو جاتا ہے۔

لیکن عین ممکن ہے کہ اس کی نظریں اس منظر سے ہمیشہ چوک گئی ہوں۔ اسے اپنی نظروں پر زیادہ بھروسہ کبھی نہیں رہا۔

مگر ایک بار تو عجیب بات ہوئی تھی۔ اور وہ محرم کے دن ہرگز نہیں تھے۔ اسے خوب یاد ہے کہ وہ جون کی لو بھری تپتی دوپہر تھی۔ جب اس نے دور کہیں تختوں کے اٹھنے کی آواز سنی۔

ماتمی باجا بج رہا تھا۔

امی گھبرا گئیں۔ ''یا خدا خیر۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

ابا نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تمھیں خبر نہیں۔ شہر میں وبا پھیل گئی ہے۔''

لو کا ایک زبردست تھپیڑا آیا اور اس نے دالان میں پڑی چق کو اڑا کر رکھ دیا۔

''کیسی وبا؟'' امی کا چہرہ فق تھا۔

''اب نام کیا لوں۔ وہی بچوں والی بیماری۔ اب تک سینکڑوں بچے مر چکے ہیں۔''

باہر لو کے تھپیڑوں میں ماتمی باجا پورے زور سے بجتا ہوا آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔
کہیں مصیبت یا وبا کے دنوں میں بھی مجبور ہو کر تخت اٹھایا جاتا ہے۔ ماتم کیا جاتا ہے۔ امام باڑے کھل جاتے ہیں اور شہدائے کربلا سے دعا مانگی جاتی ہے۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ وبا کبھی کبھی انسانی بھیس بدل کر بھی شہر میں بھٹکتی ہے۔ بچوں کو اٹھالے جاتی ہے۔ وہ خوفناک بوڑھا کون تھا؟ اس نے سوچا۔ عینک لگائے، لنگڑاتا ہوا، پل پل تعاقب کرتا ہوا، جگہ جگہ سے سامنے آتا ہوا وہ خوفناک بوڑھا۔

اس چھوٹے سے قد والے فقیر کا تمام ہی سراپا بے حد مہیب تھا۔ اس کے سارے جسم پر رگیں ہی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ عینک لگاتا تھا جس کے دونوں شیشے موٹے موٹے دھاگوں کے ذریعے کانوں سے باندھ لیے گئے تھے۔ ایک اونچا سا تہہ بند باندھے لکڑی کی کھڑاؤں پہنے، ہاتھ میں کٹورا لیے وہ ہر گلی میں گھومتا ہوا مل جایا کرتا تھا۔ کسی عفریت کی طرح۔

شدت کے ساتھ جھانوے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کے باعث بے حد سرخ سرخ پیر کھڑاؤں میں سے جھانکتے ہوئے کریہہ نظر آتے تھے۔ محلے کے بچے اس سے خوف بھی کھاتے تھے اور موقع دیکھ کر چڑھاتے بھی تھے۔ جب وہ بھیک مانگنے نکل رہا ہوتا تو کچھ بڑی عمر کے بچے اس کے پیچھے آتے اور زور سے تان لگاتے۔

''حمیدن کے گھوڑے کی ٹاپ گم گئی۔''

وہ اچانک بے حد تیزی کے ساتھ مڑتا۔ ہاتھ میں اینٹ کا ایک ٹکڑا دبائے وہ بپھرے ہوئے گھوڑے کی طرح بچوں کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا۔ اس کی کھڑاؤں کی بھیانک کھٹ کھٹ سارے محلے کو خبردار کر دیتی۔ اس کے ہونٹ مڑ کر سور کی تھوتھنی جیسے ہو جاتے جن سے سفید جھاگ اڑا کرتے۔ سامنے کے دو دانت خطرناک انداز میں باہر نکل آتے۔ اپنی نسوانی سی باریک آواز میں وہ گندی گندی گالیاں بکتا۔

یہ بہت خوفناک منظر ہوتا جسے اس کی یہ پر اسرار ہڈیوں کو گلا دینے والی باریک نسوانی آواز اور بھی نمایاں کر دیتی۔

بقر عید کے موقع پر وہ خوفناک فقیر اس کے گھر پیالہ لے کر گوشت مانگنے آجاتا۔ ان دنوں اس کے یہاں قربانی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی اسے آگے بڑھنے کو کہتا تو وہ ڈھیٹ پن کے ساتھ چوکھٹ پر بیٹھ جایا کرتا اور کریہہ انداز میں مسکرا مسکرا کر عورت کی سی آواز میں نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہتا۔

تب محلے میں دور کوئی آواز لگاتا۔

''حمیدن کے گھوڑے کی ٹاپ گم گئی۔''

وہ اچانک وحشی گھوڑے کی طرح آواز کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے لگتا۔ تہہ بند کے نیفے میں اڑسے ہوئے ٹکڑے کو ہاتھ میں دبا لیتا۔ اس کی کھڑاؤں کی بھدی آواز وبا کی طرح گلی میں دور تک پھیلتی جاتی۔

اس فقیر کے بارے میں مشہور تھا کہ بہت بدکردار اور پر اسرار شخص تھا۔ ایک خطرناک بات یہ بھی تھی کہ وہ اپنی چڑ بنانے والے کو ہمیشہ یاد رکھتا اور کبھی کبھی خاموشی سے اس کا تعاقب کرتا۔ وہ دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے میلوں تک جاتا۔ ایسے وقت اس کی کھڑاؤں بالکل گونگی ہو جاتی۔ اینٹ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دبا رہتا۔

یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ کہ اس کی اس چڑ کا آخر راز کیا تھا۔

ایک بار نہ جانے کیوں اس فقیر نے اس کی شکل بھی ذہن میں بھر لی۔ حالاں کہ وہ اس کی

چڑ بنانے کی کبھی ہمت ہی نہ کر سکا تھا۔ مگر اس کے ساتھ اکثر اس قسم کی نا قابل فہم باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسے اس پر کوئی حیرت نہیں ہے۔

ان دنوں بچپن میں وہ بے حد شوق سے شام کا دودھ لینے بھینسوں کی ڈیری میں جایا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک شام جب وہ دودھ لینے گھر سے نکلا تو فقیر اس کے پیچھے لگ گیا۔ اپنی کھڑاؤں کو گونگا کر کے، ہاتھ میں اینٹ کا ٹکڑا دبائے، کریہہ شیطان کی طرح۔

اس کو تب اس بات کا احساس ہوا جب وہ دودھ کی ڈیری میں داخل ہو گیا۔ عینک لگائے ہوئے، وہ خوف ناک شیطان اس کے نکلنے کے انتظار میں ڈیری کے سامنے نالی کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

مغرب کی اذان کا وقت آ پہنچا تھا۔ آسمان پر دھند چھا رہی تھی۔ پرندے اپنے بسیروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔

وہ دودھ کی دیگچی تھامے کب سے حیران و پریشان ڈیری کے اندر ہی کھڑا ہے۔ چھوٹی سی دیگچی کا کنارہ گھس گیا ہے۔ اس کے ناخن کنارے پر لپک لپک کر دکھنے لگے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے بھوسا ہے اور سامنے بھینس ڈکرا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا اچھل جائے گا۔

وہ ڈیری سے دودھ لے کر باہر کیسے نکلے۔

اب اس کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پیدل چلتے چلتے اس کے بدن پر ہلکا سا پسینہ آ گیا۔ ٹائی کی گرہ گھٹن سی پیدا کر رہی تھی۔ چار خانے کا کوٹ، جو وہ پہنے ہوئے تھا، اچھا خاصا گرم تھا۔ غنیمت تھا کہ ادھیڑ عمر کا ہونے کے باوجود بھی اس کا دم نہیں پھول رہا تھا۔ اس نے اپنے پسیجتے ہوئے ناک کے بانسے کو چشمہ اتار کر ہاتھ سے پونچھ دیا۔ شادی میں کھائے ہوئے پلاؤ کی ایک ڈکار نے اس کے منہ میں بساندھ بھر دی اور اسے خیال آیا کہ اس قسم کے کھانے کے بعد اسے کم از کم پان ضرور کھا لینا چاہیے تھا۔

پان؟

تو کیا اب وہ اپنی اداسی کے نشے کو واقعتاً اس طرح طول دینا چاہتا تھا۔ جس طرح

شہدے قسم کے لوگ بھانگ کا نشہ بڑھانے کے لیے اوپر سے مٹھائی کھاتے رہتے ہیں؟

یقیناً ایسا ہی تھا۔ بلی جیسی شکل کی وہ چوکنی سی لڑکی پلاؤ بہت اچھا پکاتی تھی۔ وہ اکثر اسے اپنے گھر پلاؤ کی دعوت پر بلاتی۔ لڑکی کا گھر بہت بڑا تھا۔ اس میں نہ جانے کتنے دالان، کتنے کمرے اور کتنے زینے ادھر سے ادھر چڑھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ اس کے سامنے پلاؤ کی رکابی رکھ کر خود سامنے بیٹھ جاتی، بالکل اس طرح جیسے گھر کی پالتو بلیاں کسی کھانا کھاتے شخص کے سامنے بیٹھی رہتی ہیں۔

بلی جیسی شکل کی اس چوکنی لڑکی کے پیر ہمیشہ پھٹے پھٹے رہتے تھے۔ اس کی ایڑیوں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

جب وہ کھانا ختم کر لیتا تو وہ ادھر ادھر دیکھ کر اچانک اپنی مٹھی کھولتی۔ اس میں پان کا ایک چھوٹا سا مڑا تڑا ٹکڑا ہوتا۔ وہ جلدی سے اس کے منہ میں پان کا یہ ٹکڑا ٹھونس دیتی پھر اس کے ماتھے کو چومتی ہوئی کہتی۔

''تم بہت نیک انسان ہو۔ بہت ہی نیک۔''

اس وقت اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر کتھے چونے کا نشان خون کے ایک بڑے دھبے جیسا چمکتا نظر آتا۔

لیکن صرف اتنا ہی نہیں تھا۔ اس سے بھی اہم بات کچھ اور تھی۔

یومِ عاشورہ کو دوپہر بارہ بجے وہ اسے اپنے گھر بلاتی اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر دعائے عاشورہ کا ورد شروع کر دیتی۔ اسے اس امر پر یقین تھا کہ جو شخص بھی عشرہ کے روز یہ دعا سنے گا یا پڑھے گا اس کو اس پورے سال موت نہیں آ سکتی۔ اور اگر اسے مرنا ہی ہوگا تو پھر کوئی نہ کوئی بہانہ ایسا ضرور بن جائے گا جس کی وجہ سے وہ یہ دعا سن نہیں سکے گا۔

جب وہ یہ دعا سناتی تو سر پر سفید دوپٹہ اوڑھ لیتی۔ اس کی شکل پر چھائی ہوئی بلیوں کی سی پاکیزگی کسی پراسرار شے میں بدلتی جاتی۔

کون سی شے؟

وہ بہت سوچنے کی کوشش کرتا مگر اس سے زیادہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کی شکل پر اب ایک پر جلال ضد کا سایہ ہے۔ ایسی انوکھی ضد جس کے سرے اس دنیا میں نہیں، کہیں اور ہیں۔ اور وہ ضد ان کے ان پر جلال اور پاکیزہ سایوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

وہ جب اس کے گھر سے ''دعائے عاشورہ'' سن کر اٹھ رہا ہوتا تو دوپہر ڈھل چکی ہوتی اور سہ پہر کے ٹھنڈے سائے اس وسیع وعریض گھر کے آنگن اور ادھر سے ادھر جاتے ہوئے زینوں پر اپنی شکل بدلتے نظر آتے۔

وہ ایک بہت معمولی سی بات تھی جس پر وہ اس سے ناراض ہو کر ضد پر اڑ گئی تھی۔ حالاں کہ اس معمولی سی بات میں وہ اپنی دانست میں بڑا ہی نیک اور اخلاقی فریضہ ادا کر رہا تھا۔

اس سال یوم عاشورہ کی دوپہر، بلی جیسی چوکنی لڑکی نے نہ خود دعا کا ورد کیا اور نہ ہی اسے اپنے گھر بلایا۔

''تم خود ہی پڑھ لینا دعائے عاشورہ۔ میں نہیں پڑھوں گی۔''

اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کے پورے چہرے پر بلی کی سی خطرناک بے مروتی چھا گئی۔

''آخر کیوں؟'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''بس یوں ہی۔ مجھے موت چاہیے۔'' اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک ناقابل تشریح قسم کی سفیدی کا سایہ آکر منڈلانے لگا۔

تب اس نے اس بھیانک ضد کو واضح طور پر دیکھا، جو اس کی آنکھوں میں چمک کر رینگتی ہوئی اس کے پھٹے ہوئے پیروں اور دراڑ پڑی ایڑیوں تک جا رہی تھی۔

وہ ضعیف الاعتقادی کا بہت زیادہ مخالف نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ تو بہر حال ہو ہی جاتا ہے کہ اس نظر آنے والی دنیا سے پرے کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے علم کی شروعات تو اسی نکتے میں پوشیدہ ہے۔

اس دوپہر کو وہ اس کے وسیع وعریض مکان سے آخری بار اُٹھا تھا۔ لو چل رہی تھی۔

سڑکوں پر چادر میں لپٹے تخت چلے جا رہے تھے۔

اپنے گھر پہنچ کر اس نے امی سے دعائے عاشورہ پڑھوا کر سن لی اور مطمئن ہو گیا۔

بلی جیسی چوکنی لڑکی کا پاکیزہ سراپا، پلنگ پر بکھری ایک لمبی سی خون کی قے میں تبدیل ہو کر ساری دنیا سے کب اوجھل ہو گیا، اسے یاد نہیں۔ مگر اب تک وہ پابندی سے ہر سال یومِ عاشورہ کی دوپہر کسی نہ کسی سے یہ دعا پڑھوا کر ضرور سن لیتا ہے۔ خود اسے تو عربی کا ایک لفظ بھی ادا کرنا نہیں آتا۔ افسوس۔

نیک لوگوں کی دنیا میں بہت ضرورت تھی، اور بہادروں کی بھی، بزدلی دراصل ہمت ہی کا ٹیڑھا میڑھا سا راستہ ہے۔ وہ اپنی بزدلی پر ہمیشہ نازاں رہا۔

اب یہ نشے کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد اداسی صرف ملبے کی طرح نیچے گر سکتی ہے۔ اوپر نہیں جا سکتی۔

چلتے چلتے اسے احساس ہوا کہ اداسی کے اس پڑاؤ پر بہت کچھ مضحکہ خیز بھی تھا مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اداسی کی اپنی انفرادی اہمیت ہے۔ وہ خود مختار ہے۔ جس طرح ہر تعزیے کی اپنی انفردی اہمیت ہے۔

''کہو بھائی تعزیے دیکھ آئے؟'' دور خلا میں کسی نے پوچھا۔

''ہاں بھائی۔ تعزیہ دیکھ آیا۔ کھیتوں کے اس پار، دیوار کے اس طرف، پیچھے پیچھے چلتے خوانچے والے کی ٹمٹماتی روشنی میں۔ تاریک راتوں میں اجنبی مقاموں کی خوف زدہ کرتی کہن سال عمارتوں اور روشنیوں کے درمیان تعزیوں کا پڑتا سایہ بھی دیکھ آیا۔ تمام عمر تعزیہ ہی تو دیکھتا رہا۔''

چلتے چلتے اب اسے ٹھہرنا ہی پڑا۔ کل بقرعید ہے۔

اب وہ بکروں کے بازار میں کھڑا تھا، بقرعید کی قربانی کے لیے لگا ہوا بازار۔ ایک بڑا سا چوک تھا۔ اس چوک سے تیس قدم دائیں طرف چلو اور پھر تیس قدم بائیں طرف تو ٹھیک اسی کے گھر پر پہنچا جا سکتا ہے۔ مگر تیس قدم دائیں طرف پہلے دودھ کی ایک ڈیری کو پار کرنا ضروری ہے۔ یہ بڑا سا چوک جہاں رسیوں میں بندھے بکرے منمنا رہے ہیں، وہاں اس کے بچپن میں

سرکس لگتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گھٹیا سرکس جو تمام محلوں میں گھوم گھوم کر لگتا رہتا تھا۔

سرکس کیا ہے؟ جانوروں کا ڈرامہ۔ اس المیے کے سارے کردار جانور ہیں۔ سرکس میں اگر چہ جوکر بھی ہوتے ہیں مگر پھر بھی سب سے ایمان دار جوکر تو کوئی ہاتھی، کوئی بندر یا کوئی طوطا ہوتا ہے اور دیکھنے والے کے تزکیۂ نفس کا سبب بھی وہی بنتا ہے۔

اس چوک میں بکروں کا بازار لگا ہوا تھا۔ رات شاید کافی بیت گئی تھی اس لیے اب یہ بازار بکھر رہا تھا۔ سفید، کالے، کتھئی، اور ابلق بکرے منمنا رہے تھے۔ زمین پر گیس کی لالٹینیں رکھی تھیں جن کی نیلی رنجور روشنی میں بکروں کے گلے میں بندھی رسیوں کے سائے اور بھی موٹے اور دبیز ہو کر ادھر ادھر دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ اس کے پیروں کے نیچے بکروں کی مینگنیاں اور ان کے چارے کے پتے کچلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف ناگوار سیلن اور کھراند چھائی ہوئی تھی۔

بس۔ اب اسے مڑنا تھا۔ اس کے جوتوں کی آواز آتی ہے۔ مگر مر جاتی ہے۔ کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ رستم زماں نہیں چل رہا زمین پر کہ وہ کانپے۔ ایک اکیلا، اداس اور نیک آدمی چلا جا رہا ہے۔

بہت پرانی گلی تھی۔ بچپن کی گلی، گیند اڑتی ہوئی ادھر ہی جا کر گم ہوتی تھی۔ کھنڈر کی پشت، ایک ٹوٹے پھوٹے ویران اسکول کی پرچھائیں، آگے جا کر دودھ کی ایک ڈیری۔ پھر وہ بائیں طرف مڑے گا اور اپنے گھر کے سامنے جا کر کھڑا ہو جائے گا۔

اب وہ اور بھی جھک کر چلا۔ زمین پر اپنی پرچھائیں دیکھتا ہوا۔

بکروں کے منمنانے کی آوازیں اور موٹی موٹی رسیوں کے سائے پیچھے چھوٹ رہے تھے۔ گلی سنسان تھی۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

''حمیدن کے گھوڑے کی ٹاپ گم گئی۔'' وقت کے کے نجانے کتنے پرانے ٹیلوں کے عقب سے کوئی تان لگا رہا تھا۔

''رک جا۔ تیری ماں کی ......'' سانپ کی پھنکار سی گونجی۔

چار بڑے بڑے کچے لوہے کے پستول جن میں بندوق کی گولی بھری جاتی ہے اس کے

سارے جسم پر چھا گئے۔

وہ مسکرایا۔ ''کیا بات ہے؟''

''سالے کو پکڑ کر ادھر لے چلو۔ ادھر گولی ماریں گے اسے۔''

وہ اسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے آگے لائے۔ دودھ کی ڈیری کے ٹھیک سامنے دیوار سے لگی ہوئی نالی کے پاس۔ بائیں طرف اُس کے گھر کا راستہ تھا۔

وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ پیچھے ایک چمک دار چھری تھی۔ کمر سے لگی ہوئی۔

گردن سے لے کر پنڈلی تک پستول گڑے ہوئے تھے۔

اس کی ٹائی بے ہنگم انداز میں جھول رہی تھی۔

''ماردو گولی سالے کو''

''ماردوں گولی؟''

''اس کا پیٹ پھاڑ دو۔ ذبح کر دو۔''

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس کا قتل کیوں کر رہے ہیں۔ مگر اب وہ ان سے وجہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک نیک آدمی تھا اور شہید ہونے کے لیے تیار تھا۔ وہ اسے پکڑے پکڑے نالی کے پاس دیوار تک لے گئے۔ اُس کے کاندھے اور پیٹھ سیاہ ٹھنڈی دیوار سے لگ کر اکڑنے لگے۔

کہیں دور کالی کے مندر میں گھنٹے بجے جا رہے تھے۔

وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔

ان پستولوں کے سائے کہاں پڑ رہے تھے؟ چھری کی چمک ایک بار آنکھوں میں لہرائی تھی لیکن اس کا سایہ وہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے گمان گزرا کے اس کے جسم پر گڑی ہوئی نالیں شاید نالوں کی پرچھائیں تھی۔ اصل پستول کی نال نہ جانے کہاں تھی۔ اصل نالیں اپنی اقلیدس میں ان سے مختلف ہوں گی۔ ان کے منہ زیادہ بے ہنگم، بھدے اور چوڑے ہیں۔ یہ ان سے زیادہ کالی اور بدشکل ہیں۔ کمر میں چبھنے والی چھری صرف چھری کی پرچھائیں ہے۔ اس کی چبھن صرف ایک پرچھائیں کی چبھن ہے اور اس لیے اصل شے سے زیادہ ٹھنڈی اور متلاہٹ بھری ہے۔

اچانک ڈیری کی ٹوٹی پھوٹی ہوئی دیوار سے ایک اینٹ گری۔ بھورے رنگ کی ایک بلی چھلانگ لگاتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

پھر کمر پر لگی ہوئی چھری پیچھے کو ہٹی۔ جسم پر سے پستولوں کی ٹھنڈی نالیں واپس ہوئیں۔

''دھپ۔ دھپ۔'' آنکھوں میں سرمہ لگائے چار فحش ہجڑوں کے بد ہیئت سائے دور گلی میں بھاگتے ہوئے نظر آئے پھر غائب ہوگئے۔

تاروں کی چھاؤں میں کھڑا جھومتا ہوا وہ اپنی پرچھائیں کو دیکھتا رہا۔

نالی میں کیا سنہری جلد والی کتاب جگمگا رہی تھی؟

دیوار کے پیچھے بلی جیسی چوکنی لڑکی دعائے عاشورہ پڑھ رہی تھی۔

یافارج کرب ذی النون یوم عاشوراء

''تم بہت نیک شخص ہو۔'' اچانک اس نے کہا اور پھر دعا شروع کر دی۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نیکیاں اس کی پرچھائیں کے قدموں سے نکل کر گلی میں بیہودہ رقص کر رہی ہیں۔ اس نے ان نیکیوں کی پرچھائیوں کو بھی غور سے دیکھا۔

اسے گماں گزرا کہ کہیں دور سے کوئی تخت اٹھ رہا ہے اور ماتمی باجا بج رہا ہے۔ تو شہر کس مصیبت، کس وبا کی زد میں ہے؟ اس نے سوچا۔ جب کسی شہر میں سرمہ لگائے، بدکردار ہجڑے تمھیں گندی گالیاں دیتے ہوئے بے وجہ قتل کرنا چاہیں تو کیا یہ یقین کر لینا چاہیے کہ واقعی شہر کسی وبا کی زد میں ہے۔

اس نے ناک پر اپنا چشمہ درست کیا۔ اس کی ٹائی ابھی بھی بے ہنگم انداز میں جھول رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرتے وقت اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی موٹی رسی کو چھو رہا تھا۔

نہیں۔ کوٹ میں کوئی سوراخ نہیں ہے۔ کپڑوں پر خون کا کوئی دھبا نہیں ہے۔ اس کا باریک چار خانے کا کوٹ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ کوٹ کی بائیں جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس یوں ہی محفوظ پڑے ہیں۔

وہ اپنے وجود کی پرانی رگوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہے۔ باہر آ رہا ہے۔ ایک

امکان، ایک اتفاق، ایک مغالطے کی طرح۔

کیا وہ اب بھی اداس تھا؟

نہیں۔ اداسی اپنا اخلاقی فرض پورا کر کے رخصت ہو چکی تھی۔ اداسی نے ہی اسے بچایا تھا۔ دراصل جب ہم اداس ہوتے ہیں تو اپنی ذات کے تئیں بے حد چوکنے ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی لاشعوری خودغرضی ہے۔ انفرادی اداسی سوجھ بوجھ سے بھرا نشہ ہے۔ موت سے پہلے ہی موت کے سچ کو جان لینے کا ترغیب آمیز نشہ۔ مگر افسوس کہ موت سے پہلے اس سچ کے لیے ہمارے حواس اور اعصاب تیار نہیں ہیں۔ وہ تو بس موت کو چھو کر اور چکھ کر واپس آ رہا ہے۔

مگر پھر اس نے سوچا۔

یہ موت کو چھونا بھی کہاں تھا؟ یہ سب تو بازاری تھا۔ قربانی، شہادت، ایثار، اور موت اتنی ارزاں اشیا نہیں ہیں۔ ان کی نقل ارزاں ہے۔ وہ موت نہیں تھی۔ موت کی نقل اتارتا ہوا کوئی بھانڈ تھا۔ اس بھانڈ نے اس کے ساتھ بے ہودہ فحش مذاق کیا تھا۔ اس لیے اب وہ صرف شرمندہ تھا۔ یہ ایک ایسی مکمل شرمندگی تھی جس کا مرثیہ پڑھنا بھی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ سنسان رات، تاروں کی چھاؤں اور ویران گلیوں میں پڑنے والے تاریک سایوں پر اپنا خون معاف کر دے۔ بالآخر مجبور ہو کر اس نے ایسا ہی کیا۔

لیکن پھر موت کہاں تھی؟

اگر یہ صرف موت کا سوانگ، موت کی ڈمی تھا تو پھر اصل موت کہاں تھی؟ شاید اس مہیب، نادیدہ دیوار کی نظر آتی پرچھائیں کے پیچھے وہ چھپی بیٹھی تھی۔ یا کائنات کی تمام بے تکی اشیا کے اور بھی زیادہ بے تکے سایوں کے عقب میں۔

ہاں بس ایک اہم فرق ضرور رونما ہوا ہے۔ جب پستولوں کی نالیں تمھارے جسم سے ہٹائی جاتی ہیں۔ جب خوفناک چھری تمھاری کمر میں چبھنا بند کر دیتی ہے۔ تب تم ایک نئے آدمی ہوتے ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے غسل خانے سے نہا کر نکلنے کے بعد، یا دوپہر کے قیلولے سے جاگنے کے بعد تم ایک نئے آدمی ہوتے ہو۔

تو وہ اب ایک نئے آدمی کی طرح اپنے گھر کی طرف چلا۔ مگر صرف نئے آدمی کی طرح گھر واپس آنا کوئی بہت بڑا کارنامہ نہ تھا۔ یہاں صرف ایک بُھوت طرح ہی محفوظ گھر واپس آیا جا سکتا ہے۔

اور یقیناً وہ واپس آ رہا تھا۔ بغیر خون میں لت پت ہوئے۔ ایک آدمی کی طرح نہیں بلکہ اس کے آسیب یا سائے کی طرح ایک ہمیشہ کے لیے محفوظ پریت کی طرح جس کی حفاظت اس کی نیکیاں یا کوئی دعا نہیں بلکہ اس کی اپنی ہوائیں اور چھلاوے کرتے ہیں۔ اور اس لیے وہ اپنے کوٹ پر خون کے دھبے لیے بغیر آدھی رات کو اپنے گھر کے دروازے پر دستک دے سکتا ہے۔

☆☆☆

جلتے ہوئے جنگل کی روشنی میں

سارے سوانح، زندگی کی کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ ان خالی گھونگوں کی طرح ہوتی ہیں جن سے ان کیڑوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا جو کسی زمانے میں ان میں رہتے تھے۔

چسلاومی ووش

یہ بڑی دلچسپ اور عجیب بات تھی کہ دنیا کو اس نے ہمیشہ محض زمین ہی سمجھا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ یہی سوچتا آیا تھا گویا دنیا میں انسان نہ رہتے تھے۔ بس وہاں پہاڑ تھے، پانی تھا، میدان تھے، جنگل تھے کسی حد تک چرند و پرند کا بھی مبہم سا تصور موجود تھا، مگر انسان، وہ تو جیسے کہیں باہر سے آئے تھے۔ کسی نہ دکھائی دینے والے دور دراز اور پراسرار مقام سے دنیا میں پھینکے گئے تھے۔ وہ ٹین کے خالی ڈبے میں باہر سے ڈالے گئے کوڑا کرکٹ یا کنکروں کی طرح تھے۔ جس طرح ڈبے میں کنکر بجتے رہتے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنی اپنی زبان چلاتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا نقلی طور پر مگر نامحسوس طریقے سے تقسیم شدہ ہوگئی تھی۔

انسان فطرت اور ماحول کا عنصر ہرگز نہ تھے۔ وہ تاریخ کی پیداوار تھے۔ زبان اور تاریخ سے خالی دنیا ہی اصل دنیا تھی۔

وہ ہمیشہ سے ایسا ہی سوچتا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ دنیا پہلے صرف زمین تھی اور انسان اس میں بہت بعد میں، دیر سے آیا، گناہ کرنے کے بعد، مگر اب تو انسان کے بغیر دنیا کا کوئی تصور ہی نہ تھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ انسان دنیا کو ہمیشہ بدلتا بھی آیا تھا۔

مگر وہ..... وہ تو بس آنکھیں بند کرلیتا اور دنیا اپنے تمام کہساروں، سمندروں اور جنگلوں سمیت اس کے سامنے مہربان دوست اور غم گسار کی طرح آ کھڑی ہوتی۔

اس طرح آنکھیں بند کرلینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ ایک دینی مدرسے میں جغرافیہ کا معلم تھا۔ تمام زندگی اس نے اپنے چھوٹے سے شہر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ مدرسہ اس کے محلے میں ہی واقع تھا مگر پوری دنیا کا نقشہ اور جغرافیہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔ مختلف ملکوں کے طرح طرح کے جغرافیائی نقشے ہمیشہ پلندہ بنے اس کے ساتھ رہتے۔ ان میں سے بیشتر کے کاغذ بہت بوسیدہ اور میلے ہوگئے تھے۔ یہ نقشے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور وہ ان کی کترنوں کو بار بار گوند سے چپکاتا رہتا تھا۔

اس کے پاس بہت سے خالی نقشے بھی موجود رہتے جن کو بھرتے رہنا اس کا دوسرا اہم شغل تھا۔ ندیوں، پہاڑوں اور سمندروں کو پنسل کے سرے سے کاغذ پر مکمل کرتے جانا اس کے لیے جمالیاتی تجربہ بن چکا تھا۔

مدرسے میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے اپنی سی بھرپور کوشش کی تھی کہ وہاں تاریخ کا پڑھانا بند کردیا جائے مگر یہ ممکن نہ ہوسکا تھا۔ تاریخ سے اس کی عداوت کا سبب بھی جغرافیہ ہی تھا۔ وہ دراصل جغرافیے کو تاریخ کی آلودگی سے پاک کردینا چاہتا تھا۔ وہ اکثر ایسے مضامین لکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا جن میں تاریخ کے ذریعے جغرافیے میں پھیلائی گئی گندگی کے بے رحمانہ رویے کو ثابت کیا جاتا تھا۔ یہ مضامین کبھی کبھی وہ اپنے بالائی گھر کی کھڑکی پر کھڑا ہوکر صرف اس لیے قدرے بلند آواز میں پڑھا کرتا کہ بولے ہوئے لفظ اور تحریری لفظ میں کسی تضاد کی نشان دہی ہوسکے۔

یہ سچ تھا کہ اسے انسانوں کی تاریخ سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ تاریخ تو آسیب کی طرح تھی۔

وہ اڑتی پھرتی تھی، کہیں ٹھہرتی ہی نہ تھی اور بڑی بے رحمی اور بے مروتی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر بیٹھ جاتی تھی مگر پہاڑ، سمندر، میدان نظر آتے تھے، ٹھوس اور اگر وہ بدل بھی رہے تھے تو کم از کم اسے اس کا کوئی واضح شعور نہ تھا۔ نقشے میں تو وہ اور بھی قائم و دائم نظر آتے تھے۔ مگر تاریخ نقشے کی آڑی ترچھی لکیروں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ وہ واقعی بھٹکتی پھرتی تھی، ایک ہوا، ایک شے کی طرح، یا اپنا گلا کاٹتی ہوئی، ہاتھ میں استرا لیے ایک بدنیت مگر احمق بندر کی طرح۔ اسے ایسے آسیب میں بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

آج اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے کاغذ پر جو لکھا تھا، اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اپنے بالائی گھر کی کھڑکی کھول کر آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔

معمولی سے محلے کا انتہائی معمولی مکان تھا۔ آم کے درخت کی کم زور لکڑی سے بنا دروازہ اور کچا فرش بغیر چونے کی دیواروں پر قطار سے لگے ہوئے تین چار طغرے۔ تیسری منزل کا مکان تھا۔ کھڑکی کا پٹ کھولنے پر نیچے محلے کی پتلی سی گلی نظر آتی تھی۔ اگر مشرق کے رخ پر کھڑے ہو کر کھڑکی سے نیچے دیکھا جائے تو بجلی کا ایک کھمبا گلی کے دائیں موڑ پر تھا۔ بائیں موڑ والے کھمبے کے بالکل نیچے پانی کا ایک نل لگا تھا جس میں کبھی کبھار ہی پانی آتا تھا۔

یہ غریب لوگوں کی بستی تھی۔ سارے محلے میں قطار سے بنے ہوئے تقریباً ایک جیسی کس مپرسی بیان کرتے ہوئے مکانات تھے۔ گلی کے دائیں طرف کے موڑ سے تھوڑا آگے ہندوؤں کی بڑی آبادی تھی، مگر بائیں موڑ سے آگے دور تک مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا قبرستان پڑتا تھا، پھر کھیت شروع ہوجاتے تھے۔ کھیتوں کے آخری سرے پر مرگھٹ تھا، بھنگیوں کا مرگھٹ۔ کسی زمانے میں وہاں بھنگیوں کے مردے جلائے جاتے تھے لیکن اب صرف دھول اڑتی تھی۔ ٹین کا ایک زنگ آلود ٹوٹا پھوٹا شیڈ وہاں رہ گیا تھا، جو ہوا میں کھڑ کھڑاتا رہتا تھا۔ اس کے کھڑکھڑانے کی آواز رات کے سناٹے میں بڑی مہیب محسوس ہوتی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ جب کبھی اس ٹین کے ہلنے کی آواز آتی ہے تو دور مرگھٹ میں شعلے بھی بھڑکتے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک اس کے گھر کا سوال ہے تو گھر میں کھڑکی کے علاوہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھی۔

ہاں مگر وہاں بہت سے قرآن شریف بھی تھے جو جگہ جگہ پھول دار جزدانوں میں لپٹے نظر آ جاتے تھے۔ ایک بڑا سا پرانا قرآن شریف تو کھڑکی کے اوپر بنے چھوٹے سے مچان پر ہی رکھا ہوا تھا۔

گھر میں کالی چیونٹیوں کی بھی بھر مار تھی جن کے بارے میں اس کی بہن کا خیال تھا کہ انھیں کبھی نہیں مارنا چاہیے کہ یہ چیونٹیاں مذہباً دراصل مسلمان ہیں۔ ابھی وہ کالی چیونٹیاں کھڑکی کے پٹ پر رینگ رہی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ پر دنیا کا ایک نقشہ بھی چسپاں تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ سے لکھا تھا:

''مجھے صاف اور واضح طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ حروف اور الفاظ کی شکلیں ہی تبدیل ہوگئی ہیں۔ اگر چہ وہ صاف صاف وہی تھے جو ان کا مطلب تھا۔ مثلاً 'ب' 'ب' ہی تھا اور 'ج'۔ مصوتوں اور مصمتوں کی صوتیات میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مذکر مونث میں اور مونث مذکر میں ہرگز نہیں بدل رہا تھا۔ مگر پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے رویے میں ایک ناقابل دید مگر کوئی اہم اور پر اسرار تبدیلی ضرور واقع ہوئی تھی۔ جیسے آپ کبھی کبھی اپنی عورت کی سرد مہری کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ ترسیل اور معنی کے تمام کونوں سے اکھڑے اکھڑے ناراض اور خفا سے کھڑے تھے۔ وہ کسی دوسری سمت کو جھک رہے تھے۔''

(تو کیا محض ہاتھ بدل کر لکھنے سے تاریخ ایک نخریلی عورت میں بدل سکتی تھی۔ اس کا پورا رویہ ہی کچھ سے کچھ بن سکتا تھا؟)

''میں آپ کو بتادوں، بلکہ گوش گزار کردوں، کہ میرا کوئی ارادہ متوسط تاریخ لکھنے کا نہیں رہا ہے۔ تاریخ ویسے بھی مجھے مکھی کی طرح ہی نظر آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں بلکہ مقابلے میں کیا، مطلقاً، جغرافیہ کو ہی میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے کہ اس میں کم از کم ندی، پہاڑ اور گھاس وغیرہ کا ذکر تو ہوتا ہے۔ میں تو دراصل تاریخ اور جغرافیہ کے اس نام نہاد تعلق کو بے بنیاد ثابت کرنا چاہتا ہوں جس کا علمی حلقوں میں ہمیشہ سے ہی بڑا چرچا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ کا تعلق دراصل کسی بھی شے سے نہیں ہے یا اگر ہے تو صرف انسانی تقدیر سے یا خدا کی خدائی سے۔ دونوں ہی سے مجھے رتی برابر دلچسپی نہیں اور اس سلسلے میں علت و معلول کا احمقانہ اصول کتنا ثابت ہوسکتا ہے!

اسے فلسفیانہ طور پر بیان کر کے میں اپنی اور آپ کی طبیعت کو پراگندہ خاطر نہیں کرنا چاہتا۔

''میں تو یہ سب لکھ ہی اس لیے رہا ہوں کہ تاریخ کے کنکھجورے کو جغرافیہ کی شفاف پیٹھ پر سے نوچ کر دور پھینک سکوں۔ اس کے لیے مجھے چمٹے میں ایک انگارہ رکھنا ہوگا...... میں یہ سارا کام اپنے بائیں ہاتھ سے کر رہا تھا مگر بایاں ہاتھ آج کل بری طرح دکھ رہا ہے۔ کندھے سے لے کر انگلیوں تک اس میں بری طرح سوجن ہے۔ وہ لال لال ہے اور اندر سے اس طرح تپ رہا ہے جیسے وہاں کسی پھوڑے کا مواد بھرا ہوا ہو۔ اینٹھن اور درد گردن تک پھیل گئے ہیں۔

''میں بائیں ہاتھ والا آدمی ہوں یعنی بیاری۔''

''جب بائیں ہاتھ سے لکھنا دشوار ہوگیا تو میں نے مجبوراً دائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے زندگی میں پہلے کبھی دائیں ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ مگر کیا کروں یہ کام اب اور زیادہ ٹالا بھی نہیں جاسکتا۔''

''تو اب آپ کو اتنا علم ہو ہی گیا ہوگا کہ تاریخ وارخ کی چھان پھٹک کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہوں۔ میں تاریخ کو خالص کیوں بناؤں؟ میں تو جغرافیے کو خالص بنانے کی کوشش کر رہا ہوں تا کہ اس خالص جغرافیے کو اس کی مکمل جمالیات اور نشاط و انبساط کے ساتھ اپنے حواس و اعصاب میں محفوظ رکھ سکوں۔ خالص جغرافیہ جو ریاضی کے ہندسے کی طرح صاف شفاف، چمکتا ہوا اور ایماندار ہے۔

''لیکن اب دائیں ہاتھ سے یہ انگارہ پکڑنے پر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ صرف رسم الخط ہی نہیں بدل رہا ہے، سب کچھ بدل رہا ہے۔ اگر الفاظ اس طرح آہستہ آہستہ اپنی شکل بگاڑتے رہے تو یہ کچھ ایسی خطرناک صورتِ حال ہوگی جیسے کسی کی جنس کا پر اسرار طریقے سے بدلتے جانا، جیسے ایک نازک اندام حسینہ کے سینے پر اور چہرے پر بڑے بڑے بالوں کا اگ آنا۔ ہے نا خطرناک بات! کیوں کہ اس سے آگے چل کر سارا مفہوم بلکہ کہوں تو سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا۔

''میں دراصل بائیں ہاتھ والا آدمی ہوں۔''

''مگر میں صرف، بائیں ہاتھ والا، ہی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ تقریباً سب کچھ بائیں

طرف ہی ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں یہ سوچنے میں بخل سے کام لے رہا ہوں کہ میرے اوپر تمام بلائیں چاہے وہ آسمانی ہوں یا زمینی، بائیں طرف ہی کیوں نازل ہو رہی ہیں۔ مگر قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے، بھلے ہی اس کے جسم کا بایاں یا دایاں حصہ بالکل ہی بے کار کیوں نہ ہو جائے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر کل کلاں کو میرے اوپر فالج بھی گر جائے تو جناب جسم کا بایاں حصہ ہی بے کار ہوگا۔''

(۲)

اور یہ حقیقت تھی کہ وہ صرف بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا کوئی عام سا آدمی نہیں تھا۔

کیا یہ کسی قسم کا کینسر ہو سکتا تھا؟

ممکن ہے کہ جسم کا دفاعی نظام کچھ اس طرح متاثر ہوا ہو کہ ہر قسم کی بیماری، کمزوری، معذوری اور تکلیف ادھر ہی کو چلی آ رہی ہو۔ یعنی اس کے جسم کے بائیں حصے میں۔ ویسے جراثیم کے بارے میں تو کوئی تجسس نہ تھا کہ وہ آسمان سے سست روی کے ساتھ نیچے اتر ہی رہے تھے، خلا سے آ رہے تھے، بوندوں کی طرح انسانوں کے مقدر پر گرتے ہوئے۔ تجسس تو یہ تھا کہ آخر یہ سب کیا تھا جو اس کے جسم کے بائیں طرف کو ہی متاثر کرتا تھا۔ شاید اس کینسر کے پاس اور کوئی کرشمہ ہی نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے بائیں نظام اعصاب پر ہی اپنی ڈگڈگی بجائے؟

مگر موت بھی تو تھی۔ مسئلہ تو بیماری کے بعد مرنے کا تھا۔ موت تو صرف بائیں طرف ہی نہیں آتی۔ مگر یہ بھی کون جانتا ہے کہ کوئی شخص بیمار ہی پڑ کر مرے گا۔ اب یہ تو بہ ظاہر ایک مضحکہ خیز مگر درحقیقت ایک پر اسرار فہرست کو پڑھنا ہے کہ اس کی بائیں آنکھ سے پانی نکلتا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ پھڑکتی رہتی تھی۔ پیر کی رگ اکثر کھنچ جایا کرتی تھی مگر وہ صرف بایاں پیر ہوتا تھا۔ بائیں طرف کے گردے میں ہمیشہ سوجن رہتی تھی۔ اس میں پتھری بن گئی تھی۔ بائیں پیر کے انگوٹھے میں اکثر ٹھوکر لگ جایا کرتی تھی۔ اس میں پیپ پڑ کر ناخن نیلا پڑ جایا کرتا تھا۔ بچپن میں کبھی پیٹ میں درد ہوتا تو وہ صاف محسوس کرتا کہ درد دراصل پیٹ کی الٹی طرف ہی ہو رہا ہے۔

منہ میں بائیں طرف کی ڈاڑھ گل گل کر گر چکی تھی اور وہاں اکثر درد رہتا تھا اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ بچپن میں نزلہ بگڑ جانے کے باعث اس کے کان بند رہنے لگے تھے اور ان میں ہر وقت ہوا سیٹیاں سی بجاتی رہتی تھی۔ مگر الٹا کان زیادہ تر بہتا بھی رہتا تھا۔ اکثر رطوبت نکل کر کان کی لو سے بہتی ہوئی گردن تک پہنچتی تھی۔ ایسے وقت اگر بہن اسے دیکھتی تو بہت پیار کے ساتھ روئی یا کسی کپڑے کی دھجی سے اسے صاف کر دیتی۔ بائیں طرف بغل میں چھوٹے چھوٹے بے شمار کالے مسے تھے۔

حد تو یہ تھی کہ امس بھرے دنوں میں اس کا پورا بایاں جسم گرمی دانوں سے پھل جایا کرتا، مگر دائیں طرف ایک ننھا سا دانہ بھی نہ ابھرتا۔

اور کوئی یقین کرے یا نہ کرے، اس ستم ظریفی سے تو وہی واقف تھا کہ کچھ عرصے سے اس کے بائیں فوطے میں پانی آ گیا تھا اور وہ پھول کر غبارہ بنتا جا رہا تھا۔ اس صورت میں اٹھنا بیٹھنا اس کے لیے کم تکلیف دہ نہ تھا۔

اب جہاں تک اس کے جسم کے دائیں حصے کا سوال تھا تو ادھر بچپن سے لے کر اب تک ایک آدھ بار صرف خراش ہی آ گئی ہوگی۔ ورنہ موچ ہو یا کوئی چوٹ، سب بائیں طرف ہی وقوع پذیر ہوتا تھا۔ دایاں تو صاف اور بے داغ پڑا تھا۔ وہ الٹے پیر پر زور دے کر قدرے بائیں کو ہی جھک کر چلتا تھا لہٰذا نہ صرف یہ کہ الٹے پیر کی ایڑی ہمیشہ دکھتی رہتی تھی بلکہ اس پیر کی چپل کی ایڑی بھی ہمیشہ گھسی اور شکستہ حالت میں نظر آتی تھی۔

اس کا گلا دائمی طور پر خراب رہتا تھا اور اسے ہمیشہ ہلکی ہلکی کھانسی رہتی تھی، مگر جب منہ پھاڑ کر وہ آئینے میں اپنا گلا دیکھنے کی کوشش کرتا تو صرف بایاں غدود ہی سوجا ہوا اور سفید پیپ سے بھرا ہوا نظر آتا۔ کبھی کبھی دل گھبراتا اور سینے میں بائیں طرف میٹھا میٹھا درد محسوس ہوتا۔ اس وقت وہ سینے کے دائیں طرف درد ہونے کی دعا مانگا کرتا۔ ریڑھ کی ہڈی کا گڑیہ اکثر ادھر ادھر ہو جاتا مگر درد، وہ تو صرف بائیں طرف ہی ہو رہا ہوتا۔

یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر لفظ ''بیماری'' کی تصویر اتاری جا سکتی تو اس کے جسم

کے بائیں حصے سے بہتر کوئی منظر نہ ہوتا۔ یہ کسی کینوس کی سیاہی نہیں بلکہ اصل اور خالص بیماری کی مکمل تصویر ہوتی۔

آخر کیوں؟ کچھ بھی دائیں طرف کیوں نہیں ہوتا۔ ساری مصیبت، تمام آفت آخر بائیں طرف ہی کیوں تھی؟

آخر تھا نہ بہت عجیب اتفاق اور ساتھ ہی مضحکہ خیز بھی جس پر ٹھٹھا مار کر ہنسا جا سکتا تھا۔ یعنی وہ صرف بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا ایک عام سا آدمی نہ تھا۔

''تو بائیں طرف چلنا کیوں اچھا ہے؟'' بچپن میں اس نے باپ سے سوال کیا تھا۔

''امن و امان کے لیے۔'' باپ نے جواب دیا۔

''امن و امان کے لیے۔ امن و امان کے لیے۔'' اس نے دہرایا۔

مگر شاید صرف بائیں طرف چلنا ہی اچھا تھا اور سب برا تھا۔

اس دن جمعرات تھی۔ کسی کے گھر سے فاتحہ کا سالن آیا تھا۔ مرغ کا سالن۔ وہ جلدی سے ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ تام چینی کے پیالے میں بوٹیاں اور شوربہ چمک رہا تھا۔ اس نے خوش ہو کر نوالہ توڑا۔

لکڑی کا ایک موٹا سا بینت اس کے بائیں ہاتھ پر پڑا، وہ درد سے بلبلا گیا۔ ہاتھ لال ہو گیا۔ نوالے میں پھنسی ہوئی مرغ کی بوٹی فرش پر بکھر گئی۔ وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

''اور کھا الٹے ہاتھ سے۔ اگر تو نے الٹے ہاتھ میں نوالہ تھاما تو آج ہاتھ ہی توڑ کر الگ کر دوں گا۔'' باپ غصے میں چیخا اور لمبی سفید داڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔ وہ محلے کی مسجد میں موذن تھا۔

''کتنی بار سمجھایا ہے کہ الٹا ہاتھ شیطان کا مسکن ہے۔ ناپاک ہے۔ اس سے آب دست لیا جاتا ہے۔'' باپ دوبارہ گرجا۔

ایسا ہمیشہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ کھانے کے سامنے سہما سہما سا بیٹھا رہتا۔ جب باپ مسجد میں اذان دینے کے لیے گھر سے باہر جاتا تو چھوٹی بہن اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور اپنے

سیدھے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اسے کھلانے لگتی، اس وقت اس کی دائیں آنکھ سے آنسو اور بائیں سے شاید پانی بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ جب بھی سونے کے لیے لیٹتا تو بائیں طرف کروٹ لے کر ہی اسے چین ملتا اور نیند آتی۔ تب باپ اسے جھنجھوڑ کر سوتے سے اٹھا دیتا۔

''پھر لیٹا اس طرح! بائیں کروٹ سے لیٹنا یا سونا سنت نہیں ہے۔ تمام عمر آنتیں سڑتی رہیں گی!''

ڈر کے مارے اس کا پیشاب نکل جاتا۔

مگر افسوس کہ یہ تمام نصیحت اور ڈانٹ پھٹکار رائیگاں ہی گئی۔ نہ اس نے بائیں ہاتھ سے کام کرنا چھوڑا اور نہ ہی کبھی دائیں طرف کروٹ لے کر اس کی آنکھ لگ سکی۔

ایک دن اس کا باپ اسے نیک اور جنتی آدمی دیکھنے کی آرزو دل ہی میں لیے لیے اس دنیا سے چلا گیا۔ اس دن محلے کی مسجد میں کسی اور نے اذان دی اور اس امر کا انکشاف اس پر باپ کے مرنے کے بعد ہی ہوا کہ اس کے گھر میں کتنے بہت سے قرآن شریف موجود تھے۔

اب شام بیت گئی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا بولے ہوئے لفظ اور تحریری لفظ کی آپسی ہم آہنگی کو پرکھ رہا تھا۔

''میر باقی بابر کا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو دراصل ابراہیم لودی کا صوبے دار تھا۔ ابراہیم لودی سے اس کی غداری ایک پر اسرار امر ہے اور اس کی وجوہات اس کی غداری سے بھی زیادہ پر اسرار۔ اس نے پہلے سے تعمیر شدہ ایک مسجد بڑی خوش دلی کے ساتھ بابر سے منسوب کر دی۔ جس طرح لوگ اپنی تخلیق کردہ کتاب کو کبھی کبھی کسی بڑے ادیب وغیرہ کے نام کر دیتے ہیں۔ اس کا یہ اقدام ایک بڑے جغرافیائی خطے پر امن و امان کا پیش خیمہ بھی تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ سڑک پر بائیں طرف چلتے ہوئے امن و امان اور سلامتی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''میں نے مندرجہ بالا عبارت کو بائیں ہاتھ سے لکھنے کی ایمان دارانہ کوشش کی تھی۔ مگر کیا کروں؟ مجبور ہوں۔ درد کی لہر سے پورا ہاتھ تنا رہا ہے۔ اب یہ کام تو مجھے کرنا ہی ہے سو سیدھے ہاتھ سے ہی سہی۔ تاریخ کے جبر سے آزادی ہی میرا اولین اور آخری مقصد ہے۔ مگر

مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ تاریخ کا جبر تو ایک مہمل سی بات ہوئی۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ 'جبر' اپنی ماہیت میں ہوتا ہی صرف 'تاریخ' ہے اور کچھ نہیں۔ اب بات کو کچھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ چاہے ایک جھٹکے میں آپ کے ہاتھ پیروں کے انگوٹھوں کو کاٹ کر پھینک دیا جائے یا ان کے ناخن اکھاڑ دیے جائیں تو یہ سب تاریخ ہے۔

''ہاں تو اصل میں گرم ممالک کے رہنے والوں کے لیے جمہوریت اور سرد ممالک والوں کے لیے بادشاہی مناسب ہے۔ جس طرح ایک واستو کار الگ الگ مقاموں پر اپنے لیے بنائے گئے مکانوں کی مٹی انھیں مقامات سے منتخب کرتا ہے، ملکوں کا مقدر بھی اسی طرح طے ہوتا ہے۔ اور پھر جیوتش بھی تو ہے۔ وہ تو جغرافیے کا سب سے اہم عنصر ہے۔ ستارے اور سیارے ایک جغرافیائی اکائی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان کا اثر ملکوں پر نہ پڑے گا تو کیا محض انسانوں کے مقدر پر پڑے گا؟

''اور یوں تو ملک ایک روحانی اکائی ہے۔ ہر ملک اور اس کی تاریخ پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک عظیم روحانی تجربے میں بدل جاتی ہے کیوں کہ جب خدا اپنے آپ کو عظیم وسعت میں دیکھنا پسند کرتا ہے تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی قلب ماہیت مملکت میں کرے۔ ویسے تو خیر، خدا نقطے میں سمٹ جائے پھر بھی وسعت کا سراغ ہی دیتا ہے۔ اب دیکھیے کہ نادار، لاچار، اپاہج اور مظلوم سب میں اس کا قیام ہے۔ یہ سب وسعت کی مثالیں نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور وسعت میں طول البلد اور عرض البلد کی شمولیت کس قدر لطیف ہے، اس کے بارے میں بیان کرنا تو یقیناً تضیع اوقات ہوگا جس کے لیے فی الحال میں تیار نہیں ہوں۔ مگر یہ بات ایک بار پھر قبول کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جغرافیہ سے عشق ہے۔ مجھے آرمینیا کے گھاس کے میدان اور بھیڑیں بہت اچھی لگتی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں بائیں طرف سے سخت بیمار ہوں۔

''میرا سارا بایاں کمزور ہے۔''

(۳)

یہ کبھی نہیں پتہ چل پایا کہ اس کے گھر میں جغرافیہ کے اتنے نقشے کہاں سے اکٹھا ہو گئے تھے۔ بہت سے کلام مجید، حدیث و فقہ کی کتابیں، طب کے نسخے اور ڈھیر سارے مخطوطے تو اس کے باپ اور دادا کے زمانے سے گھر میں اکٹھا ہوتے چلے گئے ہوں گے، مگر جغرافیہ کے اتنے ڈھیر سارے نقشے؟ ان میں سے بیشتر تو متروک ہو چکے تھے۔ وہ کسی اور زمانے کا جغرافیہ پیش کرتے تھے۔ اگر اس کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ان پھٹے حال اور متروک نقشوں کو سنبھال کر رکھتا تھا۔ اگر ان کا کاغذ گل کر پھٹنے لگتا تو وہ بے حد تن دہی کے ساتھ اس کو اپنی جگہ پر چسپاں کر کے ہی دم لیتا۔ مجال ہے کہ کوئی پہاڑ، کوئی ندی، کوئی سمندر، نقشے پر سرک کر کہیں غائب ہو جائے۔ وہ تِتلی سے پتلی کترن کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا۔

اگر چہ اس احساس سے وہ بھی بیگانہ نہ تھا کہ جس دور میں وہ جی رہا تھا اس میں شاید جغرافیہ کی موت واقع ہو چکی تھی۔ نئی ٹیکنالوجی اور نئے شعبدوں والے انسان نے جغرافیہ میں یقین کرنا بند کر دیا تھا۔ دنیا پتہ نہیں کون سے گاؤں میں بلکہ ''چھپر'' میں بدل گئی تھی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ فقط ایک نیلے غبار کے سوا؟

مدرسے میں جہاں وہ پڑھاتا تھا، دنیا کا نقشہ اس کی پشت پر دیوار سے ٹنگا رہتا۔

''بتاؤ۔ کوہ قاف کہاں ہے؟'' وہ تقریباً دہاڑتا۔

جب کوئی طالب علم نقشے کو غور سے دیکھ کر جواب دینے کی کوشش کرتا تو وہ اپنے بائیں ہاتھ میں رول اٹھا کر بغیر پیچھے مڑے، اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے رول کو اپنے سر یا کندھے سے اوپر لے جاتے ہوئے پیچھے دیوار پر ٹنگے ہوئے دنیا کے نقشے پر زور سے مارتا اور رول ناقابلِ یقین طور پر ٹھیک کوہ قاف پر پہنچ کر گویا چپک سا جاتا۔

''یہ رہا کوہ قاف۔ بحیرۂ اسود سے بالکل ملا ہوا۔'' وہ جوش اور مسرت سے چیختا اور اس کی بائیں آنکھ بری طرح پھڑکنے لگتی۔

ویسے اس خیال سے بھی وہ متفق تھا کہ اس سیارے کو ''زمین'' کا نام دینا گمراہ کن تھا۔

کیوں کہ اصل میں تو یہ ایک ''مہا ساگر'' تھی۔

جہاں تک زمین کے اندرونی حالات کا سوال تھا، تو اس ضمن میں اس کی واقفیت دوسروں کی طرح بہر حال محدود تھی۔ وہ بس یہی جانتا تھا کہ یہ بہت بھاری تھی اور شاید لوہے کا ایک ٹھوس جسم تھی۔ اس اندرونی لوہے کے گولے پر ایک موٹی تہہ بہت گرم بگھلتے ہوئی چٹانوں کی تھی اور اس تہہ کے اوپر زمین کی وہ پپڑی تھی جس پر انسان رہتے تھے۔ نشیبی حصہ پانی سے ڈھکا تھا جس کو سمندر کا نام دیا گیا تھا۔

نقشے پر پانی کا نیلا رنگ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا۔ سمندروں کا گہرا نیلا اتھاہ پانی ساتھ ہی اسے اداس بھی کر دیتا۔

پہاڑ اسے ہمیشہ پر اسرار، افسردہ مگر قوت استقلال سے بھرے ہوئے نظر آتے۔ وہ زمین کو سایہ دار قناتوں کی طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ پہاڑ دو قدرتی خطوں کو جدا بھی کرتے تھے مگر یہ کہنا آسان نہ تھا کہ کہاں ایک قدرتی خطہ ختم ہوتا ہے اور کہاں دوسرا شروع ہوتا ہے۔ اونچی سرزمین پہاڑیوں سے آہستہ آہستہ ڈھالو ہوتی ہوئی خشک ہو کر ریگستان میں بدل جاتی تھی۔

اسے نقشے میں یہ سب دیکھ کر بہت الجھن ہوتی تھی کہ ہر چند ایک خط نقشے میں دو قدرتی خطوں کو الگ کرتا ہے مگر درحقیقت یہ کہنا مشکل ہے کہ خط کہاں سے کھینچا جائے۔ اس کی یہ الجھن کبھی کبھی اتنی بڑھتی کہ ناک کے بائیں نتھنے سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا۔

اور پھر وہ زلزلے بھی تو تھے جو زمین کے اندر ایک اندھیری تنہا دراز پیدا کر کے اس کے ہی وجود کے ایک حصے کو دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیتے تھے۔ مختلف براعظم جو کبھی ایک تھے، صرف ان بھیانک اور بدنیت زلزلوں کی ہی دین تھے۔ ایک حصہ کھسکنے لگتا تھا، خاموشی کے ساتھ کہیں اور چلے جانے کے لیے۔ مگر اسے خوف نہ زلزلوں سے آتا نہ ان خوفناک کالی آندھیوں سے جو کچھ دیر کے لیے نہ صرف دنیا کو تاریک کر دیتی تھیں بلکہ اس کا مقدر ہی بدل کر رکھ دیتی تھیں۔ اسے چندن کے جنگلوں سے بھی ڈر لگتا جن پر مشہور ہے کہ صد سالہ بوڑھے سانپ دبلے ہو کر اڑتے ہوئے آتے ہیں۔ کمزور، بوڑھے اور مہیب حد تک دبلے پتلے نہ جانے

کہاں سے اپنے تاریک اور سنسان بلوں کو اور بھی ویران کر کے چندن کے درختوں سے آکر چمٹ جاتے ہیں۔ ان سانپوں کے جسم سے چھو کر آنے والی ہوا انسان اور چرند پرند سب کے لہو کو منجمد کیے دیتی ہے، لقوہ مارے دیتی ہے۔ یہ موت کی زہریلی خوش بو ہے۔ وہ اکثر نقشے میں چندن کے درختوں اور ان پر لپٹے دبلے بوڑھے سانپوں کو تلاش کرنے کی بے معنی اور ناکام کوشش کرتا۔

یوں تو دنیا کا، بلکہ کسی بھی ملک کا پھیلا ہوا نقشہ اس کے لیے طمانیت کا باعث تھا مگر پھر بھی وہ اکثر نقشے میں مشرقی ہمالیہ کے ان خطوں کو تلاش کرنے لگتا جہاں کے باشندے جنگل کے ایک چھوٹے سے حصے کو جلا ڈالتے ہیں۔ اس جلے ہوئے جنگل کی راکھ کچھ عرصے کے لیے وہاں کی مٹی کو زرخیز بنا دیتی ہے۔ وہ سوچتا کہ پہاڑ کی ڈھلانوں پر جلتے ہوئے جنگل کی روشنی دور سے بہت خوب صورت نظر آتی ہوگی، مگر خوب صورتی کی اپنی ایک نجی دہشت بھی تو ہوتی ہے۔

نقشے میں ہی اکثر وہ ایسی جگہیں یا نقطے تلاش کرنے کی تگ و دو میں بھی لگا رہتا جو اس لیے وہاں نظر آنا ممکن نہ تھے کہ یا تو نقشے کا سائز ایسے مقامات کے لیے چھوٹا پڑ جاتا تھا یا اس کا کاغذ میلا اور گھس گیا تھا۔ مثال کے طور پر بلند کوہستانوں کی وہ گہری، بے سراغ تاریک وادیاں جن میں پرندے نہ جانے کون سے پر اسرار دکھ اور نا قابل فہم مایوسی سے تنگ آ کر گر گر کر خودکشی کرتے تھے۔ مگر وہ موہوم نقطے نقشے پر ہمیشہ ندارد رہے۔ ایسے وقت اسے اپنا سارا بایاں جسم چیونٹیوں اور خارش کی زد میں آیا ہوا محسوس ہوتا۔

اگرچہ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ سب بدل رہے تھے۔ یعنی سردی، گرمی میں تبدیلی آ رہی تھی۔ تمام ندیوں کے مآخذ سکڑتے جا رہے تھے۔ برف کے تودوں نے اپنا راستہ بدلا تھا۔ میدانی علاقوں میں مانسون اجاڑ منھ لیے سنکیوں کی طرح بھٹکتا تھا۔ وہ بارش بھی نہ جانے کب سے نہیں ہوئی تھی جو تاریخ کو دھو کر جنگل کو ہرا کر دیتی ہے۔ یعنی اشیا ٹھیک ٹھیک اپنی پٹری پر نہیں چل رہی تھیں۔ مگر بہر حال یہ تشفی بخش تھا کہ وہ سب اس زمین پر موجود تھے۔ کم از کم ابھی تو ان کے ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ مثال کے لیے وہ آتش فشاں بھی تو تھے جو اپنی آگ اگل کر

تھک کر سو گئے تھے۔ وہ قبروں کی مانند تھے۔ ان کے دہانوں پر جھاڑیاں اور پودے اگ آئے تھے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی جھیلیں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ اب ویران پڑے تھے اور اس لیے وہاں آبادی بسنا شروع ہو گئی تھی۔ جس طرح قبرستان کے آس پاس بازار لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ مگر کون وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ اب دوبارہ نہ زندہ ہو سکیں گے؟

جغرافیہ کا وہ ایک بوسیدہ سا رنگین نقشہ کیا تھا، ایک بجی سجائی محفل، ایک بُقعۂ نور اور ایک کارنیوال جیسا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

جب وہ تھک جاتا اور اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بجنا شروع ہو جاتیں تو گیاہستان اور وسیع و عریض کوہستانی جنگل اس پر اپنا سایہ کرنے لگتے۔ جنوبی مغربی مانسون اپنی پوری قوت کے ساتھ چلتا ہوا آتا اور پہاڑ کی چوٹیوں سے ٹکرا کر سفید کہرے میں بدل جاتا۔ طوفانی بارش اور گرج چمک میں وہ ایک جوگی کی طرح آسن مارے بیٹھا رہتا اور اس کے بائیں جسم پر ابھرے ہوئے گرمی دانے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جاتے۔

یا کبھی کبھی وہ خود کو شان دار، خوب صورت اور گھنے چیڑ کے درختوں میں چکر کھاتا محسوس کرتا۔ ان درختوں کے نیچے زمین پر بھورے پھول پھیلتے رہتے جن کی خوش بو اس کے دم کو تازہ کر دیتی۔ جب وہ اور قریب سے گزرتا تو اسے نظر آتا کہ جہاں کہیں چیڑ کے درخت کا چیڑا اکھڑ گیا ہے وہیں پر گاڑھا گوند نکل کر سطح پر جم گیا ہے۔

وہ نقشے پر پنسل پھیرتے وقت اکثر کسی پہاڑی چشمے کے کنارے کنارے بہت سے جھرنوں اور دونوں اطراف کے گھنے جنگلوں کا دشوار گزار سفر طے کرتا ہوا بہت بلندی پر پہنچ جاتا جہاں ہوا بہت ٹھنڈی تھی، چشمے کا پانی بھی برف تھا۔ وہ دیکھتا کہ چشمہ برف کے ڈھیر میں بنے ہوئے ایک سوراخ سے بہہ رہا تھا، پہاڑ کی بلندیوں تک برف ایک دریا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ یہ منجمد دریا گلیشیر تھا۔ کچھ قومیں بھی ایسی ہی تھیں۔ تاریخ میں ہرگز نہیں بلکہ صرف زمین پر، جو منجمد نظر آتی تھیں، اس گلیشیر کی طرح۔ مگر یہ آہستہ آہستہ بلندیوں سے نیچے کھسکتا ہوا، لڑھکتا ہوا اور پگھلتا ہوا دریا کی شکل میں بدل رہا ہے۔ کتنی قومیں اسی طرح جلا وطن ہوتی جاتی ہیں بغیر جلا وطنی کے احساس کے۔ ندیوں میں بدل کر بھی ان کا مقدر اختتام تک نہیں پہنچتا۔ دنیا کے اوپر بہتی ہوئی، جاتی ہوئی، پیچ در پیچ تنگ گھاٹیوں سے نکلتی ہوئی ندیاں جن کا دراصل کوئی وطن نہ تھا۔

ہاں، چٹانوں کے بارے میں سوچ کر وہ اداس ہو جاتا۔ پہاڑ رفتہ رفتہ گھس رہے تھے۔ تغیر آہستہ آہستہ مگر مسلسل ہو رہا تھا۔ سمندر ان چمکتے پہاڑوں سے بھر رہا تھا۔ کچھ چٹانیں ٹوٹ رہی تھیں تو کچھ بن رہی تھیں۔ افسوس کہ سب چٹانوں کی عمر ایک نہ تھی۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ خطرناک چیزوں سے بھی انس تھا۔ مثلاً اپنی حرکات سے چٹانوں کو موڑ دینے اور زمین کی سطح پر بڑی بڑی جھریاں ڈال دینے والے ہول ناک زلزلے یا ریگستانوں میں چلنے والی دھول بھری آندھیاں اور ساحلی علاقوں میں آنے والے سخت اور بھیانک طوفان۔ ان سب سے اس کا بے حد رومانی تعلق تھا۔

مگر سب سے زیادہ رومان تو وہاں تھا اور وہی سب سے خوب صورت، سب سے نیک اور سب سے زیادہ بااخلاق بھی تھے یعنی جنگل۔ طرح طرح کے جنگل۔ سخت بارش ہونے والے علاقوں میں سال بھر ہرے بھرے رہنے والے سدا بہار جنگل، یا خود کو سورج کی گرمی سے بچانے کے واسطے اپنی پتیاں خاموشی سے گرا دینے والے اداس مانسونی جنگل، برائے نام بارش والے علاقوں میں خار دار جھاڑیوں والے بیمار جنگل، یا بہت زیادہ اونچائی پر پائے جانے والے چوڑی پتیوں اور بغیر شاخوں والے درختوں سے بنے ہوئے اور رعونت سے بھرے ہوئے جنگل۔ وہ ان جنگلوں میں خوش ہو ہو کر راستہ بھول جاتا اور ان کی ہواؤں میں اس کا بایاں جسم جھومنے لگتا۔

تو یہ تھی ایک بجی سجائی محفل جہاں وہ خود اپنے وجود سے بھی کب کا بیگانہ ہو چکا تھا۔

(۴)

یقیناً یہ سچ تھا کہ اپنی تمام زندگی میں اس نے شہر سے باہر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ محلے تک سے باہر نکلنے کا اتفاق برسوں میں ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب دورہ پڑتا تو مدرسے والوں کو اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر تک بھی چھوڑنا پڑتا تھا۔ دورے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب پڑ جائے گا۔ مرنے سے پہلے (اس کی ماں اسے پیدا کرنے کے ایک سال بعد ہی چل بسی تھی)

ایک بار اس کی ماں نے اس کے باپ کو بتایا تھا کہ ایک رات اسے دودھ پلانے کے بعد جب وہ اسے سیدھا کر کے بستر پر اپنے برابر لٹا رہی تھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے کا بایاں حصہ بری طرح چمک رہا ہے۔ وہاں ایسی روشنی تھی جیسے ہزارہا چراغ جل رہے ہیں۔ کچھ ایسے چراغ جن سے چہرے کو آگ بھی لگ سکتی تھی۔ اس شیر خوار بچے کا چہرہ بے حد سنجیدہ سا نظر آتا تھا مگر اس کے ہونٹوں سے جھاگ اڑ رہے تھے، اور چہرے کی سنجیدگی قہر آلودگی میں بدلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ اور پیر کو بری طرح اینٹھ رہا تھا۔

لیکن اس کے باپ کو اس واقعے پر یقین نہ آیا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ان دوروں کی دوبارہ شروعات باپ کے مرنے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ اس کی بہن جو اس سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی، ان دوروں کے بارے میں سب سے زیادہ جانتی تھی۔ ان دوروں کو پوری طرح پاگل پن قرار نہیں دیا جا سکتا تھا، اس کی بہن جو محسوس کرتی وہ صرف یہ تھا کہ وہ چڑچڑا سا ہو جاتا تھا۔ بائیں طرف کا چہرہ بری طرح لال نظر آنے لگتا تھا اور اس پر ایک قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی جو دیکھنے میں اچھی نہیں لگتی تھی اور اسی پر اسرار یا خطرناک بلکہ ہلاکت خیز شے کی طرف اشارہ کرتی تھی کیوں کہ ایسے وقت میں اس کے چہرے کا دایاں حصہ ویران اور تاریک پڑا ہوتا۔ دوسری اہم بات اس دورے میں یہ تھی کہ چلتے وقت ایسا صاف طور پر محسوس ہوتا جیسے اس کے بائیں اور دائیں جسم کے درمیان ایک کشتی سی جاری ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ان دوروں میں وہ قاعدے سے چل نہیں پاتا تھا اور لوگوں کو اسے پکڑ پکڑ کر گھر تک چھوڑنا پڑتا تھا۔ مگر یہ دورے بہت مختصر سی مدت کے ہی ہوتے۔ ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ گھر میں سوائے غربت کے اور کوئی شے نہ تھی۔ بہن کے پاس کچھ روپیہ تھا جو اس نے اپنے حج پر جانے کے لیے پس انداز کر رکھا تھا۔

ایک دفعہ اس کی بہن اسے شاہ دانہ صاحب کے مزار پر ضرور لے گئی تھی۔ وہاں اس کے بائیں جسم پر آسیب کا سایہ بتایا گیا تھا۔ وہ مزار پر جا کر بری طرح افسردہ ہو جایا کرتا۔ وہاں اگر بتی کے دھوئیں، خوش بو، پھول اور شیرینی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ قوالیوں کے شور میں خاموش

بیٹھا خالی خالی نظروں سے مزار پر چڑھی ہوئی چادروں کو دیکھتا رہتا تھا۔ بہن اسے دم کیا ہوا پانی پلاتی، بازو پر تعویذ باندھتی۔ مگر کئی بار مزار پر حاضری دینے کے بعد بھی اس کے دورے یا بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

بہن نے اپنی تمام زندگی اس کے ساتھ رہ کر گزار دی تھی۔ بہت پہلے ایک بار جب اس کی عمر چودہ سال کی تھی تو گھر میں آنے جانے والے ایک رشتے کے بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس وقت شاید اس کی بہن کے دل میں کچھ امنگیں جاگ اٹھی تھیں، مگر ٹھیک اسی وقت وہ گھر میں آ گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے تھپڑ مارتے مارتے بہن کا منھ زخمی کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے بہن کے دل کے تمام ارمان اور امنگیں ہمیشہ کے لیے پتہ نہیں کہاں جا کر دفن ہو گئے۔ وہ وقت سے پہلے ہی بے حد بوڑھی نظر آنے لگی اور تقریباً ہر وقت قرآن شریف پڑھتے رہنے کے سوا اس کی کوئی دوسری خاص مصروفیت نہیں رہی۔

اس گھر میں واقعی قرآن شریف کتنے تھے؟

اس وقت بھی جب کھڑکی پر کھڑا وہ اپنی تحریر کو محویت کے ساتھ پڑھ رہا تھا تو ایک بڑا سا قرآن شریف ٹھیک اس کے سر پر بنے ہوئے مچان پر رکھا تھا۔

''میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ بدنیت حاسد مکھی کی طرح اس پر بھنبھنا رہی ہے، اسے ناپاک کرتی ہوئی۔ آپ کو اسے بھگانا پڑے گا، جغرافیہ کو خالص طور پر محسوس کرنے کے لیے اپنے شعور کے تمام مفروضوں کو، تمام مغالطوں کو، ایک طرف قوسین میں رکھنا ہوگا تاکہ اسے بالکل اسی طرح سمجھا جا سکے جس طرح آلۂ حواس اسے محسوس کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے انسان ایک ننگے پستان کے سامنے تھرتھراتا ہے۔

''یہ سب کام لفظوں کے ذریعے ہی ممکن ہے، مگر صرف تحریری لفظ ہی یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے، کیوں کہ بولا گیا لفظ نہ دایاں ہوتا ہے نہ بایاں اور ساری غلط فہمیاں یا خوش فہمیاں لکھے گئے لفظ کے ذریعے ہی تشکیل پاتی ہیں۔ اس سے یہ بات مجھے پریشان کر رہی ہے مگر ساتھ ہی یہ بہت معنی خیز بھی ہے کہ دائیں ہاتھ سے لکھتے وقت الفاظ میری نافرمانی کیوں کرنے لگے ہیں؟

اگرچہ میں اس نافرمانی کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں ہوں پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ میری روح کے کسی جز کا مذاق بنا رہے ہیں، اسے چھیڑنے پر شہد کی مکھیوں کا ڈگارا اسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔

''میرا وجود بھی اب لفظوں کے ساتھ اس طرح اڑا پھرتا ہے جیسے شہد کی مکھیوں کا ڈگارا۔ وجود میرے جسم کو بھول جاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کا خالی ویران بدنما چھتا کسی پیڑ کی شاخ میں اٹکا ہوا، کسی دروازے کے بدرنگ کواڑ کے کونے میں چپکا ہوا میرا ضدی اور خودسر وجود موذی شہد کی مکھیوں کی طرح لفظوں کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ لفظ جو شعور کی دھند میں دائروں کی طرح گھوم رہے ہیں، ہواؤں کے شانوں پر بیٹھے الفاظ یوں ہی تفریح بازی میں مصروف ہیں کہ اچانک میری ضرب ان پر پڑتی ہے۔

''تب یہ جسم، ایک خالی چھتا، ایک بدرنگ سفیدی سے بنا ہوا خانہ دار اجسام، بس کپکپاتا رہتا ہے، ڈولتا رہتا ہے۔ جسم کی پرچھائیں کی طرح۔ خالی ویران چھتے میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں۔ بس وہ ننگی شاخوں پر ناچتا ہے کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔

''انھیں واپس آنا ہوگا۔ لفظوں کو اپنی اصل شکل کی طرف۔ ورنہ میں ڈنک مار مار کر ان کا چہرہ اس طرح سُوجا دوں گا جس طرح شہد کی مکھی اپنے چھیڑنے والے کو ڈس کر سُوجا دیتی ہے۔

''دائیں بائیں میں اتنا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دھوکے بازی ہے۔ آخر بایاں اور دایاں ہے کیا؟ کیا ادھر دوسری روح ہے اور ادھر دوسری؟

''بائیں روح۔ دائیں روح؟''

اس کے بائیں کان سے رطوبت بہہ رہی تھی اور اس میں زور زور سے سیٹیاں بج رہی تھیں۔ یہ جسم کا پیچیدہ جغرافیہ تھا۔

(۵)

''تو بائیں طرف چلنا کیوں اچھا ہے؟'' بچے نے باپ سے پوچھا تھا۔

''امن وامان کے لیے۔'' باپ نے جواب دیا تھا۔

''امن وامان کے لیے۔ امن وامان کے لیے۔'' بچے نے دہرایا تھا۔

ہر قسم کے جغرافیائی نقشے کا علم یوں اسے بھرپور تھا اور نقشے کی باریک سے باریک تکنیک کو وہ مکمل طور پر جانتا تھا۔ نقشہ اس کے لیے آئینے کی طرح تھا جس پر جھک کر وہ گویا اپنا چہرہ تکتا رہتا تھا۔ کسی جھیل کے کنارے نہیں، بلکہ اپنے میلے سے بستر پر بیٹھ کر، یہ نرگسیت تھی مگر معکوس۔

مگر پھر بھی پتہ نہیں کیوں، کبھی کبھی مشرق اور مغرب کی سمت کا تعین وہ نہ کر پاتا۔ وہ مشرق خطوں کو کبھی کبھی مغرب میں تلاش کرنے لگتا تھا۔ ایک سیدھا سا اصول ویسے تو یہ تھا کہ مغربی خطے ہمیشہ اس کے بائیں ہاتھ پر رہتے تھے مگر پتہ نہیں کیوں وہ انھیں دائیں ہاتھ پر تلاش کرنے لگتا تھا، حالاں کہ اس قسم کا مغالطہ تو اسے ویسے بھی ہوتا ہی رہتا تھا۔ ان دنوں میں بھی، جب اس پر وہ دورے نہیں پڑا کرتے تھے۔ وہ سیدھا، منھ اٹھائے اپنے گھر کو جارہا ہوتا، اچانک وہ تمام درخت، مکانات، دوکانیں اور ان کے سائن بورڈ اس کے لیے الٹے ہاتھ کی طرف پڑنے لگتے جو دراصل اس کے دائیں ہاتھ کی طرف تھے۔ یہاں تک کہ پانی کا وہ نل بھی جو اس کی گلی کے موڑ پر تھا کبھی تو دائیں طرف آجاتا اور کبھی بائیں طرف۔

مگر مسجد کے گنبد اور میناروں سے راستہ بھولنے کا یا بھٹک جانے کا اندیشہ تقریباً ختم ہوجاتا کیوں کہ وہ بہت دور سے ہی نظر آجاتے۔ مگر یہاں بھی وہ مسئلہ تو برقرار تھا کہ مسجدیں جو اس نے زیادہ تر بائیں ہاتھ کی طرف دیکھی تھیں اور ان کے بائیں ہاتھ کی طرف ہونے کا اس کا یقین بھی تھا اچانک کسی نامعلوم طاقت کے زیر اثر دائیں ہاتھ پر نمودار ہوجاتیں۔ یہ الجھن اس کے لیے بے حد ذاتی نوعیت کی تھی اور ایک آدھ بار اپنی بہن کو اس بارے میں بتادینے کے علاوہ وہ کسی کو اس میں شریک نہ کرسکا تھا۔

مدرسے کے عقب میں جاتی ہوئی پتلی ویران سڑک کے کنارے وہ تالاب اسے پسند تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سارے تالاب اسے بہت پسند تھے اور وہ ان کو دیکھنے کے لیے محلے سے نکل کر آس پاس مضافات میں بھی چلا جاتا۔ ایسے تالاب اسے بہت پراسرار نظر آتے جن میں جل کبھی اگ آئی ہو۔ ان کی دلدل لامتناہی امکانات سے بھر کر آسیب زدہ سی ہوجاتی تھی۔ وہ

ندیاں بھی اسے بہت زیادہ پسند تھیں جن کے بہاؤ کو ادھر ادھر روک کر ان میں سنگھاڑے کی بیلیں اگادی جاتیں۔ مگر یہ منظر دیکھنے کے لیے اسے جاڑوں کی شروعات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا جب صبح اور شام دونوں پر نامعلوم سی افسردہ دھند چھانا شروع ہوجاتی۔ اسی زمانے وہ راستہ بھولا کرتا۔ مگر شاید یہ راستہ بھولنا نہیں تھا بلکہ صرف دائیں اور بائیں کا فرق فراموش کرجانا تھا اور اس کا انجام یہ تھا کہ جل کھمبی سے پٹے ہوئے سبز تالاب اور سنگھاڑے کی بیلوں سے ڈھکی کم زور ندیاں کبھی دائیں تو کبھی بائیں نمودار ہوکر شیطنت سے اسے چڑاتی بھی رہتیں اور اپنے متحرک امکانات کی آسیبیت سے اسے دہشت زدہ بھی کرتی رہتیں۔

اور یہ واقعی دہشت ہی کی بات تھی کہ اس کا منھ ناک کی سیدھ میں اپنے گھر کی طرف ہوتا، مگر اچانک اسے احساس ہوتا کہ وہ تو گھر سے دور بہت دور اس کی طرف سے پیٹھ کیے مخالف سمت میں کہیں چلا جارہا تھا۔

حواس باختہ ہوکر بھٹکتے رہنے کے بعد آخرکار جب اپنے گھر کی چوکھٹ اسے نظر آتی تب جاکر اس پر اپنے مغالطے کا بھید کھلتا۔

''سنو آج پھر میرے ساتھ وہی ہوا۔'' وہ اعصاب زدہ ہوکر بہن سے کہتا۔

''کیا ہوا؟'' بہن گھبرا کر سوال کرتی۔

''وہ تالاب پھر ادھر کو پڑا۔'' وہ بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرتا۔

''تمھارا منھ کدھر کو تھا؟''

''گھر کی طرف۔''

اور تب بہن اسے 'مت کنے' کے بارے میں بتاتی۔ 'مت کنا' بھی شیطان کی ہی قسم ہے۔ روزِ اول سے اس کے مقدر میں ایک ہی کام لکھ دیا گیا ہے۔ سفر پر نکلے ہوئے لوگوں یا راہ گیروں کو اپنی راہ سے بھٹکا دینا۔ یہ ایک کمزور اور چھچھورا شیطان ہے جو کبھی بھی بہت زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوتا۔ بس وہ راستہ چلتے آدمی کے کہیں سے بھی پیچھے پڑ سکتا ہے۔ دبے پاؤں خاموشی کے ساتھ۔

''تمھارے پیچھے 'مت کنا' لگ گیا ہوگا۔'' بہن اطمینان سے فیصلہ سناتی۔

مگر افسوس کہ لاکھ پیچھے مڑمڑ کر دیکھنے پر بھی آج تک کوئی 'مت کنا' اسے کبھی نظر نہ آسکا۔

جہاں تک نقشے پر طول البلد اور عرض البلد یا خطِ سرطان اور خطِ استوا کا سوال تھا تو اس سلسلے میں اس کا ذہن بالکل صاف تھا۔ اور مقامی وقت کی بابت تو بچپن سے ہی اس نے یہ شعر نما کہاوت ذہن نشین کر رکھی تھی کہ ''مشرق میں جاؤ تو وہ وقت کم ہے، مغرب میں جاؤ تو وہ وقت زیادہ ہے۔'' یہ کتنی شان دار بات تھی کہ وقت کی اس معمولی سی پیچیدگی کو حل کرنے کے بعد مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے تضادات اور مسائل اس کی نظروں میں ہیچ اور مضحکہ خیز بن کر رہ گئے تھے۔

اس نے دائیں ہاتھ سے لکھا۔

''آخر بایاں، دایاں: دایاں، بایاں ہے کیا؟''

''دائیں ہاتھ سے اتنا لکھنے کے باوجود وہاں نہ کوئی درد ہے نہ اکڑن کا احساس۔ انگلیاں جیسے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ رہی ہیں اور میرے ساتھ مسئلہ اب یہ نہیں رہا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا۔ مسئلہ یہ درپیش آیا ہے کہ دائیں ہاتھ سے جو لکھا جارہا ہے وہ کسی چھلاوے کی طرح میرے ضمیر اور میری روح پر چپت رسید کرتا ہوا دور بھاگتا جارہا ہے، غائب ہورہا ہے۔ یہ سب اس طرح ہورہا ہے جیسے کوئی جنگ چل رہی ہو۔ مگر جنگ کن کے درمیان؟

''شاید دائیں اور بائیں کے درمیان۔ مگر آخر کیوں؟ کیا میں کسی موسیقی کے ساتھ کوئی گڑ بڑ کر رہا ہوں، کیا میں کسی سر کو غلط لگا رہا ہوں؟ یقیناً میں ایک غلط رقص کر رہا ہوں اور میرے بھاؤ اور مدرائیں ضرورت سے زیادہ دائیں ہوتی جارہی ہیں۔ اس طرح یہ رقص ایک ہول ناک اور اندھیری دنیا کی طرف جھکتا جارہا ہے۔ افسوس کہ لفظوں کی ظاہری شکل وہی ہے۔ یہاں تک کہ خطِ نستعلیق، خطِ نسخ میں بھی بدلتا نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی یہ خطِ مرموز ہے۔ یہاں کوئی رمز نہیں ہے۔

''کیا دنیا کی ساری سیاست اسی طرح بدعنوانی، مکاری اور تشدد میں بدل جاتی ہے اور محبت، نفرت میں؟ اس طرح کہ لفظ اور حرف اسی طرح پڑھا جاتا اسی طرح لکھا جاتا ہے مگر

محبت، نفرت کی طرح محسوس کی جاتی ہے اور انصاف سنگین جرم کی طرح؟

''یہ درست ہے کہ الفاظ ہی سب کو تحفظ بخشتے ہیں ۔ مگر کیا تحفظ کے بدلے آپ اپنے شعور کا سودا کرلیں گے اور لافانی ہونے کے لیے اپنی آتما کا سودا؟ یہ لین دین فاؤسٹ کے شیطان کے ساتھ ہی ممکن ہے، شیطان جس کا اپنا محاورہ ہے اور اپنا روزہ مرہ۔ دائیں ہاتھ سے لکھنے پر یہ محاورہ بلند آواز میں سنائی پڑتا ہے۔ لفظوں سے ایک کمینہ بھیانک ہوا نکلتی ہے جو سب کچھ مسخ کردینے سے زیادہ سب کچھ دوسری طرح سے مستحکم کرنا چاہتی ہے۔ اور دراصل یہی اصل اور سب سے زیادہ بری بات ہے۔

''شاید اسی لیے تاریخی شعور سے بڑی حماقت دوسری کوئی نہیں ہوسکتی۔ واقعات کو یاد رکھنے میں ہی اصل عیب پوشیدہ ہے۔ ورنہ واقعات کی خود اپنے آپ میں کوئی اہمیت نہیں۔ مذہب اور تاریخ دونوں ہی زمین کے گلے میں پڑے ہوئے ڈراؤنے ہڈیوں کے ہار کے مانند ہیں۔ ان کی وجہ سے زمین کا چہرہ اپنے پورے جغرافیہ سمیت ایک بھوت کی طرح نظر آنے لگا ہے۔ اس ہڈیوں کے ہار کو زمین کے گلے سے کھینچ کر الگ کرنا ہوگا۔

''مگر اس کے لیے ایک لمبی بارش کا انتظار کرنا ہے۔ ایک طویل بارش جو تب تک ہوتی رہے گی جب تک یہ خوف ناک ہڈیاں گل کر نہ بکھر جائیں اور دنیا اپنے خالص، نیک اور دل فریب جغرافیے کے ساتھ محسوس کی جاسکے۔

''مگر افسوس کہ فی الحال یہ سب لکھنا ایک بھیانک تضاد کے سوا کچھ نہیں۔ دماغ کا بھی بٹوارہ ہوچکا ہے۔ یہ الفاظ بائیں ہاتھ سے چھوٹ کر اپنی منطقی قوت زائل کرچکے ہیں۔ اب دائیں دماغ کا کمینہ پن ہے۔ وہ بہت پرانا ہے۔ اور پر اسرار بھی۔ وہ گونگا ہے اور صرف استعارے کی زبان سمجھتا ہے۔ استعارہ جس نے دنیا میں سب سے زیادہ گڑبڑ پیدا کی ہے۔ وہ چھچھوندر کے مانند ہے جس کی بدبو اور کراہیت اس سے آگے آگے چلتی ہے۔ ایک گیلی لج لجی لکیر کی طرح جس کے معنی کچھ نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ کچھ عیش طبع لوگ اسے رمز بلیغ کہہ کر خود بھی آرام سے بدبو خارج کرسکتے ہیں۔''

مگر...... وہ...... وہ بہت بعد میں پیدا ہوا۔ بایاں دماغ بے چارہ نیا تھا۔ کنواری دلہن کی طرح نیا ('پرانا' اور 'نیا' کہنے میں کسی تاریخی شعور کو تلاش کرنا بے سود ہے اور اگر ایسا لگ رہا ہو تو یہ دائیں ہاتھ سے لکھنے کا قصور ہے۔) وہ خودرو گھاس کی طرح اگ آیا۔ پرانے نے نئے کو سارا تاریخی شعور کچرے کی طرح سونپ دیا۔ یہ کیسا تضاد تھا کہ سارا تاریخی شعور بائیں طرف پڑا ہوا مر رہا تھا۔ سڑ رہا تھا۔

تو انسانی دماغ، انسانی روح کا بٹوارہ ہوچکا تھا۔ صرف چھپکلیاں سالم و ثابت رہ گئی تھیں۔ ان کے پاس وہی پرانا دایاں دماغ تھا جو صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ وہ اس دماغ سے نکل نکل کر اور دیوار پر رینگ رینگ کر ہنستی تھیں۔

اس کے بائیں پیر کی رگ اچانک پھڑکنے لگی۔ وہ لکھتے لکھتے رکا تو کھڑکی کے بدرنگ پٹ پر تکونے سروں اور چوڑے منھ والی ساتھ آٹھ چھپکلیاں نمودار ہوگئیں اور کالی چیونٹیوں کی قطار کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

(۶)

وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔ بے حد دبلا پتلا۔ آنکھیں غیر معمولی حد تک چمک دار مگر پھر بھی افسردہ افسردہ نظر آتی تھیں۔ سر تقریباً گنجا تھا اور اس پر خشکی کی موٹی سی تہہ دار پپڑی جمی ہوئی تھی۔ داڑھی ہمیشہ بے ترتیبی سے بڑھی رہتی جسے دیکھ کر اکثر اس کی بہن کہا کرتی:

''اس سے تو بہتر ہے کہ تم شرعی داڑھی رکھ لو۔ تمھاری شکل ابا سے کتنی ملتی ہے۔ ویسی ہی نورانی اور پاکیزہ۔ اگر تم ان کی طرح داڑھی رکھ لو تو بالکل ابا کی طرح ہی لگو گے۔''

''ابا۔ ابا۔'' وہ بے خیالی میں دہراتا اور بہن اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھنے لگتی۔ ویسے تو اسے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر پتہ نہیں کیوں سال میں کچھ دن ایسے بھی ہوتے تھے جب اس کے پاس سوائے قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے دوسرا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ بھی ایک قسم کا دورہ ہی تھا۔ ان دنوں بہن اس سے بہت خوش نظر آتی مگر جب وہ دھول بھرے مچان سے قرآن شریف کو اٹھانے لگتا تو وہ اسے بری طرح ٹوکتی بھی۔

"اسے سیدھے ہاتھ سے تھام کر قلب سے لگاتے ہوئے احتیاط کے ساتھ اتارو۔ ایسے بے ادبی ہوتی ہے۔ تم اگر چاہتے تو اپنا سارا کام سیدھے ہاتھ سے کر سکتے تھے مگر تم نے ابا کی بات کبھی نہ مانی۔"

اس وقت اپنی بہن کا چہرہ اسے اپنے باپ کی طرح نظر آنے لگتا اور نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوتا جیسے اسے ناقابلِ برداشت حد تک پیشاب لگ رہا تھا۔

ان دنوں آس پاس کے حالات خراب چل رہے تھے، جب بہن کا حج کے لیے بلاوا آ گیا۔

"تم حج کے لیے جارہی ہو! باہر نکل کر دیکھو۔ آدمی جلائے جارہے ہیں۔" اس نے برہمی سے کہا تھا۔

"اگر مجھے موت آنی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا، مگر مدینے والے نے مجھے بلایا ہے۔" بہن نے عقیدت مندی کے ساتھ پر استقلال لہجے میں جواب دیا۔

وہ بہن کو اپنی چمک دار مگر بے حد افسردہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ٹھیک اسی وقت اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس کا چہرہ تبدیل ہوگیا اور اس نے بچوں کی طرح ہمک کر کہا۔

"واپس آکر مرغا پکانا۔ میں سیدھے ہاتھ سے کھالوں گا۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں بہت سا مرغا پکاؤں گی اور چاہے جس ہاتھ سے کھانا۔" بہن نے ممتا سے کہا۔

مگر شاید وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ فرش پر بکھری ہوئی فاتحہ کے سالن کی بوٹیاں تک رہا تھا اور اس کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔

بہن نے حج کے لیے روانہ ہوتے وقت اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ بے اختیار اسے اپنے باپ کے اذان دینے کا انداز یاد آ گیا۔

"خدا تمھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں تمھاری طبیعت کے لیے وہاں دعا کروں گی اور واپسی میں آبِ زم زم بھی لاؤں گی۔"

"دعا۔ دعا۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دہرایا۔

بہن زور زور سے رونے لگی۔

اب رات گزر گئی تھی۔ بہن کو گئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ کھانا اسے مدرسے سے مل جایا کرتا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ابھی تک اسے وہ دورہ نہیں پڑا تھا ہاں ایک دو بار راستہ اور سمت ضرور بھول گیا تھا لیکن ان دنوں جس انداز میں وہ جو کچھ لکھ رہا تھا اسے جنون ضرور قرار دیا جاسکتا تھا۔

جون کی حبس بھری رات۔ اس کا سارا بدن اندر سے کھول رہا تھا مگر مساموں سے پسینے کی ایک بوند بھی نہ ٹپکی تھی۔ پسینہ نہ جانے کہاں راستہ بھول گیا تھا۔ لکھتے لکھتے وہ تھک گیا۔ اس نے کاغذ اور قلم ایک طرف رکھ دیے اور اپنے گندے میلے سے بستر پر اکڑوں بیٹھ کر تکیے کے نیچے سے دنیا کا نقشہ نکال کر اس پر جھک گیا۔ سر پر بہت مدھم روشنی کا بلب ڈوری سے بندھا لٹک رہا تھا۔ اس کی زرد اور بیمار روشنی میں اسے محسوس ہوا جیسے دنیا کے نقشے پر سارا بایاں حصہ سادہ پڑا تھا، سادہ جیسے وہاں کا سب کچھ کسی غیر معمولی طاقت کے زیرِ اثر غائب ہوگیا ہو یا زیرِ زمین چلا گیا ہو۔ اس نے نقشے کی بنیادوں میں اترنے کی کوشش کی۔ مگر نہیں وہاں تو زمین بھی نہ تھی۔ وہاں صرف سناٹا تھا۔ خالص سناٹا۔ زمین سے اور ہر امکان سے خالی سناٹا۔

وہ گھبرا کر اٹھا۔ شاید پلنگ زور زور سے ہل رہا تھا۔

کیا زلزلہ آرہا ہے؟ ایک پل کو اس نے سوچا۔

مگر اس کے حلق میں کوئی شے پھنس رہی تھی اور اسے بخوبی علم تھا کہ اس شے کو کچھ لکھ کر ہی دور کیا جاسکتا تھا۔ اس نے تقریباً جھپٹتے ہوئے قلم کو دوبارہ ہاتھ میں پکڑا۔ بائیں ہاتھ میں۔ مگر وہ قلم پر دباؤ نہ ڈال سکا۔ اس نے جلدی سے قلم کو دائیں ہاتھ میں لے لیا۔ مگر نہیں، اب بے سود تھا۔ حلق میں پھنسی ہوئی شے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ وہ لکھے جانے کا التباس ہی تھا۔ کاغذ پر صرف مکروہ کیڑے رینگ رہے تھے۔ اس رینگن کو وہ اپنے تمام بائیں جسم پر محسوس کر رہا تھا۔

کچھ متلی جیسا بھی تھا۔ مگر یہ کیسی متلی تھی جو صرف حلق سے ہی نہیں، شاید سارے بائیں جسم سے پھوٹ کر باہر آرہی تھی۔ یہ متلی سے زیادہ کوئی خطرناک شے تھی۔

لیکن اس کا دایاں جسم۔ وہاں کوئی بے چینی، کوئی تکلیف اور کوئی الجھن نہ تھی۔ وہاں سب کچھ شانت تھا۔ سمادھی میں گئے ہوئے جوگی کی طرح شانت اور مطمئن اور بے نیاز۔

وہ بہت مایوس ہوگیا مگر یہ ایک ادھوری مایوسی تھی کیوں کہ اس کے چہرے کے بائیں طرف وہی غیر معمولی چمک تھی جیسے وہاں آگ دہک رہی ہو۔ صرف دائیں طرف اندھیرا تھا۔ گہرا اندھیرا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے قریب آ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے قریب آ کر اسے احساس ہوا کہ باہر ایک تیز ہوا چل نکلی ہے۔ ایسی ہوا جس کے پیچھے پیچھے ایک عظیم بارش چلتی ہے۔

''تو کیا وہ بارش آ پہنچی ہے؟'' اس نے خیال کیا۔

ایک بادل بے دلی کے ساتھ آسمان پر پھیل رہا تھا۔ مگر نہیں۔ اس نے غور سے دیکھا اور سمجھ گیا کہ یہ بادل نہیں دھند تھی۔ بادل اور دھند میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کم و بیش دو مختلف سیاستوں جیسا یا دو مختلف مذہبوں جیسا۔ دھند میں پانی کہاں، اور اگر ہو بھی تو اتنا کم کہ اس کے ہونے کا امکان بھر ہی کیا جاسکتا تھا۔ دھند میں مٹیالی دھول اور کالا دھواں گرہ در گرہ سانپوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بھورا بادل نظر آتی تھی۔ وہ اس قسم کی دھند دیکھنے کا عادی ہوگیا تھا اس لیے زیادہ دیر اس پر توجہ صرف نہ کرسکا۔

دور گلی کے بائیں موڑ کے پار، کھیتوں کے بعد بھنگیوں کے مرگھٹ میں ٹین کا شیڈ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس کی آواز رات کے سناٹے میں کرب ناک محسوس ہوئی۔ ہوا سے اس کا پاجامہ سرسرانے لگا۔ کیا یہ ہوا چندن کے درختوں کو چھو کر آرہی تھی؟

دفعتاً اس کا جی بے اختیار زور زور سے رونے کو چاہا۔

نہیں۔ یہ رونے کی خواہش نہ تھی۔ یہ غصے کی ایک بھیانک اور تباہ کن لہر تھی۔ ایک ناقابل یقین غصہ جو اسے اپنے تمام دائیں جسم پر آرہا تھا۔

''یہ کیسا ایک صوفی درویش کی طرح بیگانہ اور بے نیاز بنا ہوا میرے جسم میں آ کر بیٹھ گیا

ہے۔ یہ پورا دایاں۔ ہر تکلیف، ہر دکھ، ہر چوٹ اور ہر احساس سے مبرا، ایک اونچے ممبر پر براجمان گھمنڈی دایاں۔'' وہ بڑبڑایا۔ ساتھ ہی اس کا غصہ اور بھی شدید ہوگیا۔ بائیں کان سے ڈھیری رطوبت بہہ نکلی اور اس کی تپتی ہوئی گردن پر ایک ٹھنڈی لکیر بہنے لگی۔

اچانک اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ فوری طور پر اس کے بائیں ہاتھ میں حیرت انگیز طریقے سے ایک پر اسرار مگر تشدد آمیز طاقت عود کر آئی ہے۔ شاید اس کی پوری بائیں روح غصے سے پاگل ہوگئی ہے۔

وہ کھڑکی سے مڑا۔ ہوا کے ایک جھونکے میں بستر پر پڑا ہوا نقشہ پھڑ پھڑایا۔ ایک پل کو اپنے غصے کو دبانے کی خاطر اس نے سوچا کہ مچان پر سے قرآن شریف اتار کر تلاوت شروع کردے۔ مگر وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہا کیوں کہ اس کا پورا بایاں جسم آپے سے باہر اور دائیں جسم سے کشتی لڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے بائیں چہرے پر آج پھر مدتوں بعد وہی خطرناک چراغ جل رہے تھے۔ اب یہ اس کا آخری داؤں تھا۔ مدتوں سے جاری دائیں اور بائیں کی کشتی میں ہمیشہ چھپا کر رکھا گیا ہوا ایک کمینہ اور ہلاکت انگیز داؤں۔

''نہیں چھوڑوں گا۔ آج اسے جلا کر راکھ کردوں گا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے غرایا۔ اس نے پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کے تیل کی بوتل کو باہر نکالا۔

(۷)

''تو بائیں طرف چلنا کیوں اچھا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''امن و امان کے لیے۔'' باپ نے جواب دیا۔

''امن و امان کے لیے۔ امن و امان کے لیے۔'' اس نے دہرایا۔

وقتی طور پر بے حد طاقتور ہوجانے والے بائیں ہاتھ سے اس نے پہلے مٹی کے تیل کی بوتل کا ڈھکن کھولا پھر حد درجہ احتیاط اور کمال خوبی کے ساتھ تیل کو اپنے سر پر اس طرح انڈیلا کہ تیل کی ایک بوند بھی سر کے بائیں طرف نہ پھیل سکی۔ اس کوشش میں وہ ایک ایسے درخت کی طرح نظر آیا جو کسی آندھی یا نادیدہ طاقت کے زیر اثر دائیں طرف کو جھک رہا ہو۔ مٹی کا تیل

اب سر کی دائیں طرف سے بہتا ہوا نیچے آ گیا یہاں تک کہ پیر کے پنجے پر رسنے لگا۔

باہر ہوا واقعی تیز ہو چلی تھی۔ جھونکے گھر کے اندر چلے آ رہے تھے۔ ان جھونکوں سے اس کے میلے بستر کی چادر اور وہاں بکھرے ہوئے جغرافیہ کے نقشے اڑنے لگے۔ تب اس نے اپنے چالاک اور ہوشیار پُر تشدد بائیں ہاتھ سے دیا سلائی پکڑی۔ اس کا پورا بایاں جسم جاگ رہا تھا، چوکنا، برہم، جوشیلا اور انتقام کے جذبے سے لب ریز۔ اس کے دائیں جسم پر حملہ کرنے، اور اسے فنا کر ڈالنے اور جلا ڈالنے کے لیے بالکل تیار اور چست۔

یہ نہیں پتہ کہ رات کتنی تھی۔ گلی سنسان پڑی تھی۔

گھر کے اندھیرے میں دیا سلائی کا شعلہ چمکا۔

ہاں یقیناً آگ پہلے دائیں طرف ہی لگتی محسوس ہوئی تھی مگر بعد میں اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کدھر سے کدھر کو پھیلی ہوگی۔

وہ بڑی اندوہناک اور ہذیانی چیخیں تھیں۔ اس کا سارا بدن جل رہا تھا۔ وہ گھبرا کر زینے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گھر سے باہر بھاگا۔ محلے کی گلی میں۔ اس کے حلق سے لگا تار ہولناک چیخیں جاری تھیں۔ وہ حواس باختہ ہو کر گلی میں کبھی دائیں تو کبھی بائیں طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے جسم سے آگ کی لپٹیں بلند ہونے لگیں۔

محلے کے چند مکانوں کی اوپری کھڑکیاں کھلیں، پھر فوراً ہی بند ہو گئیں۔ ان دنوں زندہ انسانوں کا اس طرح جلنا ان کے لیے کوئی حیرت انگیز امر نہیں رہ گیا تھا۔ لوگ جلائے ہی جا رہے تھے۔

وہ دراصل پانی کے اس نل کی تلاش میں تھا جو گلی کے بائیں موڑ پر کھمبے کے نیچے لگا ہوا تھا۔ مگر شاید وہ سمت بھول رہا تھا۔ دور آسمان کی گھاٹیوں میں کوندا ہو رہا تھا۔ یہ جنوبی مغربی مانسون آنے کے دن تھے۔ ان دنوں خزاں میں تہلکہ رہتا ہے اور گرج چمک کے طوفان آتے ہیں۔

تیز ہوا کے جھونکوں میں اس کا سارا جسم ایک طویل قامت لپکتا ہوا شعلہ نظر آیا۔ وہ گھبرا کر اپنی جگہ ایک آتشیں بگولے کی طرح تیزی سے گھومنے لگا۔ اس کے آتش بازی جیسے چک

پھیری کرتے ہوئے جسم پر کتے بھونکنے لگے۔

آہستہ آہستہ اس کی ناک کی چربی پگھلنے لگی اور سفید سفید چکنائی اس کے پورے چہرے پر بہنے لگی، اس چکنائی سے اس کے چہرے کے شعلے اور بھی بھڑکے۔ آس پاس چراندھ پھیل گئی۔ اس کے جسم کی ساری کھال سکڑ کر غائب ہونے لگی۔ اس کا دراز قد اچانک بونے میں تبدیل ہونے لگا۔

دفعتاً پھر وہ تیزی کے ساتھ گلی کے بائیں موڑ کی طرف بھاگا، اگیا بیتال کی طرح۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے لگے پانی کے نل کے پاس جا کر وہ زمین پر گر پڑا اور بے تحاشا چلاتا ہوا لوٹیں لگانے لگا۔ کتنے بھونکتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگے۔

پھر شاید ہمت کر کے وہ ایک بار پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ جل رہا تھا۔ اس کے جلتے ہوئے جسم کی روشنی میں اس کا ہیولی اس سے الگ اچھل رہا تھا۔ گلی کچھ دیر روشن ہوئی جیسے کوئی تنہا آدمی وہاں مشعل لیے بھٹک رہا ہو۔ وہ جل رہا تھا۔ دھڑا دھڑ۔ درخت کی طرح نہیں بلکہ پورے جنگل کی طرح۔ اس روشنی میں گلی کے مکان، کھڑکیاں، منڈیریں، نالیوں پر اگی ہوئی خودرو گھاس اور دیواریں بے تکے اور بے معنی انداز میں روشن ہو گئے۔ گھروں کی چھتوں پر تاریخ ایک بد نیت غبی بندر کی طرح استرا ہاتھ میں لیے اپنا گلا کاٹتی نظر آئی۔

اس کے جلتے ہوئے جسم کی روشنی میں یہ سب دیکھنا قطعی مایوس کن تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی وہ ہولناک ہذیانی چیخیں مدھم ہونے لگیں۔ شعلے نیچے ہونے لگے۔ وہ ایک بار گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر پانی کے نل کے نیچے لیٹ گیا۔ چراندھ اور دھوئیں میں لپٹا اس کا راکھ ہوتا ہوا جسم سکڑا سکڑایا، سڑک کے کنارے پڑا تھا۔

آسمان پر کوندا لپکا۔ تیز بوندیں پڑیں۔

وہ جل گیا تھا لیکن اس نے خود کو گہرے نیلے پانیوں میں ڈوبتے محسوس کیا۔ اس نے پانی کی خاموش آواز سنی جو صرف اس لیے محسوس ہوئی کہ وہ اس کے آس پاس پھیلے بے کراں سناٹے سے کچھ زیادہ بلند آہنگ تھیں۔

روشن گلی پھر سے تاریک ہوگئی۔ بس وہاں چراندھ رہ گئی تھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک جغرافیہ اس کی جلی ہوئی آنکھوں کے آگے پرانے مہربان دوست کی طرح آ کر کھڑا ہوگیا۔ سمندر بھی آیا تھا۔ نیلا گہرا سمندر، اس کے راکھ ہوتے ہوئے تلوؤں کو چھوچھو کر سیاہ ہوتا جارہا تھا۔

سب ہی آئے تھے۔ پہاڑ، دریا، ٹیلے، ریگستان اور چندن کے درخت سے لپٹے ہوئے بوڑھے سانپ بھی۔ شاید وہ بارش بھی جس کا اسے ہمیشہ سے انتظار تھا۔

اور تب بڑی نرمی کے ساتھ ٹھنڈے ٹھنڈے چیڑ کے درختوں نے اس کے کوئلہ ہوگئے چہرے کو اپنے سائے میں ڈھک لیا۔

یہ وہی دنیا تھی۔ انسانوں سے یکسر خالی جیسا کہ اس نے ہمیشہ دنیا کو سمجھا تھا۔ بس ایک زمین جس کی زرخیزی جلی ہوئی ہڈیوں اور راکھ سے ہمیشہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔

تفریح کی ایک دوپہر

''دُکھ نے میرے چہرے پر ایک نقاب ڈال دی ہے۔''
''دنیا سے ایک جیو کم ہوجاتا ہے۔''
''آسمان میں ایک فرشتہ بڑھ جاتا ہے۔'' (فرنانڈو پیسوا)

(۱)

یہ مئی کی دوپہر ہے، دو بج رہے ہیں اور لُو بھی چلنا شروع ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری کہانی سننے کے لیے یہی وقت بہترین ہے۔ میں جو کہانی سُنانے جارہا ہوں اس کے مخصوص ترین قاری وہ لوگ ہیں جو دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کریں گے، پھر اُٹھ کر شام کے شو میں سنیما دیکھنے چلے جائیں گے۔ جو لوگ شام کو تفریح یا کچھ خریدنے کی غرض سے بازار جانے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس کہانی کو نہ سُن پائیں گے نہ پڑھ پائیں گے کیونکہ میں اس بات پر مکمل دسترس رکھتا ہوں کہ اُن پر اپنی کہانی کا دروازہ نہ کھولوں۔ دراصل اب اس بات کو زیادہ دیر پوشیدہ رکھنے کا کیا فائدہ کہ میں ایک بھوت ہوں۔ اس کہانی سے آپ کو پہلی بار بھوت کے بارے میں سچا اور مستند علم حاصل ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے مگر اس سے پہلے مجھے چند باتیں گوش گزار کرنا ہیں۔ ان چند باتوں کو آپ ''ایک بھوت کا پیش لفظ'' یا ''عرضِ مصنف'' وغیرہ سمجھ

سکتے ہیں۔

تو پہلی بات تو یہ کہ میں لفظ کی تاریخی حیثیت سے قطعی متاثر نہیں ہوں۔ میں اسے صرف ایک آواز مانتا ہوں اس لیے میں معنی کی نہیں، لے کی تلاش میں ہوں۔ میں زبان کو اپنے ''جاننے'' کی نہیں بلکہ ''اپنے ہونے'' کی زبان بنا رہا ہوں۔ مجھے اس شکل سے نفرت ہے جس کی زبان، سانپ کی طرح ہمیشہ کچھ نہ کچھ جاننے کے لیے باہر لپکی رہتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ میں لفظوں اور آوازوں، دونوں ہی کے انہدام پر آمادہ ہو جاؤں۔

جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ ''لے'' یا ''سُر'' ہی وہ شے ہے جو میرے دل میں ایک ناقابل بیان اور غیر صفاتی معنی کی گونج پیدا کرسکتی ہے۔ اب مجھے آہستہ آہستہ اپنا ''سُر'' لگانا ہے۔ اپنی ''لے'' بنانا ہے۔ اس کے لیے یقیناً مجھے ایک سفر پر نکلنا ہے۔ اپنی موسیقی کے آلات تلاش کرنے کے لیے، یہ ایک خطرناک مہم ہوگی۔ راستہ تاریک ہے اور بھیانک جانوروں کی آوازوں اور خطرناک ترین جغرافیے سے بھرا ہُوا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے جس ''سُر'' کی تلاش ہے اس کے واسطے آلاتِ موسیقی، تو وہیں دبے رہ گئے ہیں، یعنی اُس دلدل میں جہاں آپ کی دنیا کی تہذیب، تاریخ، تمدّن اور اخلاقیات کا کوئی گزر نہیں ہے۔

تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے اُن آلاتِ موسیقی کو تلاش کرنے کے لیے نکلوں جو صدیوں پہلے اُس اندھیری دنیا میں کہیں پڑے رہ گئے تھے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ''بُھوت'' دراصل ہوتا کیا ہے؟ نہیں وہ ضروری تجہیز و تکفین وغیرہ کی بات الگ رکھیں اور توجہ سے سُنیں۔ بُھوت دراصل وہ ''ذہن'' ہے جو دورانِ موت پاگل ہو گیا ہو۔ موت کی تکلیف کو ہر ذہن برداشت نہیں کرسکتا۔ دراصل تھوڑی بہت تفریح کے بغیر انسان کسی بھی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا۔ موت تفریح سے ایک دم خالی ہے۔ یہ ایک قسم کی لامتناہی حیرت ہے اور اُس وقت کا کیا کہنا جب موت کی صورت حال اور اُس کے اسباب بھی شدّت سے ذہن کو حیرت میں ڈال دینے والے ہوں۔

میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں اس حیرت اور تکلیف کو برداشت نہیں کرسکا۔ ویسے بھی میرا ذہن بہت کمزور تھا اور سوائے تفریح کے، کسی جذبے کو بہت زیادہ برداشت کرنے کے قابل تو کبھی نہیں رہا۔ اس طرح کے ذہن موت کے دوران ہی پاگل ہوجاتے ہیں۔ ان کے جسم سے مرنے کے بعد ایک پاگل رُوح مائل بہ پرواز ہوتی ہے۔ اس پاگل رُوح کا مقدر میرا مقدر ہے، یعنی ایک بُھوت کا جس کے بس میں اب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ زندوں کو پریشان کرتا پھرے اور اُن پاک و صاف رُوحوں کو رشک وحسد کے ساتھ دیکھتا رہے جو دوران موت اپنا ذہنی توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں۔

دیکھیے جب بُھوت کہانی بیان کرے گا تو اس میں بے چینی، جھلاّہٹ، کرب، اور بے ربطی کے عناصر ناگزیر ہوجائیں گے۔ اس لیے اس جرم کا احساس مجھے ہے کہ میں لاکھ شعوری کوشش کرنے پر بھی زندہ اور صحت مند لوگوں کی طرح نہیں لکھ پارہا ہوں۔ پھر یہ بھی کہ آپ کے لیے ایک بُھوت کے تجربے، اُس کے شعور اور اس کے منطق کو پوری طرح سمجھ پانا بھی محال ہے۔ اس لیے اس کہانی کی بے ربطی صرف آپ کے لیے ہی بے ربطی ہے، کیونکہ آپ کو کائنات کے بارے یں علم ہی کتنا ہے یا آپ اپنی ٹھوس اور احمقانہ دُنیا سے ماورا جانتے ہی کیا ہیں؟ مجھے کبھی کبھی آپ پر رشک آتا ہے کہ آپ کتنے اعتماد کے ساتھ منطقی جواز، علت و معلول اور لفظ و معنی وغیرہ کے باہمی رشتوں پر مبنی اپنے سماجی، سیاسی اور مذہبی اخلاقی پر فیصلے اور حکم صادر کرتے رہتے ہیں۔ سچ بتاؤں، مجھے سب سے زیادہ چڑچڑاہٹ تو آپ کی ان ہی حرکتوں پر ہوتی ہے جس کے باعث میں کبھی تو راستہ چلتے ہوئے آپ کو سڑک پر پٹخی دے دیتا ہوں اور کبھی آپ کا بچّہ غائب کرکے آپ ہی گھر کی کسی کوٹھری میں رکھے صندوق میں اُسے بند کردیتا ہوں اور آپ تمام دنیا میں اپنا بچّہ تلاش کرتے پھرتے ہیں اور کچھ نہیں تو جھنجھلا کر اندھیری رات میں طرح طرح کی بے تکی اور بھیانک آوازیں نکالا کرتا ہوں۔ (میں یہ ابھی بھی کرکے دکھا سکتا ہوں کیونکہ دراصل میں لکھ یا سُنا نہیں رہا ہوں، بلکہ نوح تھیٹر کے ایک کردار کی طرح کرکے دکھا رہا ہوں۔ ایک ماسک لگا کر جو میرے چہرے کی خالی جگہ پر بھدّے پن سے

جھول رہا ہے۔

مگر ٹھہریے، یہ ''بھیانک'' بھی آپ کی دنیا کا لفظ ہے۔ میری دنیا میں یہ سب فطری اور عام ہے۔ جس طرح آپ شطرنج کھیلتے ہیں، صبح کے ناشتے میں انڈا اور توس لیتے ہیں، کسرت کرتے ہیں یا اپنی محبوبہ کو پیار کرتے ہیں، اس طرح میری یہ حرکات وسکنات بھی بے حد عام اور قطعی طور پر نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں۔

خیر آپ کی دنیا کے الفاظ تو میں نے اپنا لیے ہیں مگر ان سے نکلنے والی آوازوں کو میں کچھ کا کچھ بنا سکنے پر قادر ہوں اور معنی تو...... میرے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتے۔ اب جہاں تک کرداروں کا سوال ہے تو ایک بُھوت کی کردار نگاری کی پہلی شرط تو اس کے ذریعے تشکیل کیے کرداروں کے سروں کا غائب ہونا ہے۔ یعنی میں صرف سَر کٹے کرداروں کے بارے میں ہی بات کرسکتا ہوں اس لیے ان کرداروں میں کسی جھول کا ہونا آپ کے اپنے اُصولوں پر مبنی ہے۔ میں اس سے مّبرا ہوں۔

دوسرے یہ کہ یہ ایک سَنکی سی کہانی بھی ہوسکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سنک اور منطق شعور میں بس بال برابر کا فرق ہے مگر آپ کو یہ فرق سمجھتے سمجھتے زمانہ گزر گیا۔ ویسے میں ایمانداری سے کہہ رہا ہوں کہ کہانی کی وحدت تاثر کو جان بوجھ کر صدمہ نہیں پہنچاؤں گا مگر کہیں کہیں میری فطری بُھوتانہ جھلاہٹ عود کر آئے تو یہ ممکن بھی ہے۔

حضرات، آپ کو یہ سوال کرنے کا پورا حق ہے کہ آخر آپ ایک بُھوت کے ذریعے لکھی گئی کہانی پڑھنے پر مجبور کیوں کیے جائیں؟

توکان کھول کر سُن لیں کہ میرا تو کام ہی آپ کو اُلٹی سیدھی باتوں پر مجبور کرنا ہے، میرے اُوپر آپ کی دنیا کی اخلاقیات کا جادو نہیں چل سکتا۔ مثلاً اگر میں نے آپ کو خوف زدہ کرنے یا زِچ کرنے کی ٹھان لی ہے تو آپ کی کیا مجال کہ مجھے روک سکیں۔

میں یہ بھی یاد دلاتا چلوں کہ میں شیطان نہیں ہوں۔ شیطان کا مقام مجھ سے بہت بلند ہے۔ وہ تو کائنات کی دوسری بڑی طاقت ہے۔ شیطان کی اخلاقیات، بُھوتوں کی اخلاقیات سے اعلیٰ ہے۔ شروع شروع میں شیطان پر لاحول پڑھ کر آپ اُس کو خوف زدہ کر سکتے ہیں مگر بُھوت نہ تو شیطانی اخلاقیات کے پابند ہیں اور نہ الوہی اخلاقیات کے۔ ارے ہم بُھوت تو ایک قسم کے مابعدالطبیعاتی بچّے ہیں۔ ضدی اور بگڑے بچّے جن کے لیے کوئی یتیم خانہ، آشرم، ادارہ اور گھر نہیں۔ ہمیں لاحول پڑھ کر نہیں بلکہ تعویز، گنڈے اور پاک آیات سے ہی دور بھگایا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں سے واقعی ہم کس قدر ڈرتے ہیں لیکن یہ ڈرنا بھی بس کچھ اس طرح کا ہے جیسے ڈھیٹ اور بے حیا بچّوں کو دُور سے بینت دکھایا جائے۔

یا پھر آپ کو خود اپنا ہی دل دہلا دینے والے کچھ سفلی عمل کرنا ہوں گے۔ مثال کے طور پر شمشان گھاٹ جاکر کسی چِتا کی تازہ راکھ پر ایک پیر سے پوری رات کھڑے رہنا، اُلّو کو قتل کر کے اُس کا وظیفہ یاد کرنا یا کالے مرغے کے خون سے بھری تانبے کی بدقلعی بالٹی میں اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن ڈبونا پھر اس خون میں اپنا عکس دیکھنا۔ خیر چھوڑیے۔ ان ترکیبوں کی تو ایک بہت لمبی فہرست ہے۔

مگر ہاں یاد آیا۔ معاف کیجیے گا ایک اور معنی میں شیطان کو مجھ سے خاصی برتری حاصل ہے۔ کبھی کبھی وہ آپ کو لاحول پڑھنے کا موقع ہی نہیں فراہم کرتا۔ وہ آپ کی رُوح کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے اور آپ شیطان کی طرح ہی ہوجاتے ہیں۔

مگر بُھوت۔۔۔ وہ بے چارہ تو صرف آپ کے جسم پر وقتی اُچھل کُود کرسکتا ہے۔ وہ آپ کو بُھوت میں نہیں بدل سکتا اور یہیں سے میری کہانی آپ کے لیے ایک اجنبی دُنیا کی شے بن جاتی ہے۔

سُن لیں کہ شیطان کی دسترس میں یہ بھی ہے کہ وہ خود کو کائنات کے ریشے ریشے میں سما سکتا ہے مگر بُھوت اس بھری پری کائنات میں لاوارثوں کی طرح، صرف بھٹک سکتا ہے۔ وہ خدا اور شیطان دونوں کی سرپرستی اور شفقت سے یکسر محروم ہے۔

اور کیا آپ جانتے ہیں کہ بُھوت کو ختم کر دینا دراصل صرف اس کا بھٹکنا بند کر دینا ہے اور جب کوئی بُھوت مار دیا جاتا ہے تو وہ بھٹکنا بند کر کے اپنے حافظے کے صدر دروازے پر تالہ

لگاکر، دوبارہ ایک انسان بن جاتا ہے۔ تب وہ عزّت کی موت مرتا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین مذہبی اُصولوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ وہ موت کی تکلیف سے پاگل نہیں ہوتا ہے اور چیل کوّے اُس کا گوشت نہیں کھاتے ہیں۔

میرا گوشت چیل کوؤں نے کھایا تھا۔ اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ عرصے تک لوگ یہی سمجھتے رہے کہ اُدھر جھاڑیوں میں کوئی جانور سڑ رہا ہے۔ مرتے وقت میں پاک صاف نہیں تھا۔ مرنے سے تھوڑی دیر پہلے میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہُوا تھا اور طہارت نہیں ہو سکی تھی۔

میں موت کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکا۔ اصل میں وہ موت کی تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرت اور غصّے کی زیادتی کی تکلیف بھی تھی۔ تکلیف، جھنجھلاہٹ اور شاید کچھ سمجھ نہ پانے کے باعث میرا معمولی سا تفریح زدہ ذہن موت کا ساتھ نہ دے سکا۔ ذہن پاگل ہو گیا۔

مگر یہ تو میری کہانی ہے۔ میرے ذریعے لکھی جانے والی کہانی دُوسری ہے مگر ظاہر ہے کہ آپ میری موت کو میری سوانح حیات کا ایک حصّہ بلکہ اختتام اور باقی جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، اُسے کہانی سمجھنے پر حق بجانب ہوں گے۔

مگر ایک گڑبڑ ہو گئی ہے اور میں اسے آپ سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا۔ آپ کو دُنیا کا ایک بدنام قصّہ نویس اس بھیانک تاریک سفر میں میرا تعاقب کر رہا ہے۔ اب مُجھے اپنا ''سُر'' اور ''لے'' تلاش کرنے میں اور مشکل ہو جائے گی۔ یہ کہانی خالص میری نہیں رہے گی۔ یہ جو میرا قصّہ نویس ہے، کہا جاتا ہے کہ کم بخت کہانی میں فلسفیانہ لاف و گزاف سے بہت کام لیتا ہے۔ اس لیے آگاہ کر دوں کہ جہاں آپ کو اس قسم کی باتیں ملیں تو سمجھ لیجیے گا کہ یہ اسی مردود قصّہ نویس کا کام ہے۔ میرا نہیں۔ مجھے دراصل اس پر بے وجہ رحم آ گیا ہے ورنہ میں صرف ایک مُہیب پھنکار نکالوں گا اور یہ بھاگ کھڑا ہوگا۔ ویسے میں تو باقاعدہ کسی عمدہ قصّہ نویس کو کرائے پر لے لیتا جو نہ صرف میری کہانی کو دلچسپ ترین بنا دیتا بلکہ زندگی کے انتہائی روشن پہلو بھی نمایاں کر دیتا۔ یہ بدمذاق قصّہ نویس تو اچھی خاصی شگفتہ اور روشن کہانی میں بھی اُداسی بیماری، مایوسی اور تاریکی وغیرہ کو اس طرح چسپاں کر دیتا ہے جس طرح آج کل گھٹیا قسم کے موسیقار پُرانی فلموں

کے گیتوں کو ''ری مِکس'' کر کے اُنھیں ''پوپ'' بنا دیتے ہیں۔ افسوس میری قسمت میں یہی غبی قصّہ نویس لکھا ہوا تھا۔

میں جو بھی کہہ رہا ہوں، آپ لوگوں کے ذخیرۂ الفاظ سے کام لے کر ہی کہہ رہا ہوں۔ ویسے یہ ذخیرہ الفاظ کبھی تو میرا بھی تھا۔ اب نہیں ہے۔ اب صرف اشارے ہیں مگر خدارا اس کہانی کو ''اشاروں والی کہانی'' نہ سمجھ لیجے گا۔ مجھے علامت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آخر تنتر منتر میں علامتوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟

اب تک آپ نے کم از کم بیس بار سوچا ہوگا کہ اس بُھوت کی لفاظی ہی ختم نہیں ہوتی، آخر ''کہانی'' کہاں ہے؟

تو سُنیے کہ لفظوں کی اس بمباری سے میں جو کچھ تباہ کر رہا ہوں، اور جو پتھر توڑ رہا ہوں اُس کے ملبے کو صاف کر دینے کے بعد ہی صاف و شفاف کہانی کو آپ اپنے سامنے ٹھنڈی میٹھی جھیل کی طرح ٹھاٹھیں مارتے دیکھیں گے۔

(۲)

میں بُھوت بننے کے بعد تفریح کا اور بھی زیادہ شائق ہو گیا ہوں۔ اب کوئی فکر ہی نہیں رہی۔ قبرستان یا کسی مقبرے سے یا کھنڈر سے چمگادڑ بن کر سیدھا اُڑتا ہوا آتا ہوں اور کسی پُرانے سینما گھر کی چھت پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میں بہرحال اُس مشہور زمانہ بُھوت کی خوش نصیبی کی معراج تک تو نہیں پہنچ سکتا جس پر بنائی گئی خوفناک فلموں کا سلسلہ ابھی تک نہیں رُکا ہے اور جب اُس پر بنائی گئی ایک فلم شہر کے ایک سُنسان سے سینما ہال میں دکھائی جا رہی تھی تو وہ خود بھی ہال کے اندھیرے میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ جایا کرتا تھا اور اُداس آنکھوں سے اپنی پرچھائیں تکتا رہتا تھا۔ آپ کو یاد ہے لوگوں نے جب ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کو کُرسی پر بیٹھے فلم دیکھتے پایا تو شہر میں کیسا کہرام مچ گیا تھا؟

میری عمر چودہ یا پندرہ سال رہی ہوگی۔

سینما ہال کے اندھیرے میں اچانک پروین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوپہر کا شو چل رہا تھا۔ ہال کے روشن دانوں سے چھن چھن کر دھوپ کی ایک کرن بھی اندھیرے میں چلی آئی تھی اور پروین کے ہاتھ پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میں تمہارے برابر پڑھوں گی'' وہ آہستہ سے بولی۔

''میں پڑھی ہوئی نہیں ہوں نا۔ اسی لیے تم میرے طرف نہیں دیکھتے۔'' اُس نے میرا ہاتھ دبایا۔ مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ ہال کی تاریکی میں "No exit" اور "No smoking" کے لال حروف روشن تھے۔

اچانک انٹرویل ہوگیا۔ اپیا اور نجّو نے اپنے اپنے برقعے کی نقابیں چہرے پر ڈال لیں۔ لوگ پاگلوں کی طرح سموسے لینے بھاگے۔

پروین نے دوپٹے کی گرہ کھول کر پانچ کا ایک سکّہ نکالا۔

''لو سموسے لے آؤ۔''

پروین کے سانولے ہاتھ باجرے کے آٹے میں گندھے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُن میں اُودی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بالکل گول تھا۔ میں نے کسی لڑکی کا اتنا گول چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔

وہ ایک غریب لڑکی تھی۔ ساریوں پر زردوزی کا کام کر کے اپنا اور اپنی بیمار ماں کا خرچ پورا کیا کرتی تھی۔ وہ پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے چھوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ہڈیاں کہاں تھیں اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہاں صرف گوشت پوست والی گول اور بھری بھری کلائیاں تھیں۔

آخری بار جب میں نے اُسے دیکھا تو اُسے دمہ ہو چکا تھا۔ دمہ اُس کو وراثت میں ملا تھا۔ اُس کی ماں بھی ہمیشہ اپنے خستہ حال گھر کی چوکھٹ پر بیٹھ کر کھانستی اور تھوکتی رہتی تھی۔

دس سال بعد اپنے شہر واپس آنے پر اُس پرانی گلی سے گزرتے وقت میں نے پروین کو کھانستے ہوئے سُنا۔ مئی کی تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ وہ نہ جانے کس کی چوکھٹ پر بیٹھی کھانس رہی تھی۔

اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اُس کا گول چہرہ اُس کی کمزور گردن پر کاغذ کے کوٹھے کی طرح ہل رہا تھا۔ سامنے پڑے گھورے پر ایک کتّے کی لاش سڑ رہی تھی۔ میں نے منھ پر رُومال رکھا۔

اُس نے مجھے اجنبی نظروں سے دیکھا پھر دوسری طرف مُنھ کر کے زور زور سے کھانسنے لگی۔

اُس کی کھانسی بہت دور تک میرے جوتوں کے تلے میں چپک کر ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ تب میں نے جوتوں کو کولتار کی جلتی ہوئی سڑک پر زور سے رگڑ دیا۔

کسی زمانے کے اُس عظیم الشان سینما گھر پر جب کدال چلائی جانے لگی تو اُس کے اندر پچاس سال سے جذب ہوتی آئیں آوازیں آہستہ آہستہ ہوا میں اُڑنے لگیں۔ اُس کی دیواروں میں ڈوبی ہوئی پرچھائیاں اُتر کر اینٹوں، گارے اور مٹی کے ملبے میں کھونے لگیں۔۔۔ اس کا لمبا چوڑا سفید پردہ دُھول خاک میں لپٹا زمین پر گرا پڑا تھا۔ کُرسیاں جن کے گدّوں میں سوراخ تھے، نیلام ہونے والی تھیں اور اُن میں ڈُبکے ہوئے کھٹمل خاموشی سے ہنس رہے تھے۔ وہ سفید پردہ اچانک بھیانک مگر لاچار نظر آیا۔

اسی جگہ اندھیرے میں پروین نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

''میں تمہارے برابر پڑھوں گی۔ سموسے کھاؤ گے۔ آج میری نفری ملی ہے۔ میرے پاس پانچ روپے ہیں۔''

اسی جگہ گھٹیا اور بے تکی فلمیں دیکھ کر میں کتنا رویا تھا۔ پھر خوش ہُوا تھا۔ یہاں کیسی کیسی آوازیں دفن ہیں۔ اداکاروں کے نقلی اور دیکھنے والوں کے اصلی آنسو بھی یہیں دبے پڑے ہیں۔

میری شخصیت کی تشکیل میں سینما سے حاصل ہونے والی تفریح (اور بصیرت؟) کا بہت

دخل رہا تھا۔ اسکول سے بھاگ کر میں یونہی سینما ہال کے سامنے کھڑے ہوکر وہاں دکھائی جانے والی فلم کے پوسٹر دیکھا کرتا تھا۔ پوسٹروں سے مجھے عشق تھا۔ ایک بار جب تیز بارش ہورہی تھی، سینما ہال کی دیوار پر لگا ایک پوسٹر ہوا اور پانی کے زور سے پھڑپھڑانے لگا۔ میں نے سب کی نظروں سے بچا کر اسے دیوار سے الگ کرلیا اور بستے میں رکھ لیا۔ یہ پوسٹر اُس ہیرو کا تھا جو اپنے زمانے میں ٹریجڈی کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔

شام کو جب گھر پر میرے اسکول کے بستے سے وہ بھیگا پوسٹر برآمد ہوا تو بڑے ابا نے اپنا جوتا مجھ پر نکال لیا۔

پوسٹر پر لگی ہوئی تازہ آٹے کی لیی کی بُو میرے چاروں طرف گردش کرنے لگی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کب تک مجرم سا بنا ہوا جوتوں کی اس بارش میں بھیگتا رہا۔

پورا بچپن اسی طرح گزرا۔ سینما میرا دوست تھا۔ اسکول سے بھاگ کر نہ جانے کتنی فلمیں میں نے واپسی کا ٹکٹ لے کر دیکھی تھیں۔ اس زمانے میں واپسی کا ٹکٹ بہت عام تھا۔ اُس کے لیے کرنا صرف یہ ہوتا تھا کہ کوئی بھی شخص جس کی جیب میں فلم دیکھنے کے لیے پورے پیسے نہیں ہوتے تھے، وہ فلم کے انٹرویل کے وقت سینما ہال کے سامنے جاکر کھڑا ہوجاتا تھا۔ ایک بھکاری کی طرح۔ اگر کوئی شخص جسے وہ فلم پسند نہیں آتی تھی، تو وہ "واپسی۔واپسی" پکارتا ہوا باہر آتا تھا اور اپنا ٹکٹ آدھی قیمت میں فروخت کردیا کرتا تھا۔

ماسٹر کا بیّو "واپسی" بیچنے میں بہت مشہور تھا۔ وہ اپنی سلائی کی دوکان سے بھاگ کر ہمیشہ دوپہر کے شو کا ٹکٹ خریدتا تھا۔ آدھی فلم دیکھ کر فلم کے وقفے میں وہ اُسے بیچ دیا کرتا تھا۔

جس رات ماسٹر کے بیّو نے خود پر مٹی کا تیل ڈال کر خودکشی کی تھی، اس دن دوپہر میں اُس نے ایک بہت ہی کامیاب اور شہرہ آفاق فلم کا واپسی کا ٹکٹ مجھے مفت دے دیا تھا اور پھر اپنی سانپ جیسی چمکیلی آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا بھیڑ میں گم ہوگیا تھا۔ بالکل دستوئیفسکی کے اس کردار کی طرح جو وقار اور خودداری کے ساتھ خدا کو اس کی تماشہ گاہ کا ٹکٹ واپس کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔

جب کوئی مُسلم سوشل فلم شہر میں نمائش کے لیے پیش کی جاتی تو سینما گھر پر برقع پوش لڑکیوں اور عورتوں کا جم غفیر اُمنڈ پڑتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس سینما ہال کی جالیوں میں لُو ہوک رہی تھی۔ اپیا اور بجّو اس مقبول فلم کے المیہ انجام پر نقاب کے اندر ہی اندر سسک رہی تھیں۔ گول چکّر دار زینے کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد، باہر ٹھیلے پر فلم کے گانوں کی کتابیں مل رہی تھیں۔

اپیا نے مجھے چوّنی دی۔

"جاؤ۔ جاکر کتاب لے آؤ۔"

اس فلم کے گانے بے حد رُومانی اور درد بھرے تھے۔

لوگ، جو شو دیکھ کر نکل رہے تھے وہ اب یہاں رُک گئے تھے اور گانوں کی کتاب پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے ایک کتاب حاصل کر پایا مگر افسوس اُس کا آخری ورق اس دھینگا مشتی میں پھٹ کر کہیں گر گیا۔ اس آخری ورق پر ہی سب سے اہم گیت تھا۔

اُس شام بڑے ابا نے اپیا اور بجّو کو بھی مارا۔

"کیا کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی جوان بہنوں پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے۔" امّاں بھاگی بھاگی آئیں۔ اُن کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے۔

"کھود کے گاڑدوں گا۔ جب دیکھو دروازے پر ٹنگی رہتی ہیں یہ دونوں" بڑے ابا گرجے

اُن دنوں ڈھول تاشے کے ساتھ فلمی پوسٹروں کی بارات بھی نکلا کرتی تھی۔ جب بھی کوئی ایسی بارات گلی سے ہوکر گزرتی، اپیا اور بجّو بھاگ کر دروازے میں کھڑی ہوجاتیں اور کواڑوں کی اوٹ سے پوسٹروں کو بڑے شوق اور لگن کے ساتھ دیکھا کرتیں۔

مگر اپیا اور بجّو کی بارات کبھی نہ آسکی۔ اپیا تو عین جوانی میں ہی ایک پُراسرار بخار کی زد میں آکر مرگئیں اور بجّو نے اس کے بعد تمام عمر عبادت میں گزاردی۔ میں جب تک زندہ رہا میں نے اُنھیں صرف نماز، تلاوتِ قرآن اور قسم قسم کی نیاز وفاتحہ میں ہی مصروف دیکھا۔ اس

وقت تک اُن کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے اور چہرے پر بے شمار جھائیاں نمودار ہو گئی تھیں۔

جہاں تک میرا سوال ہے تو میں صرف تفریح کی غرض سے ہی سینما کا شائق تھا۔ تفریح کی اپنی ایک پراسرار آزادی ہوتی ہے۔ یہ اپنا بھاری لبادہ اتار کر سڑک پر پھینکتے ہوئے، ہاتھ پیر چلاتے ہوئے آوارہ گردی کرنے جیسا ہے۔ کبھی کبھی سڑک پر دائیں طرف چلنے کی قدرے مجرمانہ سی مسرت کی طرح، خوشی اور اطمینانِ قلب ایک بہت ہی پے چیدہ سی کیفیت کا نام ہے اور اسی طرح دل کا بھر آنا بھی۔ یہ ایک پُر اسرار بھول بھلیاں ہے۔

اور میرا کیا ہے۔ میں تو بے حد گھٹیا اور سستی جذباتی فلموں کے سطحی مکالموں پر یا مناظر پر بھی اکثر رو دیا ہوں۔ انسان کو گھٹیا اور حقیر چیزوں سے خوش ہو جانے یا دُکھی ہو جانے سے بھلا کون روک سکا ہے؟ مگر گھٹیا پن اور سستے جذبات کی اپنی ایک ناپائیدار سی پاکیزگی بھی ہوتی ہے۔

ٹھیلے پر بکتے ہوئے سستے کنگھے، معمولی سی لپ اسٹک، بسوں اور ریل کے تھرڈ کلاس کمپاؤنمنٹ میں پالش کیے ہوئے، ٹین کے ہار اور بُندے فروخت کرتا ہوا میلے لباس والا آدمی اور خراب تیل کے سموسے بیچتا ہوا خوانچے والا۔ یہ سب یقیناً گھٹیا ہیں مگر سستے اور گھٹیا پن سے اُگتے ہوئے خواب سستے نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ماخذ سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ پاؤں زمین سے تھوڑا اُوپر اٹھتے ہیں۔ یہ ایک نشے کی سی حالت ہے۔

تفریح اپنی ماہیت میں قطعی خالص ہے۔ اور اب بُھوت بن جانے کے بعد تو میرا ایمان صرف اسی میں قائم رہ گیا ہے۔ تفریح میں سُکھ اور دُکھ دونوں ہی شامل رہے ہیں۔ رو کر، غمزدہ ہو کر بھی ہم تفریح کرتے ہیں۔ یہ دُکھی ہونے کا سُکھ ہے۔ یہ کسی جنازے کے پیچھے پیچھے چلتے جانے کا اطمینان ہے۔ ایسا اطمینان جو قبر پر مٹی ڈال کر اور خاص طور پر وہ آیتیں پڑھ کر جن سے مردے کے بُھوت بن کر بھٹکنے کے امکانات تقریباً ناممکن ہو جاتے ہیں، حاصل ہوتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرا مُردہ کسی انسان کو اس قسم کا کوئی سُکھ یا دُکھ بہم نہ پہنچا سکا۔ وہ تو ادھر جھاڑیوں میں سڑ رہا تھا اور ایک عرصے بعد جب وہ ملا تو پوسٹ مارٹم کے بعد اُسے لاوارث سمجھ کر ضائع کر دیا گیا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ گھٹیا پن کے ذریعے ہی خوش ہو جانے میں بھلا ایسی کون سی بُرائی تھی؟ کسی کو گالی دے کر، گندا فحش لطیفہ سنا کر، آنکھ دبا کر یا ہاتھ سے کوئی فحش اشارہ کرنے سے بھی تو خوشی ہی ملتی ہے۔ اور کون سی دولت مل جاتی ہے؟

نہیں صاحب کوئی فرق نہیں ہے۔ خوشی کی مقدار بھلے ہی آپ ناپ لیں مگر اس کی قدر و قیمت ایک ڈھکوسلہ ہے۔ خوشی کے موقع پر ہمارے غدود گھٹیا پن یا اعلیٰ پن کے احکام کے محتاج یا پابند نہیں ہوتے۔

وہ سینما گھر آہستہ آہستہ ڈھے رہا ہے۔ میں نے رات پُل کے پار والے کھنڈر میں بسر کی تھی اور اب وہاں سے سیدھا یہیں چلا آیا ہوں۔ سینما گھر کے برابر میں وہ جو پیپل کا درخت ہے، میں اُس کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھا ہوں۔ دوپہر ہے۔ لُو کے جھکڑوں میں ملبے کی خاک اور مٹی بگولا بن کر اُڑ رہی ہے۔ کدال چلانے والے مزدور کھانا کھا کر درخت کے سائے میں بیڑی سلگانے بیٹھ گئے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو آسمان میں چیل انڈا توڑ رہی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ میں خود کو اب ایک چیل کے روپ میں ہی تبدیل کر لوں لیکن اس سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔

دراصل بُھوت کا کوئی بھی سراپا نہیں ہوتا۔ یہ سب انسانوں کے ذریعے پھیلائی گئی افواہیں ہیں اور اُن کی قوتِ کلام یا بدیعات وغیرہ، جن کی وجہ سے بُھوت کے نوکیلے دانت اور ہڈیوں کے ڈھانچے وغیرہ کا تصوّر کر لیا جاتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم بُھوت لوگ اس سے فائدہ ضرور اُٹھا لیتے ہیں۔ مگر یہ ہمارا اصل حلیہ نہیں ہے۔ وقتِ ضرورت ہم کسی بھی شکل میں بھٹکنے کے لیے نکل سکتے ہیں۔ خود ہماری اپنی کوئی بھی شکل نہیں ہے۔ اب انسان اگر خوف زدہ ہوتا ہے

تو اس میں میرا بہرحال کوئی قصور نہیں۔ انسان کو اپنے غدود کی کارکردگی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بُھوت کے ساتھ تو "جناب اعلیٰ"۔۔۔معاملہ یہ ہے کہ ہر شکل، ہر ساخت اُس کے لیے اپنا راستہ کھول دیتی ہے۔نہیں۔۔۔ اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دینے کے لیے نہیں بلکہ دراصل وہ نوٹس ہی نہیں لیتی اور اپنی ہیئت کو ایک بدروح کی مار کے لیے مکمل طور پر سپرد کردیتی ہے۔

مجھے سب سے زیادہ مزہ تو تب آیا تھا جب میں ایک ٹڈے کی شکل میں بدل کر سینما کے سفید پردے پر اُچھل رہا تھا۔ ہاں ایک بار میں خود کو ہڈیوں کے ڈھانچے میں متشکل کر کے ایک سنسان سے سینما گھر میں رات کا شو دیکھنے گیا تھا مگر یقین کیجیے کہ میری شعوری کوشش کبھی نہیں رہی کہ میں کسی کو ہراساں یا پریشان کروں۔

فی الحال تو میں چیل بنا ہوا اس سینما گھر کو دیکھ رہا ہوں جس پر کدالیں چلائی جارہی ہیں حالانکہ میرا دیکھنا بھی کیا۔اب جو آنکھیں میرے پاس ہیں وہ آنکھوں کی نفی ہیں۔ اب تو میں دیکھنے سے زیادہ جانتا ہوں اور جاننے سے زیادہ تفریح کرتا ہوں۔ اب میرے آلۂ حواس غیر انسانی ہیں۔ یہ ایک بُھوت کے آلۂ حواس ہیں جو ایک دھوئیں کی طرح مُجھ سے باہر نکل کر ہر جگہ چہل قدمی کر سکتے ہیں۔ یہ مجھ سے آزاد ہیں۔ان کی صحیح تعداد کا علم خود مجھے بھی نہیں ورنہ آپ کو ضرور بتادیتا۔

اس سینما گھر میں گھٹیا تفریحی فلمیں دیکھ کر میں کتنا رنجیدہ اور کتنا سرشار ہوا تھا۔ ٹوٹتے ہوئے اس سینما گھر کی بنیادوں میں ایک کمرشل پلازہ رینگ رہا ہے۔ ایک بازو اُبھر کر آنے کے لیے تیار ہے۔اپنی سنجیدگی کے ساتھ۔تفریح کو قتل کرنے کے لیے۔

بازار ایک عجیب شے ہے۔ وہاں تفریح نہیں۔تفریح کا التباس ہے۔ وہ ان بے تکی فلموں سے زیادہ گھٹیا ہے۔وہ سینما ہال کے گاڑھے اندھیرے سے زیادہ غیر انسانی ہے۔ اُس گاڑھے اندھیرے میں تو سسکیاں اُبھرتی تھیں۔ قہقہے گونجتے تھے۔مگر بازار میں کسی دوکان پر کوئی شخص رُومال سے اپنے آنسو پونچھتا نظر نہیں آتا۔ نہ کوئی اس طرح ہنستا ہے کہ پیٹ پُھول جائے۔ یہاں ہوشیاری کے علاوہ اور کوئی منظر نہیں۔ یہ اصلی مصنوعی پن ہے اور ہڈیوں تک اُتر جانے والی بے رحمی ہے۔ یہاں خرید وفروخت کے واسطے مریضانہ انا اور غرور کے ساتھ نپے تُلے اندازوں کے ساتھ چڑھتے اترتے قدم ہیں۔ ہر انسانی امکان اور جذبے سے یکسر خالی۔ ہڈیوں کے پنجر کی طرح خوفناک۔ اِدھر سے اُدھر کڑکڑاتے ہوئے بجتے ہوئے۔ ہم بُھوتوں کو بھی اِن سے شرم آتی ہے۔

کس نے کہا تھا؟ "خدا ہم سے کٹھ پتلیوں کی طرح کھیلتا ہے۔ یہ سب اسٹیج ہے۔"

تب تک کم از کم دستوئیفسکی کا کردار اپنا ٹکٹ واپس کردینے کی جرأت تو رکھتا تھا۔ اور وہ لوگ کون تھے جو دنیا کو رنگ منچ، مایا اور تماشہ کہتے تھے؟

بہرحال یہ سب تمثیلات تھیں مگر کتنی انسانی اور فطری تمثیلات!

اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اس تمثیل کا بھی خاتمہ ہوا۔ تماشہ اور کھیل کا جب انہدام ہوتا ہے تو اس کے کھنڈر نما ملبے سے بازار کا جنم ہوتا ہے۔ بازار جس کی بنیادیں اگرچہ تماشہ اور کھیل ہی ہوتی ہیں مگر اس کا وجود تماشے کے انسانی پہلو کو ہلاک کرتا ہے اور اُس کی سرحدیں۔۔۔!

وہاں جو محافظ کھڑے ہیں اُنہیں کوئی اپنا ٹکٹ واپس کرنے نہیں آتا۔ یہاں ٹکٹ واپس کرنا بھی بازار کے ایک خوبصورت شوکیس میں سجی ہوئی مُمی کی طرح بدل جانے جیسا ہے۔ جینا اور مرنا دونوں قابلِ صرف ہیں۔ خودکشی کوئی فعل نہیں صرف ایک قابلِ صرف شے ہے۔

تو یہ ہے بازار کی تفریح جس سے عمدہ تفریح تو ہم بھوت لوگ اندھیری رات میں آپسی اُچھل کود کر کے اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر کرلیتے ہیں۔

(ٹھہریے! میرا قصہ نویس سگریٹ رہا ہے۔کم بخت نے مندرجہ بالا سطریں کسی گھٹیا فلم کے سین کی طرح لکھ دی ہیں۔)

مگر وہ بازار بھی ایسا ہی تھا۔اس بے ہنگم اور خوفناک فلائی اووروں والے مہانگر کے بیچ میں اُگ آئے ایک بے تکے جنگل کے ٹکڑے کی طرح۔ یکسر نقلی اور مصنوعی۔ وہ دوسرے بازاروں کی طرح ہی تھا مگر اُن سے بھی زیادہ بہروپیا۔ وہاں اینٹوں کے کھرنجے کا فرش تھا۔ کھپریل اور ٹائلوں کی چھتیں تھیں۔ لوک کلا، دیہی کلا وغیرہ کی نمائش ہورہی تھی جو ایک بناوٹی

مسکراہٹ کی طرح تھی جس کا پہلا وار خود اس کے ہونٹوں اور جبڑوں پر ہی ہوتا ہے۔ وہ تکلیف وہ حد تک پھیل جاتے ہیں خود پر دانت نکالتے ہوئے۔

''دلّی ہاٹ'' کے یہ بدہیئت دانت بازار کے نظام کو زیادہ سفا کی کے ساتھ نمایاں کر رہے تھے۔

میں نے خود کو ایک بُھورے چوہے کی شکل میں تبدیل کیا اور ایک طرف دبک کر شارٹس پہنے اُن تندرست لڑکیوں کو دیکھنے لگا جو اپنے مرد ساتھیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنے کلچرڈ جمالیاتی ذوق کا دکھاوا کرتی ہوئی ''پی ژا'' کھا رہی تھیں۔

میں آپ کو بتاؤں کہ جب میری موت واقع نہیں ہوئی تھی تو اکثر اس شہر میں ایک جنگل میرے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ وہ میرا تعاقب کرتا تھا۔ راستہ بدل بدل کر، گھوم کر چکر لگا کر آتا تھا۔ کسی تیندوے یا گلدار کی طرح۔ بظاہر لاتعلق سا مگر اچانک ہی وہ میرے سامنے ہوتا تھا۔ کناٹ پلیس کی سفید گول عمارتوں میں۔ قرول باغ کے جوتوں کے جھالوں میں۔ فلستان سینما کو جانے والی سڑک پر قطار سے لٹکتے ہوئے کالے ٹائروں میں۔ سروجنی نگر میں بانس کے ڈنڈوں پر جھولتی بے رحم سخت چمڑے کی جیکٹوں میں۔ کملانگر میں سڑک پر، پر بکھرے پھولوں کے گلدستوں میں اور لاجپت نگر میں آئس کریم یا چاٹ کھاتی ہوئی بدنیت، سُرخ ہونٹوں والی گداز اور فحش جسم والی عورتوں میں۔

اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب میں خود ایک جنگل میں بدل چکا ہوں مگر دلّی ہاٹ میں ''لوک کلا کا تشدد'' میں نے اپنے چوہے بنے جسم پر کچھ اس طرح سے محسوس کیا جیسے کوئی بُھوت صرف اس وقت ہی محسوس کرتا ہے جب اُسے بھگانے کے لیے تنتر منتر کا سہارا لیا جا رہا ہو۔

''لوک کلا'' کی مار کتنی معنی خیز ہوتی ہے یہ آپ کو میری کہانی میں آگے چل کر پتہ چلے گا۔

اب سینما ہال کا وہ حصہ توڑا جا رہا ہے جہاں قطار سے پانی کی ٹونٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ فلم

کے وقفے میں تیل سے بنے سوندھے سموسے کھا کر تماشائی ان ٹونٹیوں میں مُنھ لگا دیتے۔ فرش پر پڑے مونگ پھلیوں اور کیلوں کے چھلکوں پر ان کے پیر پھسل پھسل جاتے۔ پانی پیتے پیتے اکثر انٹرویل ختم ہو جاتا تب تماشائی حواس باختہ ہو کر ہال کے اندھیرے کی طرف دوڑتے اور وہ مہربان اندھیرا سب کو اپنی آغوش میں لے لیتا۔

میں چیل بنا ہوا اس بات پر ہنس رہا ہوں کہ سینما ہال ٹوٹنے کے بعد جو ''واستوکار'' اسی بازار کا نقشہ بنائے گا وہ سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ اس کی بنیادوں میں کوئی سانپ یا اس کا بل نہ ہو۔ واستو کے علم کی باریکیاں اور نزاکتیں اب مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ میں اس احمق کو بتا سکتا ہوں کہ اس ہال کو توڑ کر جو کمرشل پلازہ بنایا جائے گا وہ صرف جسم فروشی کے اڈّے کے طور پر ہی کامیاب ہو سکتا ہے اور دل تو میرا یہ بھی چاہتا ہے کہ میں خود ہی سانپ بن کر اس کی بنیادوں میں رینگنے لگوں۔ ایک بدشگونی کی مانند!

ابھی یہاں وہ کھڑکیاں سلامت ہیں جہاں سے ٹکٹ خریدا جاتا تھا۔ شادی کے بعد میں اپنی بیوی کو پہلی بار اس ہال میں فلم دکھانے لایا تھا۔ میری بیوی فلم کی شوقین نہیں تھی۔ اُسے گھر داری کے سامان کے لیے شاپنگ کرنے کا شوق تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرا دل رکھنے کے لیے ہی فلم دیکھنے آ گئی تھی۔

اُس دن ٹکٹ کی کھڑکی پر زبردست بھیڑ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں مایوس ہو کر واپس ہی جانے والا تھا کہ میرے بچپن کا ایک دوست نظر آ گیا۔ وہ سائیکلوں کی مرمّت اور ان کے پنکچر جوڑنے کا کام کرتا تھا۔ اس کے کپڑے ہمیشہ کالی چکنائی سے چیکٹ رہتے تھے۔ آج بھی وہ ایسے ہی کپڑے پہنے تھا۔

''فکر مت کرو یار۔ میں ہوں نا۔ بھابی دیکھو میرا کمال'' اُس نے میری بیوی کی طرف دیکھ کر فخریہ کہا۔

میں تو اُس کے کمال سے اچھی طرح واقف تھا مگر میری بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ

گئیں۔

میرے دوست نے تیسرے درجے کی قطار کے بالکل پیچھے جاکر اچانک ایک جست لگائی اور ٹکٹ لینے کے لیے کھڑے ہوئے لوگوں کے سروں کے اُوپر کسی چھپکلی کی طرح پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اب اس کا ہاتھ کھڑکی کے اندر تھا اور بڑی آسانی کے ساتھ پہلا ٹکٹ خریدنے والا وہ ہی تھا۔ اپنا خطرناک کرتب دکھانے کی خوشی میں اُسے لوگوں سے ملنے والی گالیوں کا ذرّہ برابر بھی ہوش نہ تھا۔ اسی طرح ایک بار اور اُس نے میری مدد کرنے یا مجھے چونکانے کی حتیٰ الامکان کوشش کی تھی۔ لیکن ناکام رہا تھا لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔

اس ملاقات کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے علم ہوا کہ اس نے ایک دن اپنی غربت، بیوی کی بدچلنی اور قرضے سے تنگ آکر اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور پھر خود بھی ریل کے سامنے جاکر کٹ کر مرگیا۔ اب کبھی کبھی اُس کے بُھوت سے ملاقات ہوتی ہے مگر دراصل خودکشی کرکے بُھوت بننے والے ہم جیسوں سے الگ تھلگ ہی رہتے ہیں۔ اُن کے بھٹکنے کے اوقات اور مقامات بھی دوسرے ہیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک قسم کے احساس برتری کے شکار ہیں کیونکہ انہوں نے خود ہی زندگی کے مُنھ پر تھوک دیا تھا۔

ان خودکشی کرنے والوں نے تو موت کو اپنی عادت بنالیا ہے اور اس طرح موت کی تمام چمک دمک اور توقیر کو گویا ختم ہی کر دیا ہے۔

مجھے کہنے دیجیے کہ اگر آپ خودکشی کو تھوڑا نیا رنگ دے سکیں یعنی اگر آپ ان لوگوں میں شامل ہوجائیں جو محض نئے پن یا فینٹسی کی خاطر خود کو آدم خوروں کی جدید تنظیم کے سپرد کردیتے ہیں اور اپنے جسم کے آہستہ آہستہ قتلے اور ٹکڑے کرواتے ہوئے مرجاتے ہیں تو یہ خودکشی ایک نئی اور توانا خودکشی ہوگی ورنہ لوگ تو بس عادتاً مر رہے ہیں کچھ اس طرح جیسے صبح کی چائے پینے کو نہ ملے تو جھلاّ رہے ہیں..... ایسی موت کی کیا اوقات جناب!

وہ دوپہر کا شو تھا۔ میں نے زیادہ تر فلمیں دوپہر ہی میں دیکھیں اگرچہ سینما ہال کا گیٹ

کیپر دوپہر کے شو میں آنے والے تماشائیوں کو بہت احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

وہ برسات کے دن تھے، بارش ہونے لگی۔ پھر اتنی تیز ہوگئی کہ ہال کی ٹین کی چھت ٹپکنے لگی۔ میں اور میری بیوی نے وہ فلم تقریباً بھیگتے ہوئے ہی دیکھی تھی مگر اس بات کا مجھے آج تک افسوس ہے کہ ہم دونوں جب ہال کے اندر داخل ہوئے تھے تو ''نمبر پھینکے'' جاچکے تھے۔ ''نمبر پھینکنے'' کا مطلب فلم کی شروعات میں اس کی کاسٹ دکھائے جانے سے تھا۔ عوام میں نمبروں کی بہت اہمیت تھی۔ وہ لکھے ہوئے ناموں کو ''نمبر'' کہتے تھے۔ شاید ہندسوں کو الفاظ سمجھنا اتنی احمقانہ بات بھی نہیں کہ اسے عوام کی جہالت پر مامور سمجھ کر حقارت سے ہنس دیا جائے۔ مجھے تو یہ لفظ کو زیادہ شفاف اور ایماندار بنانا ہی لگتا ہے جس کے لیے ہمیں ان جاہل لوگوں کی نیت کا احترام کرنا چاہیے۔ بہرحال بھیگ بھیگ کر دیکھی گئی فلم کا ایک سین مجھے یاد رہ گیا ہے۔

اندھیری رات میں ایک کھڑکی کسی مکان کی اوپر منزل پر روشن ہوئی۔ نیچے ایک کتے کی پرچھائیں گلی کے موڑ پر غائب ہوتی نظر آئی۔

یہ کتا اب کہاں ہوگا؟ میں سوچتا ہوں کہ چالیس سال پہلے جس کتے کو اس کیمرے نے ''شوٹ'' کیا تھا آج اس کا پنجر کون سی ہواؤں میں جھول رہا ہوگا؟

رُک جائیے۔ میں اپنے آلات موسیقی تلاش کرنے کے سفر میں تھوڑا سا بھٹک رہا ہوں۔ مجھے کچھ وقت لگے گا۔ میرا قصہ گو بھی میرے پیچھے ساکت وجامد کھڑا ہے۔ لیکن میں اپنے سامنے جو بھیانک دلدل دیکھ رہا ہوں، شاید یہی میری منزل ثابت ہو۔ اس لیے میں ہمت کرکے اس کالی دلدل کی طرف اپنا قدم بڑھاتا ہوں۔ مگر میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ یہ میرے ہی پیر کے پرانے نشان پر نئے اور دوسرے نشان کی طرح ہے۔ ابھی وہ پرانا نشان بھی گیلا ہے۔

(۳)

میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اُسے امور خانہ داری میں بہت دلچسپی تھی۔ اُس نے تکیوں کے غلاف اتنے خوبصورت کاڑھ رکھے تھے کہ مجھے اپنے اوپر فخر ہوتا تھا۔

وہ ایک طویل قامت مگر ڈبلی پتلی عورت تھی۔ اس کے پیٹ پر ضرور، ایک خاص مقام پر کافی چربی اکٹھا ہوگئی تھی۔ چربی کا یہ گول اُبھرا ہوا ڈھیر اس کے دبلے پتلے جسم پر بہت عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا اور جب وہ کسی کام میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول ہوتی، خاص طور پر جب کشیدہ کاری کررہی ہوتی تو اس کا جھکا ہوا چہرہ گھوڑے کے مُنھ سے مشابہ نظر آتا تھا۔ مجھے اس گھوڑے جیسے چہرے پر بہت پیار آتا تھا اور میں اس کے گالوں پر بے تحاشہ بوسے ثبت کردیا کرتا تھا۔

اس نے کبھی میری قلیل آمدنی کا کوئی شکوہ نہیں کیا تھا بلکہ بڑے سلیقے اور کفایت شعاری کا مظاہرہ کرکے گھر کو حتیٰ الامکان اچھے طریقے سے سجا سنوار رکھا تھا۔

ہماری کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس محرومی سے بھی میں نے اُسے کبھی رنجیدہ خاطر نہیں دیکھا۔ میں اُس سے بہت ضِد کرتا تھا کہ دل بہلانے کے لیے وہ ہر ہفتے میرے ساتھ فلم دیکھنے چلا کرے مگر اس کے بجائے اُس نے خود کو گھر کے کاموں میں ہی مصروف رکھنا بہتر سمجھا۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے، میں نے تو اپنی زندگی کا بُرے سے بُرا وقت بھی فلمیں دیکھ دیکھ کر کاٹ دیا تھا۔ یہ اُس زمانے میں ممکن تھا۔ اب ممکن نہیں ہے اگرچہ فلمیں تو اب بھی بنتی ہیں اور سینما گھروں میں نمائش کے لیے پیش بھی کی جاتی ہیں مگر ایک تو وہ کچھ اور بھی زیادہ پُھوہڑ، بے شرم اور جلد باز ہوگئی ہیں، دوسرے وہ جن سینما گھروں میں چلتی ہیں وہ اپنے آپ میں خود ایک ایئر کنڈیشنڈ پلازہ یا ملٹی پلیکس میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ ان نام نہاد سینما گھروں میں چلتی ہوئی یہ فلمیں اُسی دنیا کو پیش کرتی ہیں جو دُنیا سینما ہال کے باہر شُلتی نظر آتی ہے۔ جو لڑکیاں باہر فیشن ایبل لباس پہنے اور خاص طور سے اپنی ناف کی نمائش کرتی ہوئی، خوبصورت اور نئی کاروں سے اترتی نظر آتی ہیں، بس پردے پر بھی ایسی ہی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ ان سینما ہالوں کا اندھیرا بھی بس برائے نام ہے۔ یہ مدھم چاندنی والی راتوں کی طرح ہے۔

اس لیے فلمیں اب تفریح کے گہرے، وسیع اور انسانی مفہوم کا احاطہ نہیں کرپاتیں۔ اب یہ ایک ہی بور دنیا ہے۔ سینما گھر کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی۔ بلکہ وہ تو آپ کے بیڈروم

میں چلی آئی ہیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ سودا بیچنے والوں کی صدائیں بھی آپ کے گھر میں آگئی ہیں۔ اب یہاں پُورا بازار لگ گیا ہے۔

کیا آپ اسے تفریح سمجھتے ہیں؟ ذرا فیشن ٹی وی پر دکھائی جانے والی تقریباً عریاں لڑکیوں کے چہرے تو دیکھیے۔ ان سے زیادہ خوش مزاج اور شگفتہ چہرے تو ہم بُھوتوں کے ہوتے ہیں۔ کاش آپ کے حواس واعصاب انہیں دیکھنے پر قادر ہوتے!

مجھے یقین ہے کہ اب میری یہ بک بک آپ کے لیے قطعی طور پر ناقابلِ برداشت ہوچکی ہوگی بالکل اسی طرح ایک بُھوت کا وجود بھی آپ لوگ کبھی برداشت نہیں کرسکے۔ لیکن اطمینان رکھیے۔ میرا قصہ گو "واقعہ" کو اس رطب ویابس سے کھینچ کر آپ کے سامنے گھسیٹتا ہوا لے آئے گا۔ "واقعہ" کا ننگا پن دیکھنے کے لیے ہی تو آپ لوگ کہانی پڑھ رہے ہیں (یا سُن رہے ہیں؟) بس تھوڑا صبر کیجیے۔ پھر "واقعے" پر دل بھر کر ہنس لیجیے گا تو میں عرض کررہا تھا کہ فلمیں اب زیادہ پھوہڑ اور بے شرم ہوگئی ہیں، مگر اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ ہر فن میں بہرحال ایک قسم کی بے شرمی تو ہوتی ہی ہے۔ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے، اپنی حفاظت کے لیے یہ بے شرمی ضروری ہے۔ کبھی کبھی ایسا دور بھی آتا ہے جب لگتا ہے کہ فن ختم ہوگیا (اس کہانی کو پڑھتے وقت بھی آپ کو یہی احساس ہورہا ہوگا) مگر دراصل ایسا ہوتا نہیں ہے۔ یہ سب خود کو بچانے کی کوشش ہے اُس گاڑھے سیاہ مادّے سے جو چلا آرہا ہے سب کچھ ڈھک لینے کے لیے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے سینما گھر کے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بھیڑ ہمیشہ بہت معنی خیز نظر آئی ہے۔ ایک مشترکہ مقصد ہونے کے ناتے یہ ایک بااخلاق بھیڑ ہے۔ اگرچہ اس میں بہت سی آوازیں فحش لطیفوں، گالی گلوچ اور ہاؤ ہُوٗاؤ کی بھی شامل ہیں مگر پھر بھی یہ سب مل کر اُس اندھیرے کی طرف جارہے ہیں۔ جلدی جلدی اپنی کرسیاں محفوظ کرلینے کے لیے۔ یہ بھیڑ پلیٹ فارم کی بھیڑ سے کتنی مختلف ہے جہاں ہر ایک کا اپنا اپنا اسٹیشن ہوتا ہے۔ یہ میلے کی بھیڑ سے بھی الگ ہے۔ میلے میں ہر ایک کی دلچسپی کا الگ الگ سامان ہوتا ہے۔ جیسے مجھے میلے یا نمائش میں صرف "موت کے کنویں" نے ہی اپنی طرف کھینچا ہے۔

اور پُر لطف بات تو یہ ہے کہ سینما ہال میں جیب کترتا ہوا شخص بھی دوسرے جیب کتروں کے مقابلے میں زیادہ حسّاس ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ تب ہی جیب کاٹتا ہے جب پردے پر کوئی بے حد رومانی پھڑکتا ہوا یا پھر المناک گیت چل رہا ہو۔

دیکھیے میرا قصہ نویس مجھے بے وجہ دھمکی دے رہا ہے۔ اُس کے ادبی کیریئر کا سوال ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ یہ اُس کی ناکام ترین کہانی ثابت ہوگی کیونکہ اس میں ''کہانی پن'' ندارد ہے۔ مگر یہ تو مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا۔ بُھوت پر چودہ طبق روشن ہیں اور صاف بات تو یہ ہے کہ یہ میری کہانی ہے اور اسے صرف میرے نوکیلے ناخن خلا میں لکھ رہے ہیں۔ ہواؤں میں لکھی جانے والی یہ کہانی میرے قصہ نویس کی نہیں، میری ہے اور میں زبردستی آپ کو سُنا رہا ہوں کیا۔ مجھے یہ علم نہیں کہ آپ ہرگز نہیں سُن رہے ہیں!

اور آپ میری اُن آوازوں کو بھی نہیں سُن رہے ہیں جو بُھوت بننے کے بعد اکثر میرے مُنھ سے نکلا کرتی ہیں اور لوگ بے وجہ خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ جس طرح مزدور محنت کرتے وقت ''ہوہو۔ ہوہو'' کی آواز سے اپنی جفاکشی کی موسیقی تشکیل کرتا ہے، اسی طرح ہم بُھوت بھی کچھ آوازیں نکالتے ہیں۔ یہ بڑی ایماندار آوازیں ہیں جن سے ہمارے وجود کو کوئی نہ کوئی معنی ضرور فراہم ہوجاتا ہے۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ اپنی بیوی سے جسمانی قربت کے لمحات میں میرے مُنھ میں سے جو آوازیں باہر آتی تھیں، وہ ان آوازوں سے بہت مختلف نہ تھیں۔ ایسا اس لیے ہرگز نہ تھا کہ میں شہوانیت میں شرابور ہوجاتا تھا بلکہ اس لیے تھا کہ میں ایک نقلی شہوانیت کو خود پر مسلط کرکے اداکاری کررہا ہوتا تھا۔ یہ آوازیں کچھ اس لیے بھی مُنھ سے نکلتیں کہ اندھیرے میں اگر میں اس کی چھاتیوں پر جھکتا تو وہ کہیں اور ہوتیں۔ پہلے ایک خالی پن، گردن کی پتلی ہڈی یا پھر کمزور کندھا ہی ملتا۔ اگر ہونٹ چومنے جھکتا تو میرے مُنھ میں اس کے تیل سے چپڑے، ایک دو بال چلے آتے اور اگر میں شہوانیت میں بھرے ہوئے ہونے کی اداکاری نہ کررہا ہوتا تو ایسے وقت اپنی اُبکائی کو ضبط کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں ہمیشہ غلط طریقے سے غلط جگہ ہی چوما

کرتا۔ اندازے کی ایسی بے شمار غلطیوں کے باوجود میری بیوی نے ہمیشہ کامیاب ترین مرد ہونے کی تصدیق کی۔

خود میں نے سیکس کو کسی گہرے اور سنجیدہ مفہوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ سیکس بھی تفریح ہی ہے۔ جمالیاتی تشدد سے بھری ایک تفریح۔ مگر اسی تفریح میں صرف ایک قباحت ہے۔ یہاں بھی اُکتا جانے پر اپنی ''واپسی کا ٹکٹ'' کسی دوسرے کو تھمادینا آسان کام نہیں ہے۔

اُن دنوں میرے معاشی حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئے تھے اور میں اپنا زیادہ تر وقت سینما گھروں کے تیسرے درجے میں گزارنے لگا۔ میری بیوی کو ہر وقت نزلہ گھیرے رہتا تھا۔ اصل میں وہ روزانہ پورا گھر اور خاص طور سے فرش ضرور دھویا کرتی تھی۔ جاڑا، گرمی اور برسات ہر موسم میں زیادہ تر ٹھنڈے پانی سے قربت رہنے کی وجہ سے وہ دائمی طور پر نزلے کا شکار ہوگئی تھی اور اس کی ناک سے ہمیشہ ''شُوں۔ شُوں'' کی آوازیں نکلا کرتی تھیں۔

یہی زمانہ تھا جب میری بیوی کا رشتے کا ایک بھائی ہمارے گھر آکر ٹھہر گیا۔ وہ عمر میں میری بیوی سے بہت چھوٹا تھا۔ چار سال تک سعودی عرب میں رہنے کے بعد اس نے کافی دولت کمائی تھی۔ وہاں وہ راج گیری کا کام کیا کرتا تھا۔ اب یہاں کوئی کاروبار قائم کرنا چاہتا تھا۔ اُسے بھی فلموں سے قطعی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت شرعی احکامات اور بزرگان اسلام کے تذکروں میں گزارا کرتا۔ خاص طور پر اسلام میں کاروبار کرنے کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے اُس پر تو وہ بے تکان بولا کرتا تھا۔ کیونکہ میری بیوی کا بھی ان ہی چیزوں کی طرف رجحان تھا اس لیے اُس نے یہ باتیں بہت توجہ اور دھیان کے ساتھ سنانا شروع کردی تھیں۔

بھائی کے چہرے پر سنِ بلوغ تک پہنچنے کے باوجود داڑھی اور مونچھوں کے بال نہیں نمودار ہوسکے تھے۔ اس کی کھال کی رنگت نے ہمیشہ مجھے کچھ فکر میں ڈالا تھا۔ وہ تقریباً زرد تھی۔ یرقان کے مریض کی طرح۔ مگر میری بیوی کا کہنا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بچپن ہی

سے ایسا ہے اور یہ تو دراصل سنہرا رنگ ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ رنگ تو پرہیزگار، نفس کُش اور کھانا کم کھانے والے انسانوں کی پہچان ہے۔

وہ اتنا دُبلا پتلا اور چھوٹا سا تھا کہ کبھی کبھی میں اُسے یونہی تفریحاً ایک ہاتھ سے اُٹھا کر بچّوں کی طرح چک پھیری کرا دیتا۔ وہ تو خاموش رہتا مگر یہ منظر دیکھ کر میری بیوی خوشی سے تالیاں بجایا کرتی اور اُس کے دُبلے پتلے پیٹ پر اُبھر آیا وہ چربی کا گولہ بُری طرح پھولنے اور پچکنے لگتا۔

ویسے بھی اُن دنوں وہ کچھ زیادہ خوش مزاج رہنے لگی تھی اور اُس نے مجھ سے گھر کے خرچ کے لیے پیسے مانگنا بند کر دیے تھے بلکہ وہ تو اُلٹا مجھ ہی کو فلم دیکھ آنے کے لیے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم میں سے پیسے نکال کر دے دیتی تھی۔

میں اپنی بیوی کی خوش مزاجی کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں ورنہ جو حالات میرے تھے، اُن میں کسی عورت کا میرے ساتھ نباہ کر پانا قطعی ناممکن تھا۔ وہ بے چاری تو کبھی کبھی مجھے خوش کرنے کے لیے مسخرہ پن کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔

جس رات میرا قتل ہوا ہے اُس دن دوپہر کے کھانے میں اُس نے میرے لیے لمبے والے بُھنے ہوئے سالم بینگن بنائے تھے۔

میں فرش پر پالتی مار کے بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا اور میرا چہرہ شاید اس لیے کچھ اُداس نظر آتا ہوگا کہ ابھی ابھی میں ایک المیہ فلم دیکھ کر آیا تھا۔ تب ہی میری بیوی اُس نیلے رنگ کی جھاڑن کو لے آئی جس سے وہ گھر کی دُھول صاف کیا کرتی تھی۔ وہ اُس جھاڑن کو میرے مُنھ اور آنکھوں پر نچانے لگی۔ نہ جانے کیوں اُسے یہ نظر نہیں آیا کہ جھاڑن سے دُھول بھرے ذرات میرے سر اور کھانے پر گر رہے تھے۔ میں بھی اُسکے اس بچکانہ حرکت کو خوشدلی سے برداشت کرتا رہا۔ وہ تو کہیے کہ اس وقت ظہر کی اذان ہوگئی اور وہ نماز پڑھنے کے لیے حواس باختہ ہوکر بھاگی۔

اذان ہوجانے پر وہ ہمیشہ اسی طرح بھاگتی تھی مگر یہ بہت تعریف کی بات تھی کہ اس طرح

بھاگنے یا دوڑنے میں دوسری عورتوں کی طرح کبھی اس کے پستان ہلتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ یہ اُس کے بھاگنے کا سلیقہ تھا۔

اب یہاں صرف خالی زمین کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے۔ شام ہونے والی ہے۔ وہ سینما گھر اب مکمل طور پر منہدم ہوچکا ہے جسے میں چیل بنا ہوا دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر کوّے اور کچھ پتنگیں اڑ رہی ہیں۔ سڑک کے کنارے ٹوٹی ہوئی کرسیوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ حیرت ہے کہ ساری کرسیاں تقریباً ایک ہی جگہ سے پھٹی ہوئی ہیں۔

میں نے اب بلّی کا روپ دھارن کرلیا ہے۔ دراصل بلّی کی شکل میں، میں اس دیوار پر چڑھنا چاہتا ہوں جو اَب یہاں نہیں ہے۔ وہ دیوار جس کے دائرہ نما شگاف سے تصویر کو روشنی کی شعاع میں بدل کر پردے پر ڈالا جاتا تھا۔ میں اکثر مُڑ کر اس روشنی کی شعاع کو دیکھا کرتا تھا۔ اب تو میں خود بھی ان ذرات بھری روشنی جیسا ہوگیا ہوں یا اندھیرے جیسا!

مگر بلّی بنا بنا میں اچانک ٹھٹک گیا ہوں۔ سینما گھر ٹوٹنے سے اس کے عقب کا قبرستان صاف نظر آنے لگا ہے۔ جہاں ابھی ابھی ایک ساتھ چار جنازے داخل ہوئے ہیں۔ ان میں سے تین نے ایک ساتھ خودکشی کی ہے اور چوتھے کو سرِراہ قتل کردیا گیا ہے۔

کیا آپ یہ بات سنجیدگی سے نہیں سوچتے کہ وہ معاشرہ جس میں اتنی چھوٹی اور حقیر باتوں کے لیے انسان خودکشی کرلیتا ہی یا قتل کردیا جاتا ہے، اُس معاشرے میں تفریح کتنی بڑی ضرورت ہوگی؟ آپ تفریح کو اتنی کمزور اور چھوٹی چیز کیوں سمجھتے ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ خودکشی کرنے والوں یا قتل ہونے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سرحد پر لڑتی فوجوں کے بارے میں پتہ نہیں آپ کا کیا خیال ہے؟ مگر یہ تو آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ میری دنیا میں بُھوتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

نہیں، بازار سے آپ کیا خریدیں گے!

نفرت، تشدد، جنگ اور بدکرداری کی چمک دمک میں صرف ایسی اشیا رہ جائیں گی جو بہت ہی حقیر تھیں۔ انسانوں کی تفریح سے بہت حقیر مگر اُنہیں بہت بڑا مسئلہ بنادیا گیا۔

نفرت، جھلاہٹ اور جنگ کا مقابلہ صرف تفریح سے کیا جاسکتا ہے۔ تفریح کا ایثار معمولی تو نہیں۔ انجھے ہی دیکھ لیجیے کہ میں اپنے قتل ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے تک تفریح میں مست رہا تھا۔ بس سوائے اس کے کہ میرے جسم کے نچلے حصے میں کچھ جلن سی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے مجھے قدرے جھلاہٹ محسوس ہونے لگی مگر پھر بھی بار بار وہاں مضحکہ خیز انداز میں کھجا کر اور اپنی بیوی کو ہنسنے پر مجبور کر کے میں نے اس جھلاہٹ پر قابو پالیا تھا۔

اس رات میرے گھر کے روشن دان میں نہ جانے کون سا پرندہ بے وقت چیخنے لگا۔ مجھے آدھی رات میں باقاعدہ چیخنے والے اس پرندے سے خوف سا محسوس ہوا اور میری بیوی نے اُسے ''ہُش ہُش'' کر کے اُڑا دیا۔

اُس وقت تو مجھے نہیں پتہ تھا مگر اب میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کون تھا۔

وہ میرے سائیکل والے دوست کا بھوت تھا۔

(۴)

مجھے اعتراف ہے کہ اُس رات بڑی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ خاموشی کبھی مطلق نہیں ہوتی۔ آواز ضرور ہوتی ہے ہمارے آس پاس خاموشی کا مکھوٹا لگائے۔

میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ دن میں کھائے ہوئے، بھنے ہوئے بینگنوں کی ڈکاریں چلی آرہی تھیں۔ ایک بات اور ہے جو مجھے یاد آتی ہے اور یہ کہ اس رات بیوی سے ہم بستر ہونے کے بعد نہ جانے کیوں پل بھر کے لیے مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے میں نے کسی گندے گلاس میں دودھ پیا تھا اور اس کے بعد ہی مجھے اپنے جسم کے نچلے حصے میں جلن کا سا شائبہ ہونے لگا تھا۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ کمزوری لگ رہی ہوگی۔ تھوڑا دودھ پی لو'' بیوی ہنستے ہوئے بولی۔

''لے آؤ'' میں نے کہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے بینگن کے ایک لمبی ڈکار آئی۔ بیوی جب دودھ کا گلاس لے کر آئی تو اُس کے ہاتھ میں پنکھا بھی تھا۔ اس وقت امس بے تحاشہ بڑھ گئی تھی۔

ہاتھ کا پنکھا ہمیشہ سے عورت اور مرد کے محبت بھرے تعلقات کی علامت رہا ہے۔ مرد کے سفر سے واپس آنے پر، پرانے زمانے کی عورت ایک ہاتھ میں دودھ کا کٹورہ اور دوسرے میں پنکھا لے کر اُس کا استقبال کرتی تھی۔

میری بیوی کے ہاتھ میں جو پنکھا تھا اس میں ایک خوشبو دار گھاس بھری ہوئی تھی یا شاید گیہوں کے ڈنٹھل تھے۔ اس پر جو غلاف چڑھا تھا، وہ ریشمی اور رنگین تھا۔ یہ پنکھا ''لوک کلا'' کا بہترین نمونہ تھا۔

دودھ کا گلاس ہاتھ میں لے کے جیسے ہی میں نے اُسے ہونٹوں سے لگانا چاہا، اچانک میری نظر بغل والے دروازے پر پڑی۔ وہ وہاں ہاتھ میں بڑا سا چُھرا لیے خاموش کھڑا تھا۔ اُس کی کھال کا زرد رنگ اس وقت تانبے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ اندر دھنس گئی تھیں مگر گالوں کی نکیلی ہڈیاں باہر اُبھر آئیں تھیں۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مجھ پر جھپٹا اور اپنے بونے پن کی پوری قوّت کے ساتھ میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔

جب چُھرے سے وار کیا گیا تھا تو بیوی نے جھپٹ کر پنکھے کی ڈنڈی میرے مُنھ میں گھسیڑ دی۔ حلق تک میں نے اس ڈنڈی کو محسوس کیا۔ میرے اندر سے خون کی قے باہر آئی جو شاید پنکھے کے شوخ رنگوں والی کشیدہ کاری پر جم کر رہ گئی ہوگی۔

اُس کا چہرہ مجھے ایک وحشی گھوڑے کا سا نظر آیا جس کی تھوتھنی سے سفید جھاگ نکل رہے تھے۔ چھرے کے وار سے پہلے تو سارے جسم میں صرف چیونٹیاں سی رینگی تھیں مگر پھر فوراً ہی تکلیف کے مارے میرا سر پھٹنے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جہاں جہاں چھرے کا وار کیا جاتا تھا وہاں تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ تکلیف بس سر میں ہو رہی تھی جس میں شاید انتہا تک پہنچی میری حیرت زدگی بھی شامل تھی۔

تھوڑی دیر پہلے کا صاف ستھرا فرش اب پوری طرح خون سے تر تھا اور اس میں میرے ہاتھ سے گر گئے دودھ کی سفیدی بھی آہستہ آہستہ شامل ہوتی جا رہی تھی۔

میرا خیال ہے کہ چُھرے کے ان بھیانک واروں سے میں قدرے سکون کے ساتھ

مرجاتا مگر ہاتھ کا پنکھا میرے لیے ایک مہلک حیرت زدگی کا باعث بن گیا اور دورانِ موت ہی کسی منحوس لمحے میں میرا ذہن پاگل ہوگیا۔

پنکھا میری بیوی اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی اور اس کی سرخ گوٹ بڑے چاؤ کے ساتھ اُس نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔

کہیئے۔۔۔ اب دیکھا آپ نے لوک کلا کا تشدد؟ یہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ اسے بس ایک غلط زاویے سے موڑ دینے پر ہی وہ تباہ کن بن جاتا ہے۔ مشین بے چاری اس طرح اُلٹے سیدھے طریقے سے تو چل ہی نہیں سکتی اور پستول، تلوار یا چُھری سے آپ کسی کو پنکھا بھی نہیں جھل سکتے۔

دیکھیے میری ذہنی رو بہک رہی ہے۔ مجھے بے اختیار افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے شادی کیوں کی؟ ایک بندر کیوں نہ پال لیا جو سیکھ جانے کے بعد مجھے پنکھا بھی جھل سکتا تھا۔

مرتے وقت مجھے اتنا بھی یاد ہے کہ بعد میں، بیوی نے گھبرا کر نیم کے خلالوں کے گُچھے کو طاق سے اُتار کر اسے میری آنکھوں میں دیوانہ وار چُبھایا تھا مگر میری آنکھیں ساکت وجامد تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ میری جان میرے حواس سے پہلے ہی نکل گئی ہو کیونکہ بہت دیر تک میری آنکھوں میں سامنے کھونٹی پر لٹکتا ہوا چابیوں کا گچھا اور برابر میں میرے سیاہ موزے ہی ہلتے ہوئے نظر آتے رہے تھے یا شاید آخری منظر وہ تھا جب وہ الگنی پر کپڑے ٹانگنے والی لوہے کی چٹیوں میں میری ناک کے بانسے کو پھانس رہی تھی۔

دراصل وہ بھی اعصاب زدہ اور حواس باختہ ہوگئی تھی۔ کتیا۔ چھنال!

اس کے بعد جو بھی دیکھا ہے وہ انسانی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے۔ مثلاً جب میری رُوح بُھوت بن کر خلا میں اُوپر اُٹھ رہی تھی اس وقت ایک نوزائیدہ معصوم بچّے کی رُوح بھی اسی خلا میں تقریباً مجھے چُھوتی ہوئی گزر گئی۔ شاید اس بچّے کی موت کا وقت بھی وہی تھا جو میری موت کا تھا۔

میری لاش کے پوسٹ مارٹم میں سب سے اہم مگر نہ سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ میرے جسم اور چہرے کا اچھا خاص گوشت چیل کوؤں کے کھانے کے باوجود اور سڑ جانے کے بعد بھی، میرے گالوں کی کھال اور گردن پر آنسوؤں کے گہرے کھاری نشان جمے ہوئے پائے گئے۔ یہ آنسو کب نکلے تھے اور کیسے اب تک وہاں موجود رہے، یہ میرے لیے بھی ناقابلِ فہم واقعہ ہے۔

بُھوت بن کر آپ کی دنیا کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ آپ کی دنیا کا آخری خوبصورت منظر وہ تھا جب کچھ دن پہلے میں نے کوڑھیوں کو رات میں بارش میں نہاتے دیکھا۔ وہ اپنی خارش کو کم کرنے کے لیے نہا رہے تھے اور خوش ہوکر کوئی گیت بھی گا رہے تھے۔ بس یہی منظر تھا جسے دیکھ کر مجھے زندگی پر رشک آیا اور پھر میں اُداس ہوگیا۔

آپ بُرا نہ مانیں تو میں کہوں کہ آپ کی دنیا میری صورت سے بھی زیادہ کریہہ ہے۔ یہ ایک خالی سینما گھر کی طرح ہے جہاں کوئی فلم کا پردہ نہیں ہے۔ پھر بھی ایک فلم چلتی ہے خدا کے ذریعے یا پھر یقیناً شیطان کے ذریعے۔

نہیں میں نے اُن دونوں سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ میں مرنے کے بعد پھر اُس گھر کی طرف کبھی بھٹکا بھی نہیں جو کبھی میرا ہی تھا اور جہاں اب وہ دونوں بہت آرام سے رہ رہے ہیں۔

اُن سے بدلہ لینے کے بجائے میں نے تفریح کرنا ہی بہتر سمجھا۔ آپ کی کائنات میں انتقام، انصاف، سزا، وغیرہ بڑے الفاظ ہیں مگر ہم بُھوت انہیں بہت کھلنڈرے انداز میں قبول کرتے ہیں۔ انتقام لینا سوائے وقت کی بربادی کے اور کچھ نہ تھا اور پھر ہماری دنیا کی اپنی شرائط ہیں، مجبوریاں ہیں جو آپ کی سمجھ میں ہرگز نہیں آسکتیں۔ بس اتنا ضرور سوچ کر دیکھیں کہ یہ جو لوگ تنگ آکر موت کی دُعا مانگتے ہیں یا موت کو جو عظیم اور ابدی چھٹکارہ کہا گیا ہے، یہ ایک غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اصل پریشانی مرنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہو۔

اب میں آپ کو یہ کہنے سے نہیں رُوک سکتا کہ یہ ''کہانی'' نہ ہوکر صرف ایک لطیفہ ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھیے کہ ہر لطیفے کی اپنی ایک نجی دہشت ہوتی ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ دہشت لطیفے سے رینگ رینگ کر کب باہر آتی ہے اور کس بدنصیب رُوح کو اپنے لیے منتخب کرتی ہے۔

بلّی بن کر بہت بھٹک چُکا ہوں۔

اب میں واپس اپنے کھنڈر کی طرف آرہا ہوں۔ وہ سینما ہال اب نہیں ہے اُس کی کرسیاں بھی نیلام ہوچکی ہیں، کب کی بات ہے جب میں اُس بازار میں فلم دیکھنے گیا تھا جسے سینما گھر بھی کہتے ہیں، مگر وہاں کوئی تصویر نہیں تھی۔ بس تنے ہوئے کفن کی طرح ایک سفید پردہ تھا۔ میں اس ویرانی سے اُکتا کر بازار سے اپنے لیے ایک جوڑا جراب خرید لایا جو میرے غیر مرئی پیروں میں آ ہی نہیں رہا ہے اور اُن سے الگ لٹک رہا ہے جیسے ہوا کی کھونٹی پر ٹانگ دیا گیا ہو۔

آپ کی دوپہر اب ڈھل چکی ہے۔ لو کے جھکڑ بھی کم ہوگئے ہیں۔ میں آپ کو اس فلم کی واپسی کا ٹکٹ مفت دیتا ہوں اور آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔

پس نوشت: (قصہ نویس کا ایک مختصر سا نوٹ)

''اب وہ پوری طرح میری نظروں سے اوجھل ہوچکا ہے۔ وہ ایک بھیانک سیاہ دلدل میں اُتر چکا ہے۔ اُسے اپنے ''سُر'' اور اپنی ''لے'' کے لیے ایک آلۂ موسیقی مل گیا ہے اور اُس نے وہ پراسرار دُھن بجانا شروع کردی ہے جو اس کے وجود ہی کی طرح تجریدی ہے۔ اس کے چاروں طرف خطرناک جانوروں کی دھاڑیں اور زہریلے حشرات الارض کی سرگوشیاں ہیں۔ میں اس دلدل سے باہر کھڑا ہوں۔ کچھ دیر تک میں اُس کی اس دُھن کو سنوں گا اور پھر اُسے ہمیشہ کے لیے اسی دلدل میں دھنسا ہوا چھوڑ کر واپس لوٹ آؤں گا۔''

مٹّی کا تعاقب

''اور وہ دن
وہ دھند لکا، وہ ویران موڑ
جس میں کسی کا ہارا ہوا دِل تیاری کرتا ہے
مرنے کی''

(پابلو نرودا)

یہ آندھی کے آنے سے ٹھیک پہلے کا اُجالا تھا۔ خوبصورت مگر مٹتا ہوا اُجالا۔ آندھی کا کالا مٹیالا غبار آ کر آسمان کے ایک ٹکڑے پر ٹھہر گیا تھا۔ اسی چھوٹی سی ندی کے کنارے بنے ہوئے پوسٹ مارٹم ہاؤس کی تمام اشیا اِس خاموش اُجالے میں اچانک زیادہ بامعنی، انوکھی اور پاکیزہ نظر آئیں۔ سُورج ویسے بھی ڈوبنے ہی کو جارہا تھا۔ سیاہ ہونے سے پہلے کی اُداس سفیدی میں وہ لاش بھی زیادہ بامعنی ہو اُٹھی تھی۔

ابھی ہوا بالکل ساکت ہے۔ ندی کنارے اُگے ہوئے درخت پتھروں کے مجسموں کی طرح قائم اور دائم کھڑے ہیں۔ قطار سے کھڑے، وہ ایسے اداکار نظر آتے ہیں جنہیں بس ایک اشارے کا انتظار ہے۔ آندھی کا ایک جھونکا اِس منظر کو بدلنے ہی والا ہے۔ ایک کالی لکیر، سفیدی

اور اُجالے کی طرف رینگتی ہوئی آئے گی اور اسے پونچھ کر رکھ دے گی۔ سب کچھ قابلِ رحم حد تک اکیلا، بکھرتا ہوا اور اُجاڑ نظر آئے گا۔

لاش کسی ادھیڑ عمر کے آدمی کی تھی۔ صبح سے اسی جگہ، مُردہ گھر کے پتھریلے چبوترے پر پوسٹ مارٹم کے لیے پڑی ہوئی تھی۔ مرنے والے کے جسم پر وہی لباس تھا جو اُس نے کل رات پہنا تھا اور پھر ریلوے پلیٹ فارم پر سے نیچے اُتر کر ایک ریل گاڑی کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

بھورے رنگ کی سُوتی قمیص اور کالی گھسی ہوئی پتلون جس کی دونوں جیبوں کے بدرنگ استر خالی تھیلیوں کی طرح باہر لٹک رہے تھے۔ پیروں میں ناپ سے بڑی بڑی ہوائی چپلیں۔ سر گنجا ہونے لگا تھا۔ ماتھے پر ایک بڑا سا گومڑا اُبھر آیا تھا۔ سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا مگر کلائیاں بے حد پتلی پتلی سی تھیں۔ ہاتھوں کی اُنگلیاں بھی چھوٹی مگر قدرے فربہ تھیں جن کے تقریباً سارے ناخن غائب تھے۔ اُسے اُنگلیوں کے ناخنوں کو ہر وقت دانتوں سے کُترنے کی عادت تھی۔

لاش کے کان اور ناف سے خون رِس رہا تھا۔ مُردہ گھر کے سامنے ندی کے دُوسرے کنارے پر شمشان گھاٹ بھی تھا مگر اس وقت وہاں کسی جلتی چتا کی روشنی نہ تھی۔ دو سؤر لاش کے آس پاس بھٹک رہے تھے۔ کچھ مکھیاں اپنے گندے سبز پروں کے ساتھ بار بار بھٹکتی ہوئی لاش کے مُنھ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر لاش کے سرہانے بیٹھا ایک اُداس اور کمزور بندر بار بار دانت نکوس کر انھیں ہراساں کر دیتا تھا۔

کل رات تقریباً گیارہ بجے وہ شہر کے اُس مضافاتی علاقے میں بنے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر کھڑا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ پلیٹ فارم ویران تھا اور وہاں بہت عمدہ ہوا چل رہی تھی جو کہ اس قسم کے اسٹیشنوں پر ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔

سگریٹ پھینک کر وہ لنگڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر لگے نل پر گیا اور اُس کی ٹونٹی سے گرتی ٹھنڈے پانی کی دھار سے اپنے حلق کو جی بھر کر تر کیا پھر زور زور سے کُلیاں کیں۔ اُسی وقت ریلوے لائن پر لگے سگنلوں کے رنگ میں تبدیلیاں ہوئیں اُس نے اپنی بھوری قمیص کی آستین سے اپنے ہونٹ اور ٹھوری پونچھے، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلیٹ فارم کے سِرے پر جا کر کھڑا ہوگیا۔

دُور روشنی کا ایک نقطہ چمک رہا تھا۔ لوہے کی پٹریوں کی جیومٹری واضح ہونے لگی۔ وہ آہستگی اور وقار کے ساتھ پلیٹ فارم سے نیچے اُتر کر پٹری پر کھڑا ہوگیا۔ پٹری کے ارتعاشات نے اُس کے پیروں کو وہاں ٹکنے نہ دیا۔ اُسے اس وقت وہاں غور سے دیکھنے والا کوئی نہ تھا، سوائے سیاہ رنگ کے ایک بڑے سے کتّے کے۔

وہ ریل سے کٹ نہ سکا۔ دُھواں اُگلتے ڈیزل انجن نے اُسے پتہ نہیں کس زاویے سے چُھوا کہ پٹری سے ہٹ کر بائیں طرف وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ اُس کا سر زمین سے دو بار ٹکرایا۔ پھر وہ ساکت ہوگیا۔ اب اُس کی لاش کے ساتھ تقریباً وہی سلوک ہو رہا تھا جو لاوارث لاشوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُس کا کوئی رشتہ دار شاید زندہ نہ تھا۔ وہ جس ادارے میں کام کرتا تھا، اُس کے دو لوگ لاش کے ساتھ ضرور تھے۔ پولیس ضابطے کی کارروائی اور تفتیش مکمل کر چکی تھی۔

آج صبح پو پھٹ رہی تھی جب اُس کی لاش کو ریلوے لائن سے اُٹھا کر باہر کھڑے ایک ٹرک میں ڈال دیا گیا۔ جیسے ہی یہ ٹرک پوسٹ مارٹم ہاؤس جانے کے لیے اسٹارٹ ہوا، جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر ایک کمزور اور چھوٹا سا بندر ٹرک کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

پورا دن گزر گیا مگر پوسٹ مارٹم کے لیے ڈاکٹر کا پتہ نہیں ہے۔ آس پاس چند اور لاشیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ماحول میں مذبح جیسی بُو اور بساندھ سرسرا رہی ہے۔ لاشوں پر بُغدے اور کلہاڑیاں چلانے والے پوسٹ مارٹم ہاؤس کے ملازمین اپنے بے حس یا وحشی چہروں کے ساتھ صُبح سے ہی شراب پی رہے ہیں۔ نشے میں دُھت ہو کر وہ آپس میں دھینگا مشتی کرتے ہوئے ایسے فحش لطیفے بھی سُنا رہے ہیں جو کہ مُردوں کے پوشیدہ اعضا سے متعلق ہیں۔ اس دھینگا مشتی میں بار بار اُن کے گندے چیکٹ تہبند کُھل کُھل جاتے ہیں جن سے گھٹیا شراب اور کچّے گوشت

کی بدبو اُڑ کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کے لیے لائی گئی دُوسری لاشوں کو گھیرے میں لیے اُن کے لواحقین بیٹھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُن کی عورتیں آسیبی آواز میں بین کرنے لگتی ہیں۔ اُن کے رونے کی یہ آسیبی صدائیں اُس پتلی سی ندی کے پانی میں کوئی ہلچل نہیں پیدا کرتیں۔

اس لاش کے سرہانے صرف وہ کمزور اور اُداس بندر بیٹھا ہے جو نشے میں دُھت، فحش لطیفے اور گندی باتیں سُناتے ہوئے وحشی چہروں والے ملازمین کو کبھی حیرت اور کبھی ملال کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

آندھی آ گئی ہے۔ میرے ناخنوں اور آنکھوں میں ریت بھرنے لگی۔ میں جس لاش کے سرہانے بیٹھا ہوں وہ میرے مالک کی ہے۔ یہ میرا دُوسرا مالک ہے۔ اس نے مجھے مرنے سے بچایا تھا۔ مرنے سے تو مجھے ایک معصوم فرشتے نے بھی بچایا تھا۔ میرے پہلے والے مالک نے مجھے زہر دیا تھا۔ وہ ایک سرکس چلایا کرتا تھا۔

یہ بالکل ویسی ہی آندھی ہے۔ ویسی ہی آندھی جو ایک بار، بہت سال گزرے آئی تھی اور ہمارے سرکس کا پنڈال اُکھڑ کر دُور جا گرا تھا۔ وہ رات کا شو تھا۔ جھولے والے خطرناک، مقبول اور جان لیوا کرتب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اچانک اُس آندھی نے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ سارے فنکار اور جوکر اپنی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔ زمین کانپ رہی تھی۔ چاروں طرف دِل اور سینے کو چاک کرتا ہوا آندھی کا بھیانک زناٹا تھا۔ جس میں جوکروں کے مُنھ پر پُتا ہوا سفید رنگ کچی مٹی میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ سارے جانور، ہاتھی، شیر، طوطے اور بندر بُری طرح سہم گئے تھے۔ سب نے اپنی گردنیں ڈال دی تھیں اور بُری طرح کانپنے لگے تھے۔ میرا دِل بھی بھیانک اندیشوں میں گھر کر بُری طرح اُچھلنے لگا۔ کیا آدمی کیا جانور سب کے چہرے فق تھے۔ ایک پل کو مُجھے محسوس ہوا کہ ہمارا سرکس ڈوب رہا ہے۔ بالکل اُسی مشہور زمانہ عظیم سرکس کی طرح جس کے بارے میں، میں نے سُنا تھا کہ وہ سمندر کے اُس

جہاز کے ساتھ ہی پانی کی تاریک گہرائیوں میں غرق ہو گیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ اپنے تمام کلاکاروں اور جوکروں اور جانوروں کے ساتھ سمندر پار کہیں جا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کب وہ آندھی تھم گئی تھی۔ مگر ہمارا سرکس دوبارہ اپنا پنڈال زمین پر نہ گاڑ سکا۔ پنڈال کی اندر سمائی گئی ڈھول اور آندھی کا گرد و غبار ٹیلہ بن کر کھڑا ہو گیا۔ بدرنگ اور خاک سے اٹی، میلی، دھجیاں ہو گئیں کمزور رسیوں کے جھولے اور سیڑھیاں دوبارہ چکائی اور دُرست نہ کی جا سکیں۔ جانوروں کے لوہے کے پنجرے زنگ کھا کر گلنے اور ٹوٹنے لگے۔ سرکس کی سرچ لائٹ جو اُس چھوٹے سے شہر کے آسمان کو رات میں روشن کرتی تھی، ہمیشہ کے لیے اندھی ہو گئی۔

سب بُھوکوں مر رہے تھے۔ میرے سننے میں آیا کہ ہماری سرکار اب 'سرکس' کو بڑھاوا دینے کے لیے کوئی امداد نہیں دے گی۔ بلکہ یہ بھی کہ اب تو دُنیا کا وہ دُوسرا بڑا اور طاقت ور مُلک بھی سرکس کو نظر انداز کر چُکا تھا جہاں سرکس کو غریب مزدوروں اور بچّوں کی تفریح کا ایک واحد اخلاقی ذریعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ مُجھے نہیں معلوم کہ دُنیا کے حالات اور معاملات میں کیا تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ کون سی ایسی تفریحات، کھیل اور تماشے وجود میں آ گئے تھے جو سرکس کو حاشیے پر دھکیل چکے تھے۔ مگر کوئی خطرناک تماشہ تھا ضرور جو سب کچھ مسمار کیے دیتا تھا۔ اُس کا پُر اسرار اور بے رحم حملہ پتہ نہیں کون سے نادیدہ مقامات سے جاری تھا۔

تب مالک نے ایک دن سرکس کا سارا سامان، اشیا اور جانور نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کنگال ہو چکا تھا— مجھے گرمیوں کی وہ سخت دوپہر یاد ہے۔ سرکس کا تنبو دھول سے اٹا ہوا زمین پر بے چارگی سے پڑا تھا۔ اُس میں جگہ جگہ بڑے بڑے سُوراخ تھے۔ میلی رسیّوں کے جُھولے اور اُن کے گُچھے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم وہ سرچ لائٹ ہی تھی، وہ روشنی جو رات میں گھوم گھوم کر شہر کے آسمان کو چند لمحوں کے لیے روشن کر دیتی تھی، ڈھلتی دوپہر میں، ٹوٹی پھوٹی سی اور زنگ سے خستہ حال ہو کر، زمین پر اِدھر اُدھر لڑھک رہی تھی۔

ہمارے فنکاروں اور جانوروں کے پیٹ میں روٹی نہ تھی۔ اُن کے تن کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ رہے تھے۔ ایک ہاتھی کی آنکھوں سے تو ہمیشہ آنسو بہتے رہتے تھے۔

یہ سب دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں ایک معمولی چھوٹا سا غریب بندر کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔

پتہ نہیں کیا کیا نیلام ہوا۔ شیر اور ہاتھی، عجائب گھر والے لے کر چلے گئے۔ اس عرصے میں چھوٹے چھوٹے جانور جیسے بندر، طوطے اور کبوتر بہت بیمار پڑ گئے تھے۔ خاص طور سے طوطوں کی لیس دار بیٹوں سے سارا خیمہ بھرا پڑا تھا۔

سرکس کے مالک نے بیمار جانوروں کو زہر دے کر مارنے کا منصوبہ بنایا۔ میں بھی بیمار تھا۔ مجھے اُس قسم کی اُلٹیاں آ رہی تھیں جو بچپن میں مجھے اُس وقت آئی تھیں جب مجھے سڑکوں پر مداری کے ساتھ تماشہ دکھانے والے اپنے ماں باپ سے جُدا کر کے سرکس لایا گیا تھا۔ میں بخار میں جل رہا تھا۔

اُس شام خیمے میں زہر ملا کر آٹا گوندھا گیا۔ بیمار طوطوں اور کبوتروں کو کھلانے کے لیے آٹے کی گولیاں تیار کی گئیں اور میرے لیے خاص طور پر ایک بڑی سی ملائم گول چپاتی پکائی گئی۔ جب وہ چپاتی میرے سامنے لائی گئی تو میں نے اپنا سر گھما لیا۔ مجھے قے آنے لگی۔ تب سرکس کے مالک نے غصّے سے میری پیٹھ پر اپنے جُوتے کی نوک سے لات رسید کی۔

سرکس کا مالک ایک قوی ہیکل عیسائی تھا۔ اُس کی آنکھیں اور سر کے بال قطعی طور پر بھورے تھے مگر حیرت انگیز حد تک اُس کے جسم کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ اُس وقت میں نے اُس کی آنکھوں میں جو شدید بے رحمی دیکھی، وہ شاید پہلے کبھی سامنے نہ آ سکی تھی۔ اس بے رحمی سے ڈر کر میں اپنے بخار زدہ جسم کے ساتھ دو پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا ہاتھ سُونگھ کر میں نے دو تین قلابازیاں کھا کر اُسے خوش کرنے کی کوشش کی۔ پھر اُس کے سامنے پُھوہڑ پن کے ساتھ وہ تمام کرتب دکھانا شروع کر دیے جن کی وجہ سے سرکس میں میری شہرت تھی۔ مگر ایک تو وہاں اب ایسی اشیا نہیں تھیں جو کرتب دکھانے میں میری ساتھی اور مددگار ہوتی تھیں، دوسرے اب میں نے صاف طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس بار مار کھانے سے بچنے کے لیے کرتب دکھانا بے کار تھا۔ اب تو مجھے زہر بھری چپاتی ہی کھانا تھی۔

سرکس کا وہ نوکر جو جانوروں کو ہمیشہ کھانا ہی کھلانے آتا تھا، اس وقت بیمار طوطوں اور کبوتروں کی چونچیں چیر کر اُن میں زہر بھرے آٹے کے گولے ٹھونس رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں مچل رہے تھے اور اُن کے پر جگہ جگہ سے ٹوٹ کر خیمے میں اُڑتے پھر رہے تھے۔

اچانک وہاں سرکس کے مالک کی چھوٹی سی بچّی آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

''ڈیڈی، اس بندر کو مت مارو'' بچّی نے اپنے سخت گیر باپ کی پتلون کا پائنچہ کس کر پکڑ لیا۔

''چُپ رہو۔ یہ جانور بیمار ہیں۔ میرے پاس ان کے علاج کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سسک سسک کر مریں اس سے اچھا ہے کہ ایک بار ہی میں ان کا خاتمہ ہو جائے۔''

''نہیں۔ یہ بندر میرا ہے۔ میں اسے پالوں گی؛'' بچّی رونے لگی۔

خیمے کے ایک گوشے میں دم توڑتے ہوئے طوطوں اور کبوتروں کا ڈھیر اُبھرنے لگا۔ سرکس کے مالک نے ایک زور کا طمانچہ بچّی کے گال پر رسید کیا۔ میں نے اس طمانچے کی بے رحم، سخت اور کریہہ چوٹ سے اپنی تھوتھنی کو ڈھکتے پایا۔ میں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور سر جُھکا کر زہر بھری روٹی کھانے لگا۔ سرکس کا مالک روتی بلکتی بچّی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ بچّی روتے روتے بار بار مُجھے مُڑ کر دیکھے جاتی تھی۔

آندھی کے غبار بھرے جھکّڑ بارش میں تبدیل ہو گئے تھے۔ فضا میں چھائی ساری دُھول، خاک اور مٹّی بہہ بہہ کر زمین میں جذب ہونے لگی۔ بھیگتے ہوئے سوئر بے ہنگم انداز میں اِدھر اُدھر بھاگے۔ مُردہ گھر کی گوتھک طرز کی بنی چھوٹی سی عمارت دھند بھری بارش کے شور میں ڈوبنے لگی۔

لاش بارش میں بھیگ رہی تھی۔ لاش کا چہرہ پانی سے دُھل دُھل کر شفاف اور تر و تازہ

نظر آیا جیسے اُس نے ابھی ابھی شیو کیا ہو۔ لاش کے کانوں اور ناک سے نکلا خون بارش کے پانی میں بہہ بہہ کر گم ہو رہا تھا۔ مگر صبح سے رستے رہے خون نے جم کر پتھریلے چبوترے پر سیاہ رنگ کا جو بڑا سا دھبہ بنالیا تھا، وہ اپنی جگہ بدستور تھا۔ اسی دھبّے کی شکل کچھ کچھ تاش کے پتّے سے ملتی تھی۔

چھتری لگائے ہوئے ایک دراز قد عیسائی ڈاکٹر عمارت میں داخل ہوا۔ اُس کی سیاہ رنگت پر اُس کی قطعی بُھوری آنکھیں اور بال غیر مناسب اور خطرناک نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر کے قدم نشے میں لڑکھڑا رہے تھے۔

دو لوگوں نے مل کر لاش کو اُٹھایا جس طرح کسی وزنی بوری کو اُٹھاتے ہیں۔ پھر وہ اُسے پوسٹ مارٹم کے لیے اندر کے کمرے میں لے جانے لگے۔ لاش کے سرہانے بیٹھا بھیگتا ہوا بندر خاموشی سے اُٹھا اور سامنے لگے ایک گھنے سے درخت کے نیچے تاریکی میں جا کر بیٹھ گیا۔ بارش کے شور میں دُور کسی لاش کے آس پاس سے کچھ عورتوں کے رونے کی آوازیں اُبھریں پھر ہوا کے رُخ نے اُنھیں معدوم کر دیا۔

مرنے والے کے ادارے میں کام کرنے والے دو آدمیوں نے اطمینان کی سانس لی۔

''اب زیادہ وقت نہیں لگے گا،'' ایک نے سگریٹ سُلگایا۔

''ہاں۔ اب تو بس مشکل سے پندرہ بیس منٹ'' دوسرے نے جواب دیا۔

''یار۔ یہ لوگ بڑی بے دردی سے اوزار چلاتے ہیں۔''

''ان کا روز کا کام ہے۔ اس لیے تو نشے میں دُھت رہتے ہیں،'' دوسرا بولا۔

''ہاں کیا کریں — مگر سنتا ذرا کیا اندر کمرے میں کوئی فلمی گانا بھی گا رہا ہے؟''

''شاید۔ دھیان بٹانے کے لیے وہ گانا گا رہے ہوں۔''

''ویسے ان لوگوں کو کرنا کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ بس جگر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اُس سے رپورٹ تیار کی جاتی ہے،'' پہلے نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تم دیکھ لینا۔ رپورٹ میں ریبز کی بات ضرور نکل کر آئے گی۔''

''احمق ہو گئے ہو۔ ریبز کے دورے اس طرح نہیں پڑا کرتے۔ کتّے نے تو اُسے شاید کبھی بچپن میں کاٹا تھا۔''

''نہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اکثر وہ اس طرح کا برتاؤ کرتا تھا۔ بہکی بہکی باتیں، چہرہ لال اور پانی پینا بالکل بند کر دیتا تھا،'' دوسرا تیزی سے بولا۔

''خیر جو بھی ہو۔ اگر ہمیں بھی تھوڑی شراب مل جاتی تو کیا خوب تھا۔ دیکھ رہے ہو آج موسم کتنے مزے کا ہو گیا ہے۔'' پہلے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ مگر آج ہمارے نصیب ایسے کہاں،'' دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کل کو داہ سنسکار۔

''بھی ہمیں ہی کرنا پڑے گا۔ ویسے بڑے صاحب نے اپنی جیب سے کافی مال دے دیا ہے۔ ورنہ چندے کی نوبت آجاتی۔''

''آج کل لکڑی بہت مہنگی ہے۔ کفایت سے کام لیں گے،'' پہلے نے مشورہ دیا۔

''یہ تو پنیہ کا کام ہے۔ اس میں تو ویسے بھی کفایت ہی کرنا چاہیے،'' دوسرا ہنس پڑا۔ بارش رک گئی۔ صرف پیڑوں سے بوندیں گر رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سناٹے میں اندر کے کمرے سے کچھ عجیب سی آوازیں آئیں۔ جیسے کسی سخت شے پر لوہے کی وزنی شے سے وار کیا جا رہا ہو۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اچانک مُردہ گھر کی بجلی فیل ہو گئی۔ اندر سے آنے والی آوازیں بھی تھم گئیں۔

تھوڑی ہی دیر میں دھواں اُگلتا ہوا، بے ہنگم شور برپا کرنے والا جنریٹر چلنے لگا۔

جنریٹر کے اس مُہیب شور میں اگر پھر وہ آوازیں اُبھری ہوں گی تو دب گئی ہوں گی۔ کم از کم اُن دونوں نے اب اُن آوازوں کو نہیں سُنا۔

یہ جو میرے سینے پر لگاتار پوری طاقت کے ساتھ لوہے کا سیاہ، سخت اور بدہئیت ہُتھوڑا

چلایا جارہا ہے، کیا آپ کو لگتا ہے کہ مجھے تکلیف نہیں ہو رہی ہے؟

آپ تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں بلکہ یقین کرتے ہیں کہ رُوح میرے جسم سے پرواز کر چکی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر رُوح نام کی کوئی شے ہے تو ابھی وہ میرے جسم سے نکل کر باہر نہیں گئی ہے، نہ ہی اُس کا میرے جسم کے مساموں سے دُھواں بن کر نکلنے، حقیقت مطلق بن جانے اور کسی درخت پر بے نیازانہ بیٹھ کر میرے جسم کا نظارہ کرتے رہنے کا اُس کا کوئی ارادہ ہے۔

دراصل آتما نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں ایک لاش ہوں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لاش بھی ایک جسم ہے اور جسم کبھی مرتا نہیں۔ اُسے فنا نہیں آتی۔

مجھے بُغدے کے ان بھیانک واروں سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ مگر میرا یہ جسم اب تکلیف، دُکھ اور سُکھ کا ردِعمل دوسری طرح کرتا ہے۔ آپ کے لیے یہ صرف خاموشی ہے۔ اصل میں جس چیز کو آپ موت کا نام دیتے ہیں، وہ آپ جیسے نام نہاد زندہ انسانوں سے اُن کا ایک آلۂ حواس چھین لیتی ہے۔ نقصان آپ ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایک خوفناک کمی آپ لوگوں میں واقع ہوتی ہے یعنی زندوں میں۔ مُردوں میں ہرگز نہیں۔

ہر انسان کی موت کے بعد آپ زیادہ معذور ہوجاتے ہیں۔ ایک حس سے محروم۔ میرے ساتھ یہ جو بے رحمانہ برتاؤ ہورہا ہے۔ وہ اس لیے کہ پوسٹ مارٹم ہاؤس کے تمام عملے کے اشخاص یہی سمجھتے ہیں نا کہ میں مرگیا ہوں اور میری آتما مجھ سے الگ ہوگئی ہے۔

حضرات۔ مجھے کہنے دیں کہ آپ تو ہمیشہ سے ہی جسم کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کے عادی تھے۔ جب آپ کی نظروں میں میں زندہ تھا۔ اُس وقت بھی آپ نے میرے جسم کو ہی دُکھ یا سُکھ پہنچائے تھے۔ رُوح کے لیے آپ کیا کرسکتے تھے جبکہ اُس کا میرے سے وجود ہی نہ تھا۔ وہ جسم ہی تھا جو لنگڑا رہا تھا۔ کھانا کھاتا تھا۔ ذلیل ہوتا تھا اور روتا تھا۔

جسم کوئی ٹین کا کنستر نہ تھا جس میں آتما نام کی کنکریاں پڑی بجتی رہتی تھیں۔ میرے

لیے دُنیا اب بھی تقریباً ویسی ہی ہے جیسی کہ ریلوے کی پٹری پر کھڑے ہونے سے پہلے تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ بس نظر میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ اس طرح ہے جیسے کوئی شخص مدتوں بعد اپنا کھویا ہوا چشمہ حاصل کرے اور اُسے لگا کر دیکھنے پر اشیا اُسے ایک ساتھ پراسرار اور سپاٹ نظر آئیں۔

میں یہ قبول کرتا ہوں کہ اس مادّی دُنیا سے فرار حاصل کرنے کے لیے ہی میں پٹری پر جا کر کھڑا ہوا تھا۔ مگر اب مجھ پر یہ زیادہ بڑی مصیبت آن پڑی ہے۔ یعنی یہ کہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ موت اور زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو بس ایک تبدیل شدہ جیومٹری ہے۔ صرف لکیریں ہیں جو بدل رہی ہیں۔ جس طرح ایک دائرہ بے مرکز ہوکر ناقص بنتا ہے اور جب یہ بے مرکزیت اور بڑھتی ہے تو وہ مکانی زائد بن کر ہماری ریاضی کا امتحان لینے لگتا ہے۔ مگر یاد رکھیے کہ اس میں کسی فلسفے، عرفان یا آگہی اور آتما جیسی کسی شے کا دخل ہرگز نہیں ہے۔ یہ بہت معمولی واقعہ ہے۔ سب کے ساتھ گزرنے والا۔ میں اب بھی زندہ جسم ہوں اگرچہ اپنی پرانی جیومٹری تک واپس پہنچنے کے لیے فی الحال میرے پاس وہ لکیریں مٹانے والی ربڑ نہیں ہے۔

دراصل مجھے مرا ہوا تصور کرلینا آپ کی اُسی طرح کی مجبوری ہے جس طرح جیومٹری کے طالب علم کی مجبوری فرضی نقطوں کو تصور کرنا ہے۔ مگر کیا کوئی ذہین سے ذہین طالب علم بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ فرضی نقطہ دائرے پر ہی واقع ہے؟

اب اُنھوں میرا جگر باہر نکال لیا ہے جو گاڑھے خون میں ڈوبا ہے۔ اس خون سے اُن کے ہاتھوں پر چڑھے سفید دستانے سُرخ ہوتے جارہے ہیں۔

کیا آپ میری درد بھری چیخوں اور آوازوں کو سُن پا رہے ہیں؟ مجھے علم ہے کہ آپ ہرگز نہیں سُن رہے کیوں کہ میرے مُنھ کے اندر پڑا وہ لمبا سا گوشت کا کُھردرا چھیچھڑا قطعی طور پر سُوکھ کر اوپر کی جانب مُڑ چکا ہے۔ افسوس کہ آپ کا سارا علم، سارا زور بیان اور بدیعات اس غلیظ گوشت کے چھیچھڑے کے بُری طرح محتاج ہیں۔

آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ کس کس طرح بولا جاسکتا ہے اور مرنے سے پہلے بھی آپ کو

یہ معلوم ہی نہ ہو سکے گا۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ہم سب مرنے سے پہلے ہی موت کے بارے میں اِتنے یقینی فلسفے، مذہبی اور سائنسی نظریات وغیرہ کو کیسی بے شرمی کے ساتھ گڑھتے رہتے ہیں۔ یہ مضحکہ خیز ہے۔

اب قدرے درد کم ہوا ہے۔ وہ توڑی گئی پسلیوں اور چیرے گئے سینے کو ایک بڑے اور موٹے سُوئے سے سی کر ٹانکے لگا رہے ہیں۔ ان کے مُنھ سے نکلتے شراب کے بھبکوں کو میں خاص اپنی ناک کے بانسے پر محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ہمیشہ سے ہی اسی طرح کے کام کرتے آئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ جسم کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ عہد قدیم میں آپ جسم پر مسالے لگا لگا کر ''ممیاں'' بناتے رہے جو ایک بچکانہ شوق تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ 'آتما' کے 'تخیّل' کا انتقام آپ نے جسم سے اُس کے ساتھ غیر اخلاقی، بے رحمانہ اور بے تکا برتاؤ کر کے ہی لیا ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ اس طرح ''مادّے'' کو اہمیت دینے کے باوجود بھی آپ لوگ ''مادّے'' کے ساتھ کبھی انسانی اور ہمدردانہ سلوک نہ کر سکے۔

اب مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نشے کی کیفیت کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں۔ میرا جسم زندہ ہے۔ آپ سے زیادہ زندہ۔ ہاں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ چند ہی دِنوں میں مجھے مکمل طور پر فراموش کر دیں گے۔ مرنے والوں کے تئیں یہ فراموش کرنے والا احمقانہ مگر بے رحمی سے بھرا ہوا رویہ آپ ابتدائے آفرینش سے کرتے آئے۔ دراصل آپ اپنی ہی تصویر کے قیدی ہیں۔ کچھ کچھ اس اندھے موسیقار کے مانند جو اپنی آنکھوں کی بے نوری کا ازالہ دوسروں کے جسموں کی روشنی کو اپنے بڑے بڑے چمگادڑ کے ڈینگوں جیسے سیاہ ہاتھوں سے روک روک کر کرتا رہتا ہے۔

میری کیفیت اب کچھ اور ہے مگر دُکھ اور سُکھ برقرار ہیں۔ وہ کہیں نہیں گئے ہیں۔ وہ انسان کے جسم کا ازلی مقدر ہیں وہ یہیں آس پاس ہی بھٹک رہے ہیں۔

آپ میرے جسم کو مُردہ سمجھ رہے ہیں؟

نہیں۔ یہ محض ایک کاہلی اور بقول آپ کے نکما پن ہے جو آپ کے لیے قطعی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔

میں سُن رہا ہوں کہ آپ لوگ خودکشی کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ مگر کیا میں خودکشی کر سکا تھا؟

میں تھوڑا پریشان رہنے لگا تھا۔ یا تو نیند آتی ہی نہیں تھی یا نیند میں بھیانک خواب آتے تھے۔ اپنے اُوپر ہلکی سی نامردی کا بھی گمان پیدا ہونے لگا تھا۔ دل ہمیشہ اندیشوں میں گھرا رہتا تھا۔

تو ایک دن میں نے واقعی مرنے کی ٹھان لی۔ یونہی چلتے چلتے اور پھر ایک ٹرین کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔

مگر ہوا یہ کہ ریل کے ٹھنڈے لوہے نے میرے پاؤں کو ہلکے سے چُھوا اور ایک سیاہ کتے کی پرچھائیں کی طرح میرے پاس سے نکل گئی۔

اب میں ایک ایسی کیفیت میں ہوں جیسے میں نے بہت پی رکھی ہو۔ جس طرح آپ کا کمپیوٹر کبھی کبھی سیاہ مست ہو کر چُپ لیٹ جاتا ہے یا کسی ایسے پروگرام میں پہنچ جاتا ہے جس سے پہلے آپ کبھی واقف نہ تھے۔

ممکن ہے کہ یہ بہت ہی زیادہ درد اور تکلیف کا ریلا ہو جسے میرے جسم نے مدافعت کے طور پر نشے اور خاموشی میں بدل دیا ہو۔ ابھی جو وار میرے اُوپر اُس سیاہ دھاردار بغدے سے کیے گئے تھے، اُنھیں نظر انداز کر دوں تو ایمان کی بات یہ ہے کہ اب کسی تکلیف کا احساس نہیں ہے۔

میرے ناک کان سے خون باہر آ رہا ہے مگر یہ سرشاری کی وہ حد ہے جب آپ بہت شراب پینے کے بعد اپنے وجود کی تاریک گہرائیوں میں بھنور کی طرح گھومتی اُلٹیوں کو نالیوں میں انڈیل دیتے ہیں۔

مجھے اس بات کا مجرمانہ احساس ہے کہ یہ جو میں لگاتار بولے جا رہا ہوں، اس کے کوئی

معنی نہیں ہیں۔ اب میرا جسم اُس کمینی اور چھچھوری مسرت سے یکسر خالی ہے جو یہ پہلے کسی کو اپنی بات سُنا کر، یا لکھ کر حاصل کرتا تھا — اب میری یہ تمام بک جھک نہ تو کوئی احساس ہے نہ کوئی جذبہ بلکہ ایک خالص جسمانی جبلّت ہے۔ عظیم مسرت اور عظیم دُکھ دونوں سے محروم۔ یہ کسی کیچوے کے رینگنے جیسا ہے۔ ویسے کیا کبھی آپ نے کیچوے کی آتما کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا؟

میری لاش کو اب مکمل طور پر سی دیا گیا ہے اور ایک چادر میں لپیٹ کر باہر لایا جا رہا ہے۔ میرے کپڑے اور جوتیاں الگ ایک گٹھری میں باندھ دیے گئے ہیں۔ میرا یہ جسم اب سڑنے کے بہت قریب آ چلا ہے۔ کل تک اس کی ہر شے بالکل الگ الگ بہہ کر بکھر جائے گی۔ اجزاء کا پریشان ہونا اور پھر یکجا ہونا شاعری، فلسفہ، مذہب اور سائنس سب کے لیے ہی ایک کلیشے کی صورت اختیار کر چکا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید اجزا کا اپنا ایک مادّہ ضرور ہوتا ہے، جس کے ذریعے اجزا اپنے حصّے کا پُراسرار لُطف اور مسرت حاصل کرتے ہیں۔

بچپن میں مجھے اپنے چچا کی سائیکل پر بیٹھ کر چڈو کھانے کا بہت شوق تھا۔ اب میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا جسم چڈو کھانے کو جا رہا ہے۔ میرے جسم کا کاندھے پر لاد کر باہر لایا جا رہا ہے۔ اندھیرا پھیلا ہے۔ بارش میں بھیگی زمین کچّی دلدل میں بدلتی جا رہی ہے۔ اسی اندھیرے اور دلدل میں میں بندر بھٹک رہا ہوگا جسے میں نے بڑی محنت کے ساتھ اپنی زبان اور تھوڑی سی ابتدائی جیومٹری پڑھائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہر بندر کو جیومٹری کا کچھ نہ کچھ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

میں اب پھر اُس کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ اُس پتھریلے چبوترے سے تھوڑا اُدھر جو زمین کا قدرے اُٹھا ہوا سا حصّہ ہے۔ وہیں وہ لوگ لاش کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ رات بھر میرے مالک کی لاش اس اندھیرے میں سڑتی رہے گی۔ گرمی بہت ہے۔ میری زبان سُوکھ رہی ہے۔ معدے میں جیسے آگ سی بھر گئی ہے۔ مُردہ گھر سے باہر بارش بھی نہیں ہوئی ہے۔ بھیانک

سُوکھا پڑا ہے۔ اس قسم کے موسم میں کوئی انسان یا حیوان صحیح و سلامت نہیں رہ سکتا۔ صرف اونٹ ہی ایسے موسم اور ماحول میں پھل پُھول سکتے ہیں یا پھر خاردار کانٹوں والے ببول۔

میرے مالک کے جسم کا پوسٹ مارٹم کیا جا چکا ہے۔ پتہ نہیں اُس کے نظامِ ہاضمہ کا مطالعہ کیا گیا یا نہیں۔ میں نے جو ایک دو سائنس کی کتابیں دیکھی ہیں اُن میں لکھا ہے کہ انسان کی بڑی آنت ہم جانوروں کے مقابلے میں بہت بڑی ہوتی ہے۔ انسان کو گوشت ہضم کرنے میں یہی مشکل درپیش آتی ہے اور وہ اُس کی بڑی آنت میں پڑا ہمیشہ سڑتا رہتا ہے — شاید یہی وجہ ہو کہ میرا یہ مالک ہمیشہ دستوں کی بیماری میں مبتلا رہا۔ اگرچہ میں اور میرا مالک دونوں اسی خوبصورت اور خونی دُنیا کے بیٹے ہیں۔ مگر دونوں کے درمیان بڑی آنت کا یہ فرق ایک بہت بڑی گتھی کو حل کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ دُنیا میں بڑھتے ہوئے زلزلوں کے واقعات، طوفان، حادثات اور یہ بھیانک سُوکھا — ان سب کے اسباب بڑی آنت میں ہی پوشیدہ ہوں گے۔

مگر اب یہ سب علم اور معلومات بے معنی ہیں۔ اب میں آگے لکھنا پڑھنا کیوں کر جاری رکھوں گا؟ مجھے اب یہ بھی علم ہو گیا ہے کہ اپنی تمام خواہشات کے باوجود نہ تو انسان اور نہ ہی کوئی بندر اپنے مقدر کو بدل سکتا ہے۔

اس انسان نے پانچ سال میری خدمت میں گزارے ہیں۔ اُس نے میری فالج زدہ ٹانگ پر نہ جانے کون کون سے تیلوں سے مالش کی تھی۔ اس نے مجھے ہمیشہ میری مرغوب غذائیں ہی فراہم کیں۔ کیلے، مونگ پھلیاں، عمدہ گیہوں کی سفید روٹی اور اُبلے ہوئے آلو۔ اب تو خیر میرے دانت بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ میں ہر چیز نہیں کھا سکتا۔ میرے بال بہت جھڑنے لگے ہیں۔ قد بھی سُکڑ سا گیا ہے اور تھوتھنی کمزور ہو کر زیادہ مضحکہ خیز اور قابلِ رحم لگنے لگی ہوگی۔

میرے مالک کی بھی ایک ٹانگ خراب تھی۔ مگر اس کے باوجود اُس کا تمام جسم اس عمر میں بھی پُھرتیلا، لچک دار اور چاق و چوبند تھا۔ سرکس میں کام کرنے کے لیے انتہائی مناسب اور موزوں۔

اُس نے نہ صرف میری جان بچائی بلکہ مجھے اولاد کی طرح رکھا۔ اُس نے مجھے جاہل

ہونے سے بھی بچالیا۔ اُس کے گھر پر بہت کتابیں تھیں۔ دُھول سے اَٹی ہوئیں۔ خود تو اُس کا وقت زیادہ تر جُوا کھیلنے اور لاٹری کے ٹکٹ خریدنے میں ہی گزرتا تھا مگر مجھے وہ صبح وشام پابندی کے ساتھ، زبان، ابتدائی ریاضی اور جیومٹری پڑھایا کرتا تھا۔ مجھے اُس کی زبان بولنا تو کبھی نہ آسکا۔ میں نے کوشش تو بہت کی مگر وہ میرے گلے کی خرخراہٹ کے ساتھ مل کر ناقابلِ فہم اور تکلیف دہ بن کر رہ گئی۔ مگر میں انسانوں کی بولی خوب سمجھ گیا ہوں اور کتابوں کو بھی اُلٹا سیدھا پڑھ سکتا ہوں۔ ویسے سچّی بات تو یہ ہے کہ انسانوں کی زبان کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ کائنات کی تمام زبانوں میں کچھ مشترک اور آفاقی عناصر ہوتے ہیں۔

ہاں! جیومٹری کی کتابوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں باقاعدہ اپنے پنجوں میں پرکار، ربڑ اور پینسل دبا کر مشق کیا کرتا تھا۔ ایک بندر کے لیے یہ بہت مشکل نہیں ہے، اگر اُسے اس میں دلچسپی پیدا ہوجائے تب۔ اب میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر مجھے پہلے اتنی جیومٹری آتی ہوتی تو سرکس کی دُنیا میں انقلاب آجاتا۔ سرکس کے اُس آخری خطرناک کرتب میں مہارت حاصل کرنے کے لیے تو جیومٹری کا علم ناگزیر ہے کیوں کہ پنڈال میں لٹکی رسیّوں کی سیڑھیوں، جال اور پھندوں کے زاویے، اُن کی آپسی ڈوریاں، بنتے بگڑتے دائرے، دائروں کے مماسی خطوط اور جذبی محور وغیرہ سے اپنے جسم کو مکمل طور پر ہم آہنگ کرنا ہی اس جان لیوا تماشے سے زندہ اور صحیح سلامت باہر آجانے کی واحد شرط تھی۔

رات بھر تو میں اُس کے گھر کی دیوار پر بیٹھ کر کتّے کی طرح رکھوالی کرتا۔ شام کو جب وہ کام سے واپس آتا تو میں اُس کے پیر دباتا۔ اُس خراب ٹانگ کو اپنی تھوتھنی سے رگڑتا جس پر ایک بھیانک نشان تھا۔ گرمی لگنے پر اُسے اپنے ہاتھ سے پنکھا جھلتا۔ کبھی کبھی اُس کے سر کی جوئیں بھی دیکھا کرتا۔ اُس کے سر اور بال میلے رہتے تھے۔ میں نے غور کیا ہے کہ وہ نہانے سے کتراتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید اُسے پانی سے ہی کچھ خوف آتا تھا۔

جب تک میں اُس کے ساتھ رہا، میں نے ہمیشہ اُس کا پیٹ خراب ہی دیکھا۔ اسی وجہ سے اُس کا وزن لگاتار کم ہو رہا تھا۔ چند سالوں سے اُس کی سگریٹ نوشی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ انسانوں کی نقل کرنا کچھ تو ہم بندروں کا محبوب مشغلہ ہے، کچھ اُس دن میرا جی واقعی سگریٹ پینے کو چاہ بھی رہا تھا۔ میں نے اُس کی عدم موجودگی میں اُس کا ایک ''پاسنگ شو'' سگریٹ نکال کر اپنے مُنھ میں دبایا پھر دیا سلائی جلانے کی کوشش کی۔ ایک زور کا شعلہ لپکا اور میری آنکھوں کو جُھلساتا ہوا چلا گیا۔ میں نے زور سے چیخ ماری اور آنکھوں کو بُری طرح پنجوں سے رگڑنے لگا—

جب جلن کچھ کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دروازے میں ساکت و جامد کھڑا مجھے گھورے جارہا ہے۔

''اگر تُم اندھے ہوجاتے تو میں تُمھیں اس وقت قتل کردیتا۔'' اُس کا لہجہ زندگی میں پہلی بار سرد تھا۔ میرے رُونگٹے کھڑے ہوگئے۔

تھوڑی دیر تک وہ اس طرح کھڑا رہا پھر اُلٹے پاؤں واپس مُڑ گیا۔

ہم بندر سمجھتے ہیں کہ اِنسان کی نقالی کرسکتے ہیں اور اُن کے روّیوں کو سمجھ سکتے ہیں مگر اس دن مجھے یہ احساس ہوا کہ انسانوں کی دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جس کی نہ تو نقالی کی جاسکتی ہے اور جسے نہ ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

اِس درخت کے اُوپر اُلّو بول رہا ہے۔ اِس کی آنکھ اندھیرے میں سب کچھ دیکھ رہی ہوگی۔ وہ آنکھ سے زیادہ ایک ناخن کی طرح ہے۔ زمین کو رگڑتا ہوا اور چھیدتا ہوا ایک خوفناک ناخن۔ کچھ آنکھیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میری ناک کے نتھنوں میں ہلکی ہلکی سی ناگوار بُو آرہی ہے۔

کیا میرے مالک کی لاش سڑنا شروع ہوگئی؟

دس سال کی عمر کے بعد اُسے اُس کے رشتے کے ایک چچا نے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ چچا کی دہلیز پر وہ اپنی اُس ٹانگ سمیت گھسٹتا ہوا گیا تھا جسے کُتّے نے بُری طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ پنڈلی سے گوشت اور کھال کے چیتھڑے اِدھر اُدھر لٹک رہے تھے۔ کتّے کے دانتوں

سے بنے چھید نما زخموں سے خون رس رس کر اُس مٹّی میں جذب ہو رہا تھا جس میں اُس کی پنڈلی اور پنجے بُری طرح لتھڑے ہوئے تھے۔ چچا نے جب اس زخم پر لال مرچیں تھوپ دیں تو وہ چیختا بلکتا ہوا زمین پر لوٹیں لگانے لگا۔

پھر چچا اُسے لے کر اُس نابینا عامل کے پاس گیا جو جادو ٹونے کے علاوہ کتّے کے کاٹے کا علاج بھی کرتا تھا۔ شہر سے دُور جنگل کے قریب ایک ندی کنارے اُس کی کٹیا تھی۔

''تمھیں دس دن تک برابر صبح صبح میرے پاس آنا پڑے گا تازہ گندھے ہوئے آٹے کا ایک پیڑا بنوا کر اپنے ساتھ لیتے آنا'' عامل کی آواز بہت باریک تھی۔ عورت کی باریک سے باریک آواز سے بھی زیادہ باریک — اُسے اس عجیب و غریب آواز سے خوف محسوس ہوا۔

عامل نے آٹے کے پیڑے پر کچھ پڑھا، پھر اُسے زخم پر رکھ کر زور سے دبایا اور اُٹھالیا۔

''یہ دیکھو''

اُس نے دیکھا کہ آٹے کے پیڑے پر کتّے کے کالے بال چپکے ہوئے تھے۔ عامل پُراسرار انداز میں مُسکرا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے سفید تھے۔

وہ پھر ڈر گیا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ اُسے کتّے کے بالوں سے ڈر لگ رہا تھا یا پھر عامل کی اُس مسکراہٹ سے جو اُس کی اندھی آنکھوں سے نیچے نیچے، بس ناک کے بانسے تک ہی آ کر مرگئی تھی۔ وہ مسکراہٹ سے زیادہ ایک دھمکی یا ایک پھسلاوے کی طرح تھی۔ شیطانی بساندھ سے بھری مُسکراہٹ۔

تین دن وہ اپنے چچا کے ساتھ عامل کے پاس جاتا رہا۔ چوتھے روز چچا اُس کے ساتھ نہ جاسکا۔ وہ اکیلا ہی گیا۔ بس آٹے کا ایک پیڑا اُس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اُس وقت عامل کی کٹیا کے آس پاس کوئی نہ تھا۔

صبح کے وقت عامل کے مُنھ سے بدبو آرہی تھی۔ ایسی بدبو رات کو چکنا گوشت کھانے کے سبب سے آسکتی ہے۔ عامل نے کلّا بھی نہیں کیا تھا۔

آٹے کے پیڑے کو زخم پر رکھ کر دباتے دباتے اچانک عامل نے دوسرے ہاتھ سے اُس

کی شرم گاہ کو چھوا۔ عامل کے مُنھ سے پانی جیسی رال بہہ کر ٹھوری آگئی تھی۔ وہ گھبرا کر پیچھے کی طرف ہٹا۔

عامل نے اُسے دبوچ لیا اور اپنے بدبودار مُنھ سے اُس کے گال پر پیار کرنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اِسی جدوجہد میں عامل کی گندی سی دھوتی کُھل کر نیچے آرہی۔ دھوتی پر جگہ جگہ انسانی کھوپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

''ارے۔ بات تو سُن۔ اگر نہیں مانے گا تو پھر سے اُسی کتّے سے کٹوا دوں گا'' عامل کی باریک شیطانی اور نسوانی سی آواز بجائے مُنھ کے، اُس کی آنکھوں کے بے نور اور بظاہر قابلِ رحم دھندے غاروں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی پنڈلی پھر کتّے کے جبڑوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ کتّے کے دانت گوشت اور کھال میں پیوست تھے۔ شاید ازل سے ہی۔

گھر آکر جو پہلا کام اُس نے کیا وہ یہ تھا کہ آنگن میں لگے نل سے بہتے پانی کو دیکھ کر زور کی چیخ ماری۔ اُس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ جسم بخار کی شدّت سے تپنے لگا تھا۔ ناک اور مُنھ سے لیس دار پانی نکل رہا تھا۔

گھر میں موجود مٹکوں، گھڑوں، بالٹیوں، یہاں تک کے پانی کے جگ اور گلاس بھی اُس کے سامنے ہٹا دیے گئے۔ کیوں کہ اُنھیں دیکھ کر وہ بُری طرح خوف زدہ ہو کر چیخیں مارنے لگتا تھا۔

شام آتے آتے اُسے اُلٹیاں آنا شروع ہوگئیں۔ اُلٹیاں کرتے وقت اُس کے حلق اور مُنھ سے ایسی آوازیں نکلتیں جیسے کوئی کتّا بھونک رہا ہو۔

ان اُلٹیوں میں ننھے ننھے، مٹر کے دانے جیسے گوشت کے گلابی لوتھڑے بھی شامل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب وہ مرجائے گا کیوں کہ یہ لوتھڑے دراصل کتّے کے چھوٹے چھوٹے پلّے ہیں جو اُس کے پیٹ میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوگئے ہیں۔

آخر کار اُس کا چچا اُسے اسپتال لے گیا جہاں اُس کے پیٹ میں کتّے کے کاٹے کے

لمبے اور بڑے بڑے انجکشن ٹھونکے گئے۔

وہ بے حد سخت جان ثابت ہوا۔ ایک ماہ کے اندر ہی نہ صرف یہ کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگیا بلکہ اُس کا وزن بھی حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا۔ جب وہ چلتا تو محسوس ہوتا جیسے کوئی گیند لڑھکتی چلی جارہی ہو۔

بس افسوس کہ اُس کی وہ ٹانگ کسی نس کے بے کار ہوجانے کی وجہ سے مفلوج ہوچکی تھی۔ موٹا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے جسم میں کچھ سنسنی خیز تبدیلیاں بھی پیدا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر یہ ناقابلِ فہم مگر لذت آمیز سنسنی کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی تھی۔

شانتی اُس کے محلے میں ہی رہنے والی ایک لڑکی کا نام تھا۔ شانتی کا باپ اُس اسکول میں چپراسی تھا جس میں وہ پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اسکول کا گھنٹہ ہمیشہ شانتی کا باپ ہی بجایا کرتا تھا۔

شانتی کی آنکھیں قطعی طور پر بُھوری اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اُس کے سانولے رنگ پر یہ غیر فطری بھوری آنکھیں دوغلی سی نظر آتی تھیں، جن سے اُس کے جسم کا کوئی گہرا رشتہ نہ تھا۔ یہ کبھی بھی وہاں سے نِکل کر کہیں اور جاسکتی تھیں۔

شانتی کی عمر تو اتنی نہ تھی۔ وہ اُس سے چھوٹی ہی رہی ہوگی مگر اُس کی چھاتیاں بہت بڑی بڑی تھیں۔ اُس کے چھوٹے سے قد پر اِن غیر معمولی طور پر بڑی اور بھاری چھاتیاں دیکھ کر کسی گٹھری کا سا گمان نظر آتا تھا جیسے اُس نے اپنے پیٹ اور سینے سے کس کر باندھ رکھا ہو۔

وہ شانتی کو دیکھنے کے لیے گھنٹوں اُس کے دروازے پر بیٹھا رہتا جہاں خود شانتی کا باپ اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت بیٹھ کر جوا کھیلتا رہتا تھا۔

مگر شانتی کی بُھوری آنکھیں ہمیشہ اُس پر حِقارت کے ساتھ ہنستی رہتی تھیں۔ اُنھی دِنوں شہر میں سرکس آیا۔

سرکس کی سرچ لائٹ جب رات کو تمام شہر کے آسمان پر روشنی کا دائرہ سا کاٹتی تو وہ مسرت اور حیرت سے بھر جاتا۔

ایک دِن وہ اپنے چچا کے ساتھ سرکس دیکھنے گیا۔ سرکس کے تماشوں نے اُس کے دل و دماغ پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ جوکروں کا تو وہ دیوانہ ہی ہوگیا اور اُن کی نقلیں اتارنے لگا۔

گرمی کی سخت دوپہر تھی۔ راستے سنسان پڑے تھے۔ وہ اپنے چچا کی بڑی بڑی ہوائی چپلیں پہن کر وہاں کھڑا ہوا تھا جہاں سے شانتی کے گزرنے کا وقت تھا۔ بُھورے رنگ کی سُوتی قمیص اور کالی گِھسی ہوئی نیکر میں ملبوس، اُس نے اپنے سر پر سرکس کے جوکروں جیسا ہیٹ بھی لگا رکھا تھا۔

شانتی گزری اور وہ سامنے آ گیا۔

''تم نے سرکس دیکھا''؟

وہ رک گئی اُس کی بھوری آنکھیں حلقوں میں تیزی کے ساتھ گھومیں مگر اُس سانولے جسم پر کوئی عکس نہ چھوڑ سکیں۔

''ہاں۔ دوبار دیکھ لیا'' وہ قدرے بھنبھنی سی آواز میں بولی۔

دراصل شانتی کو ناک سے بولنے کی عادت تھی۔ اُس کی ناک شاید حال ہی میں چھیدی تھی کیوں کہ اِس میں اُس نے نیم کا ایک تازہ تنکا ڈال لیا تھا۔ پھر بھی ناک پک رہی تھی اور اُس کا ایک نتھنا سُرخ ہونے کے ساتھ سُوجا ہوا بھی تھا۔

شانتی کی بھنبھنی آواز اور سُوجی ہوئی سرخ ناک نے اُس کے جسم میں لذت کی لہریں پیدا کیں۔

''تمھیں کِسی کا تماشہ پسند آیا؟'' وہ احمقانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

شانتی کی بھاری چھاتیاں پتہ نہیں کیوں ہلنے لگیں۔ پھر اُس نے کہا:

''ہاتھی کا''

''شانتی۔ تمھیں پتہ ہے۔ وہ سب میں بھی کرسکتا ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''کیا؟''

''جوکر کی طرح'' وہ شرما کر کہنے لگا۔

''کر کے دِکھاؤ'' شانتی ناک سے بولی۔

اُس نے ایک بار اِدھر اُدھر دیکھا پھر بے حد سنجیدہ سا چہرہ بنا کر شانتی کی طرح تھپّڑ مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شانتی گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ مگر تب ہی وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی ایڑی پر گھوم گیا اور پھرتی سے وہی تھپّڑ اپنے گال پر رسید کرتے ہوئے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر بھدّی آواز میں رونے لگا۔ سرکس کے جوکر کی طرح۔

خلافِ توقع شانتی کے چہرے پر ہنسی کے کوئی آثار تک نمودار نہیں ہوئے۔ صرف اُس کی آنکھوں میں ایک بے رحمی عود کر آئی۔

وہ مایوس مایوس سا زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اُس نے تہیہ کرلیا۔ یہی تو وقت تھا اظہارِ محبت کا۔

''شانتی سُنو'' کرتب دکھانے کے بعد اب اُس کی سانس پُھول رہی تھی۔

''مجھے۔ مجھے۔ تم بہت اچھی لگتی ہو۔'' اُس کے سر پر لگا جوکروں کا ہیٹ کانپنے لگا۔

شانتی کی ناک میں پڑا نیم کا تنکا اچانک کالا پڑگیا۔ اُس کی باہر کو نکلی بُھوری آنکھیں بے مروّتی کی حدوں کو پہنچ کر اچانک لمبے لمبے ناخنوں میں بدل گئیں۔

''سُنو۔ ہجڑے اور لنگڑے۔ تُم جتنے موٹے ہو اُس سے زیادہ کھوٹے ہو'' شانتی کی غیر انسانی، ناک سے نکلی آواز چمگادڑ کے سیاہ ڈینوں کی طرح اُس کی آنکھوں سے ٹکرائی اُس کے اور شانتی کے درمیان اندھیرا ہوگیا۔ بڑی بڑی ہوائی چپلوں میں اُس کے تلوے ٹھنڈے پڑنے لگے۔ وہ اپنے پسینے میں نہایا اُس اندھیرے میں جھومتا رہا۔ دُور اسکول میں شانتی کا باپ گھنٹہ بجا رہا تھا۔

میں سڑ رہا ہوں۔ میرا جسم بدبو چھوڑ رہا ہے۔ میرے جسم کے اندر جو پانی تھا وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ جسم کے کناروں کو ڈبوتا ہوا باہر آ رہا ہے۔ کچّی زمین کی طرف۔ اس بدبو کو صرف میرا بندر خوش دلی کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے۔ آپ سب کو تو ناک پر کپڑا رکھنا ہی

پڑے گا۔

آپ اِسے سڑنے کا نام دیتے ہیں۔ مگر میرے لیے یہ بہت مزیدار سا تجربہ ہے اور میرے جسم کی قوتِ مدافعت میں بے حد مددگار بھی۔ پہلے جب کوئی ذلیل کرتا تھا، چال میں ہلکی سی لچک کا مذاق اڑاتے ہوئے، لنگڑے پن پر ہنستا ہوا، تو کیسے میرے کانوں کی لکیریں اچانک آنکھوں سے جاملتی تھیں۔ آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ لکیریں رُکتی نہ تھیں۔ وہ دائرے بناتی ہوئی کھال تک جا پہنچتی تھیں۔ کھال کے مساموں سے پسینہ باہر آنے لگتا تھا۔ پُرانے دوست کی طرح مہربان پسینہ۔ مصیبت کے وقت ہاتھ تھامنے کے لیے۔

ہاں مگر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب مجھے پانی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں پانی کے گھڑے کو دیکھ کر بھیانک چیخیں مارنے لگتا تھا۔ پانی کے گھڑے کو خاص طور پر پوجا جاتا ہے۔ اس پوجا میں دنیا کی تمام پوتر ندیوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ گھڑے میں آئیں اور نواس کریں۔ ساتوں سمندر بھی چلتے ہوئے آتے ہیں اور گھڑے میں آکر رہنے لگتے ہیں۔ میری بھیانک اور دردناک چیخوں کو کوئی دریا، کوئی تالاب اور کوئی سمندر اپنے اندر جذب نہ کرسکا۔ وہ گہرے تاریک پانیوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹتی رہیں۔ وہ الم ناک اور احمقانہ یاسنکی چیخیں جو اُس شے سے ٹکراتی ہیں جس سے وہ خوف زدہ ہوکر پیدا ہوتی ہیں۔ دُنیا کی بنیادی سچائی یا عنصر سے آپ کا رشتہ جب ایک خوف کا رشتہ بن جاتا ہے تو انجام یہی ہوتا ہے بالکل اس طرح جیسے اس وقت آپ سب مجھے مرا ہوا سمجھ رہے ہیں اور میری آتما کو 'شانتی' وغیرہ دینے کی جھوٹی پراتھنائیں کر رہے ہیں جبکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری آتما کو نہیں بلکہ شریر کو ضرورت ہے شانتی کی اور وہ بھی وہ شانتی، جس کی بڑی بڑی چھاتیاں ہیں، بُھوری آنکھیں ہیں اور جس کی سُوجی ہوئی پکتی سُرخ ناک میں شہوت انگیز نیم کا کالا تنکا پڑا ہے۔ کیوں کہ میں آپ سے زیادہ زندہ ہوں۔ جسمانی طور پر زیادہ زندہ اور شہوت سے بھرا ہوا۔

درحقیقت ایک مکمّل جسم تو میں اب بن پایا ہوں۔ جب میں آپ سب کی طرح تھا تو ہرگز ایک مکمّل اور آدرش جسم نہ تھا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ آتما ہی تو ہے جو پیار کرتی ہے، پھر پیار

میں دُکھ اور ذلّت اٹھاتی ہے پھر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ مگر اب میں اپنے خالص جسم سے سوچ رہا ہوں، خالص جسم سے ہی پیار کر رہا ہوں۔ اگر اُس بھری دوپہر میں نے شانتی کے آگے سرکس کے جوکر کی طرح کرتب نہ دکھا کر اُس کی بھاری بھاری چھاتیوں کو چُھوا ہوتا تو اُس وقت اسکول میں بجائے جانے والے گھنٹے کی آواز بدل سکتی تھی!

اب آتما جیسی کوئی شے میرے لیے صرف وہ خرگوش ہے جس کے دو سینگ ہوں۔ میں عرفان و آگہی کی اُس منزل پر ہوں جہاں مجھے شانتی کا شہوت بھرا جسم چاہیے۔ اب جسم ہی میرا درجہ ہے اور جو خود میں ہی ہوں، یعنی— ایک راجہ!

افسوس کہ آپ اس خوش فہمی میں مُبتلا ہیں کہ اپنے مُنھ کی بساندھ بھری چکنائی صاف کرنے اور مُنھ لال کرنے کے لیے جو پان چبا کر آپ نے سڑک کنارے تھوک دیا تھا، اُس کا مزہ اور نشہ صرف آپ کے مُنھ میں ہی تھا۔ آپ کو چُونے، کتھے، چھالیہ اور پان کے ہرے کچھے ہوئے پتّے کا مطالعہ ایک بار پھر کرنا چاہیے۔ مگر اس کے لیے آپ کو سڑک کنارے نالی میں تھوکی گئی پان کی پیک کو اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر بغور دیکھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ناستک ہوں۔ آتما کو نہ مان کر آپ کچھ زیادہ ہی ایشور ورودی ہو جاتے ہیں۔ ایشور کو ماننے کے لیے رُوح میں یقین کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کم از کم جسم سے نکل کر واپس جاتے ہوئے رُوح کے افسردہ قدم مجھے تو نظر نہیں آتے۔ ہو سکتا ہے کہ جسم کے اندھیرے اور پُر اسرار غار میں کوئی خونی درندہ چُھپا بیٹھا ہو جو روح کو چیر پھاڑ کر نگل جاتا ہو۔

اس لیے رُوح واقعتاً اگر ہے بھی تو اطمینان رکھیں کہ وہ نکل کر کہیں نہیں گئی ہے۔ وہ کسی درخت پر جا کر نہیں بیٹھی بلکہ وہ تو شاید جسم میں اور بھی زیادہ سکڑ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی ہے۔ پیوست ہو گئی ہے۔ جسم کے تاریک بِل سے کبھی باہر نہ نکلنے والی ایک سہمی ہوئی، مریل سی بیمار چوہیا کی طرح۔

یہ جو آپ لوگ مُنھ پر کپڑا رکھ کر میرے پاس آ رہے ہیں، کیا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرے جسم کی ہی سڑن ہے۔ اگر آپ واقعی آتما جیسی کسی شے میں وشواس رکھتے ہیں تو جناب، کہیں آپ دھوکہ تو نہیں کھا رہے؟

کہیں یہ بدبو اُس مریل بیمار چوہیا کے جسم سے تو نہیں آ رہی!

خیر چلیے— صبح ہو گئی، آپ مجھے چارپائی پر ڈال کر آخر شمشان گھاٹ کی طرف لے ہی چلیے۔ مگر مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ اگرچہ میرا مُنھ، زبان، ہونٹ اور گلا سب جل کر، مُرجھا کر ایک پوٹلی سی بن گئے ہیں مگر کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ پیاس کا اِن اشیا سے کوئی تعلق ہے؟

اگر آپ مُجھے دو گھونٹ پانی پلا دیتے تو میں تھوڑا سو لیتا۔ پھر جتنی دیر آپ مجھے چتا میں جلاتے، اتنی دیر میں آرام سے ایک میٹھی نیند لے لیتا۔ کیوں کہ میرے پیٹ کے اندر اب شاید آنتیں پھٹ رہی ہیں۔ آنکھوں میں خون بھر رہا ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ اس سنگلاخ حقیقت سے تو میرا دل بھر گیا۔

چارپائی کو اس طرح اُٹھا کر لے جانے میں مجھے بہت جھٹکے لگ رہے ہیں۔ پھر بھی مجھے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔ نیند کا سب سے بڑا کمال تو یہی ہے کہ وہ جسم کو اور زیادہ فعال بنا دیتی ہے۔ جسم نیند کے جادو سے اچانک اتنا سبک رفتار بن جاتا ہے کہ بستر پر پڑے پڑے ہی وہ تمام کائنات کی خاک چھانتا پھرتا ہے بغیر اپنے پیروں کے چھالوں پر روئے ہوئے۔

کاش کہ میں سو جاؤں اور خواب بھی دیکھوں!

خواب میں شانتی کے ساتھ ہم بستری کروں۔ اس طرح کہ 'شرافت' نام کا وہ مسلمان درزی سامنے بیٹھا بے چارگی سے یہ نظارہ دیکھتا رہے۔ شانتی سولہ سال کی عمر میں اُس درزی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی جو اکثر اُس کے غیر معمولی بڑے بڑے پستانوں کو ناپ لینے کے بہانے چُھوتا رہتا تھا۔

بس پھر آپ اطمینان کے ساتھ مجھے چتا کی آگ میں جھونکتے رہیے گا۔

رات کی آندھی اور بارش نے صبح کی دھوپ کو تکلیف دہ حد تک چمکیلا بنا دیا ہے۔ شمشان گھاٹ ابھی سے جل رہا ہے۔ دھوئیں سے آلودہ، زنگ لگا وہ ٹین کا شیڈ ہوا میں ہل رہا ہے۔جس کے نیچے اُس کی چتا جلائی جائے گی۔

بندر اُس کی چارپائی کے پیچھے پیچھے اپنی معذور ٹانگ کو اُٹھائے بھاگا جلا آرہا ہے۔

یہ بندر بہت پہلے اُسے عجیب وغریب حالات میں ملا تھا۔

وہ روز کی طرح اپنی ڈیوٹی ختم کر کے بینک سے واپس آرہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لمبی لمبی جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کے پار وہ میدان تھا جہاں وہ خیمہ لگا تھا جس میں کسی اُجڑے ہوئے سرکس کے آثار تھے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

بڑی بڑی اُداس آنکھوں والی ایک چھوٹی سی بچی جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر آئی۔ بچی کی بوسیدہ سی فراک پر جگہ جگہ گیلی مٹی سنی ہوئی تھی۔ اُس کے روکھے سے بال بکھر کر ماتھے پر آگئے تھے—

بچی کی گود میں ایک بیمار اور بے ہوش بندر تھا۔

''آپ اسے پالیں گے؟'' بچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں''؟ وہ حیرت میں پڑگیا۔

''ہاں۔ یہ سرکس کا بندر ہے۔ اس نے زہر بھری روٹی کھائی ہے۔ یہ مرجائے گا۔''

سرکس کا نام سُنتے ہی اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے جلدی سے بندر کو اپنی گود میں لے لیا۔

''آپ اس کا علاج کرائیں گے نا'' بچی کا لہجہ ایک افسردہ سی اُمید سے بھرگیا۔

''ہاں'' وہ اور کچھ نہ بول سکا۔

بچی یک بارگی آگے بڑھی۔ بندر کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا، پھر کسی جادوئی پری کی طرح جھاڑیوں میں غائب ہوگئی۔

بہت دیر تک وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بندر کو، اپنی گود میں اُٹھائے اُسی طرح اُس راستے پر کھڑا رہا جو اچانک اُسی طرح ویران ہوگیا تھا جیسے وہ سارے راستے جن سے گزر کر تھکے فرشتے جھاڑیوں میں غائب ہوجاتے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے۔

وہ ایک بینک میں نوکری کرتا تھا۔ ملازمت کے علاوہ اپنی تمام زندگی اُس نے جوئے اور سٹے بازی میں گزاری تھی۔ اُس کی تعلیم یوں تو معمولی تھی مگر جیومٹری میں اُسے خاصی مہارت حاصل ہوچکی تھی۔ اُسے یہ وہم تھا کہ جیومٹری کی مہارت اُسے کسی دن کوئی بہت بڑا جوا جیتنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ایک پرانا مشغلہ اور بھی تھا۔ سرکس کے کلاکاروں کی بھونڈی اور ناکام نقلیں اُتارتے رہنا۔

اُسے جانے کیوں یہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ سرکس ابھی غائب نہیں ہوا ہے۔ بس اُس کی ایک خوفناک تبدیلیِ ماہیت ہوئی ہے۔ سرکس انسانی سرشت میں شامل ہے۔ سرکس کے پھٹے حال تنبو بینکوں اور اسٹاک ایکسچینج کی عالیشان عمارتوں میں بدل گئے تھے۔ سرکس کے دُھول پڑے پنڈال کے اندر دبی کچلی کوئی آندھی رہ گئی تھی، جب وہ باہر آئی تو یکا یک سارے جوکر اور مسخرے چولا بدل کر، بینکوں کے چمکدار شیشوں والے کیبن میں بیٹھ کر ایک دُوسرے کے مُنھ پر فرضی طمانچے مارنے لگے۔

اسٹاک ایکسچینج کی فلک بوس شاندار عمارت کے سامنے کھڑے ہوکر لوگ اپنا سیل فون کان سے لگائے بھیانک اُچھل کود کرتے تھے۔ اُنگلیوں سے پوشیدہ اشارے کرتے ہوئے وہ کسی ناقابلِ تشریح زبان میں کچھ بڑبڑاتے تھے۔ یہ سرکس کے جھولے والے آخری کرتب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ان اشاروں کو صحیح طور پر سمجھ پانے پر ہی اُن کی زندگی اور موت کا دار و مدار تھا۔ وہ بلندی سے گرتے تھے، کبھی تو اُٹھ پاتے اور کبھی اپنی ریڑھ کی ہڈی کو ہمیشہ کے لیے توڑتے ہوئے زمین میں دفن ہوجاتے۔

دُوسری طرف ایک تنہا بھیڑ تھی جو بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں کی طرف بے تحاشہ بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اس بھیڑ کا ہر فرد، کوئی بھی فیصلہ اپنے وجود کی گہرائیوں اور ضمیر کی آواز پر

نہیں بلکہ دُوسروں پر اُس کا ردِ عمل دیکھنے اور اُنھیں متاثر کرنے کے لیے ہی کرتا تھا۔ اس بھیڑ کا ہر فرد دراصل اکیلا تھا۔ وہ اصل میں اُس شقی باز جلاد کی طرح تھا جو کسی مجرم کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دینے کے بعد، دوسروں پر اپنے اس دلیرانہ فعل اور فرض شناسی کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے گنگناتا ہوا واپس آتا ہے۔

یہ ایک طرح سے اندھوں کی بے رحم اور تنہا بھیڑ تھی۔ افسوس کہ اندھوں کو بے حد کوشش کے بعد جب آنکھ نصیب ہوتی ہے تو وہ ایک بھوری آنکھ ہوتی ہے۔ تشدد سے بھری، چہرے پر نکل آئے ایک کریہہ ناخن کی طرح۔

اس بھیانک اور شیطانی سرکس میں وہ اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ کرتب کے مظاہرے کی بھی داد نہ پاسکا۔ کوئی تالی، کوئی واہ اُس کے لیے نہ تھی۔

کافی دنوں سے وہ لگاتار جوئے کی بازی ہار رہا تھا۔ پولیس کو اُس پر شبہ ہو گیا تھا کہ شاید وہ کوئی جوئے کا اڈہ بھی چلاتا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ پولیس کبھی بھی آکر اُسے گرفتار کرسکتی تھی۔ اُس کا دل طرح طرح کے اندیشوں میں گھرنے لگا۔ شادی کے بارے میں سوچنے سے ہی اُسے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اُس کے دل میں یہ وہم گھر کر گیا تھا کہ شاید وہ نامردی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک ایسی بھیانک نامردی جو اُن تمام لوگوں کا ازلی مقدر ہے جنھیں بچپن میں ہی ایک خوفناک کتے نے کاٹ لیا ہو۔

وہ بینک میں کیشیئر تھا، اس لیے ہر وقت اُسے دُوسرے لوگوں کے نوٹ ہی گنتے رہنا پڑتا تھا۔ ممکن ہے کہ غیروں کے نوٹوں کو شمار کرتے رہنا ہی اُس کی خودکشی کا اصل سبب رہا ہو۔ اگرچہ اس بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ جوئے کی لت نے اِدھر آکر اُسے مفلس بھی بنا دیا تھا اور اچھی خوراک وہ صرف اپنے بندر کے لیے ہی مہیا کر پاتا تھا۔

دو چار دن سے وہ شدت سے یہی سوچے جا رہا تھا کہ دوسروں کی کمائی ہوئی دولت، اُن کے روپے پیسے کی حفاظت، اُن کے نوٹوں کے نمبروں کا بے حس اور بے معنی مطالعہ، اُن کی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ایک جوکر کی نقلی مگر جھنجھلائی ہوئی مسکراہٹ سے چہرے کو پوتے رہنا

دراصل ایک قسم کا مچلاپن تھا۔ وہ ''امین'' ہونے کے کسی بلند اخلاقی منصب پر مقرر نہیں تھا۔ وہ روز بروز چھوٹا اور گھناؤنا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ گھناؤنا پن نہیں تھا تو اور کیا تھا کہ کبھی اپنی اُنگلیوں کے پوروں میں پاؤڈر لگا کر کبھی نوٹوں کے کناروں کو مُنھ کے لُعاب سے گیلا کرکے، وہ دوسروں کے دھن دولت کا مکمل حساب لگایا کرتا۔

ایک دن جب اُس نے اپنے کاؤنٹر پر تقریباً دو لاکھ سڑے گلے اور بدبودار نوٹ گنے تو اُس کی اُنگلیاں اینٹھ کر رہ گئیں۔ سر درد سے پھٹنے لگا۔

شام کو وہ بینک سے باہر نکلا۔ کل رات سے اُس نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اُسے شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا آتا اور جاتا تھا۔ اُس نے جیب ٹٹولی تو صرف ''پاسنگ شو'' سگریٹ کا پیکٹ باہر آیا۔ آج اُس کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ اپنے بندر کے لیے تھوڑی سی مونگ پھلیاں ہی خرید لیتا۔

اُسے محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی کسی گندے، غلیظ، بدبودار اور پھٹے ہوئے نوٹ کی کترن میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اُس کے بعد، وہ واپس کبھی بینک کی طرف نہیں گیا۔

اُس رات وہ شہر سے دُور ایک مضافاتی علاقے کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے ایک اکیلے اور ویران راستے پر اپنے پاؤں پٹک پٹک کر اس طرح چلا جیسے وہ راستے کو چُور چُور کر دینا چاہتا ہو۔

مگر بالآخر جو چُور چُور ہُوا وہ راستہ نہیں اُس کا پاؤں تھا۔

نہیں۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ ہوسکتا ہے کہ جسم کی اس صورتِ حال میں 'سونے' کے اب کوئی معنی نہ رہے ہوں۔ لوگ مجھے جتنی دیر چتا میں جلاتے رہے اتنی دیر مجھے صرف پیاس لگتی رہی۔ آپ لوگوں کے حساب سے پورے تیرہ دن گزر گئے ہیں۔ آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ تیرہ راتیں آپ سب نے سو کر گزاریں۔ مگر یہ بور اور اجاڑ دینا میرے سامنے برابر موجود رہی

ہے۔ اس طرح جاگتا رہنا یقیناً ایک زائد زندگی ہے۔ یہ زائد زندگی حاصل کر کے میں دراصل ٹرپ کی چال ہار گیا ہوں۔ اس مکروہ دنیا کی اشیا اب اور زیادہ واضح اور ٹھوس بن کر میرے سامنے آ گئی ہیں۔ یہ کتنا بڑا گھاٹا ہو گیا کہ دُنیا بہرحال ویسی کی ویسی ہی رہی اور میں اُس میں تقریباً اُس طرح شامل رہا جیسا استھیوں کے اس ڈھیر میں بدل جانے سے پہلے تھا جسے کلس میں بھر کر سرادینے کے لیے آپ کسی دریا کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

افسوس کہ دوسرے کی موت آپ سے آپ کی ایک حس اغوا کر کے لے جاتی ہے اور آپ ''حقیقت مطلق'' یا کسی ''واحد سچ'' کے جابرانہ تصور کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔

اب دیکھیے نا کہ دُنیا کس بُری طرح مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کرنے لگی۔ اب تو یہ کم بخت بالکل ہی ڈھیٹ بن کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ اب جا کر پتہ چلا ہے کہ حقیقت اور التباس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہر وقت میں، ہر مقام پر اور ہر صورتِ حال میں وہی ایک سنگلاخ اور کُتے کی طرح کاٹتی، بھنبھوڑتی وحشی حقیقت! کاش کہ آپ بھی یہ اہم بات جان پاتے کہ کاغذ پر پنسل سے کھنچا ہوا ایک دائرہ اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ سرکس میں لوہے کا وہ گولہ جس پر پیر رکھ کر مشاق کلاکار فرش کے اس سرے سے اُس سرے تک دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اہم بات اور واقع ہوئی ہے، میرا جسم حواس و اعصاب کے معاملے میں تو آپ سے بہت آگے نکل ہی چکا ہے، وہ پہلے سے کہیں زیادہ صابر اور مضبوط بھی ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے عمل و ردِعمل اور جبلتوں کے سلسلے کو حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں جلتا رہا اور مجھے تکلیف نہیں ہوئی؟ نہیں بہت تکلیف ہوتی تھی شاید اسی لیے میں سو نہ سکا ہوں۔ مگر اب میرا جسم ردِعمل کے طور پر چیخے گا، چلائے گا نہیں، نہ ہی اُچھلے کودے گا۔ اب اس درد کو وہ کہاں، کس گوشے میں سنبھال کر رکھے گا اور اس کا کسی طرح جواب دے گا یہ تو بس اب میں ہی جانتا ہوں۔

یہ جو آپ مجھے کلس میں رکھ کر تیزی سے چلتے جا رہے ہیں، اُس سے میرے بندر کی سانس پھول رہی ہے۔ اُس نے اب تک نہ کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ وہ بھوکا ہے۔ وہ اپنی تین

ٹانگوں سمیت کب تک میرا تعاقب کرتا رہے گا؟

جھٹکوں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ کی دانست میں تو میری لاش مٹتی گئی۔ ضائع ہوتی گئی۔ اس لیے یہ آپ کے لیے ایک اسرار سے بھری شے بن گئی ہوگی۔ مگر میرے لیے نہیں۔ میں اپنے جسم کو اپنے جسم کے ذریعے ہی دیکھ اور محسوس کر رہا ہوں۔ میرے جسم پر میرے جسم ہی کی روشنی کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی چیتنا یا آتما جیسی سنکی اور فرضی شے کی مدد کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔

دراصل سچ کہوں تو اب جا کر یہ لاش (لاش کا لفظ آپ کی سہولت کے لیے) ایک آرٹ پورٹریٹ میں بدل سکی ہے۔ کسی بھی پورٹریٹ میں کتنی چیزوں کو دیکھنا ممکن ہے۔ ایک چہرہ جو ایک ساتھ نیک، پُر وقار مگر پاگل اور دھوکے سے بھرا ہوا بھی ہے۔ آپ ان آڑھی ترچھی جیومٹری کی لکیروں میں کوئی ''واحد سچ'' جان لینے کے لیے ہمیشہ بھٹکتے رہیں گے۔ کیوں کہ سارا وقت میرے اندر اُس طرح بہہ رہا ہے جس طرح کسی فلم کے فریم کے اندر بہتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ ہرگز دھوکہ مت کھائیے گا کہ میں وہیں کا وہیں ٹھہر کر رہ گیا جہاں ایک ریل گاڑی مجھے چھوتی ہوئی گزر گئی تھی — میں مُکت کہاں ہوا۔ میں تو اور بھی بندھ گیا ہوں۔ میری عمر بھی لگاتار بڑھ رہی ہے۔ عمر کے بڑھتے رہنے کے عذاب سے کبھی چھٹکارہ نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ یہی سچ ہے اور سچ کو کھوجنے میں انسان کے احساسات کے بہرحال کوئی معنی نہیں ہیں۔

میں ایک بچکانہ جیومٹری سے نکل کر ایک زیادہ سخت اور بے رحم جیومٹری کی طرف آ گیا ہوں۔ یہاں اشیا تصویروں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ تین جہتی بن چکی ہیں۔ اس لیے اُن کے کنارے زیادہ نکیلے اور سخت ہیں۔ یہ جسم کو زور زور سے کھینچتے ہیں۔ سب کچھ کڑوا ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس سے کبھی کبھی سرور کی سی کیفیت بھی آتی ہے۔ آخر کچھ لوگ اپنے جسم کو سانپ سے ڈسوا کر بھی تو نشہ حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ سب سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ اس لیے میرے اندر زندگی کے بہاؤ کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے پہلے آپ کو کسی ندی کنارے جا کر وہاں اُگ آئے سرکنڈوں کے تھرتھراہٹ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اُس سے آپ کو یہ سُراغ

مِل سکتا ہے کہ ندی میں پانی کا بہاؤ آخر ہے تو کتنا؟

المیہ یہ ہے کہ میں جسمانی طور پر ایک نسبتاً بڑی کلا میں بدل چُکا ہوں مگر وہی دُنیا میرے مُنھ پر اور بھی ٹھوس ہوکر چڑھی آ رہی ہے، جو دنیا آپ کے سامنے ہے۔ سرکس کا بھوتانہ کھنڈر زمین کے نیچے سے اُبھر کر اُوپر آ رہا ہے اور وہی نجی بھیڑ اُمنڈی آ رہی ہے جو اب تالیاں اُس وقت بجائے گی اور انصاف پر مبنی فیصلے اُس وقت کرے گی جب اُس کا مقصد صِرف دُوسروں کو خوش کرنا ہوگا۔

تو میں نے کہا نا کہ بس لکیریں ہی لکیریں ہیں۔ اِدھر سے اُدھر جاتی ہوئی، آپس میں ایک دُوسرے کو کاٹتی ہوئیں، بڑھتی ہوئیں، واپس آتی ہوئیں۔ زندگی کا سلسلہ رُکتا نہیں۔ کچھ مِٹتا نہیں۔ لکیریں ہی برفیلا آبشار بناتی ہیں اور لکیریں ہی آگ کو طوفان۔

لو، اب ندی بہت قریب آ گئی۔ ایسے سخت سُوکھے موسم میں جب چرند پرند، اِنسان و حیوان سب بارش کے لیے تڑپ رہے ہیں، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ اِس ندی میں اتنا بہت سا پانی کہاں سے گیا؟

یہ تو باڑھ کا سا سماں نظر آتا ہے۔ پانی ندی کے اُونچے کراڑوں سے باہر آ رہا ہے۔ آپ نے مجھے یہاں تک لاکر واقعی بڑے پُنیہ اور نیکی کا کام کیا ہے اور اب آخری نیکی جو آپ میرے جسم کے ساتھ کرنے والے ہیں وہ یہی ہے کہ اب مجھے پانی کی لہروں کے سُپرد کر دیں۔

مگر میں اچانک ندی کے اِس منظر سے خوف محسوس کرنے لگا ہوں۔ وہی پرانا خوف۔ شاید مجھ پر پھر ریبز کا دورہ پڑ رہا ہو۔ لیکن اب مجھے اِس پر کوئی ملال نہیں ہے۔ ریبز نے تو میرے جسم کو زیادہ بُلند، ارفع و اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی اور صلاحیت کے اعتبار سے بھی۔ ممکن ہے کہ یہ کُتّے کے کاٹنے کا ہی اثر ہو کہ میں تمام زندگی بڑے بڑے فیصلوں پر ہمیشہ پُرسکون رہا۔ ریلوے لائن کے کنارے کھڑے ہوکر بھی پُرسکون۔

ظاہر ہے کہ آپ میرا ایک لفظ بھی نہیں سُن پائے ہیں۔ آپ کو تو صِرف شور سُننے کی عادت ہے۔ آپ صرف وہی سُن پاتے ہیں جو دیکھ پاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا بے سُرا پن ہے۔

دُنیا کو گونگا کر دینے والا ایک سیاہ شور۔

کاش کہ آپ کی دُنیا میں باہر کی آوازوں کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ ہوتی۔ موسیقی کی اُبھر کر سطح پر آنے کے لیے یہی ایک واحد شرط تھی۔ تب شاید آپ میرے جسم کی اُن آوازوں کو بھی سُن سکیں جو ابھی نہیں سُن پائے۔ میرے جسم کی کوئی سرسراہٹ، کوئی کراہ، کوئی ہنکارہ یا کوئی اعتراف۔

اب جب کہ آپ ندی کنارے آ کر رُک گئے ہیں اور کلش کو سنبھال کر نیچے رکھ رہے ہیں۔ تو میں آپ کو ایک بے حد راز اور پتے کی بات بتاتا چلوں۔

ایک تو یہ کہ براہِ کرم جیومٹری میں فرضی نقطے ذرا ہوشیاری سے لگائیں۔ اس ذلیل، کمینی، بور اور کٹکھنی حقیقت سے مفر ممکن نہیں۔ دُنیا میں بے رحمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس بے رحمی کا سلسلہ ایک پُراسرار نادیدہ زنجیر کی طرح ہے۔ جس طرح شیرخوار بچّے پر ہر اُس اچھی بری چیز کا اثر پڑتا ہے جو اُس کی ماں کھاتی یا پیتی ہے۔ اسی طرح ہر شے دوسری شے سے پیوست ہے۔ ایک خاموش زنجیر کی طرح۔ اندھیرے پر لگے اندھیرے کے استر کی طرح۔

جہاں تک ماں کا سوال ہے تو اُس سے صِرف، شیرخوار بچوں کا ہی نہیں، ہر انسان کا مقدر جُڑا ہوا ہے۔ اس لیے جادو ٹونا اور تنتر منتر کرنے والے عامل کسی شخص پر عمل کرنے سے پہلے اُس کی ماں کا نام ضرور دریافت کرتے ہیں۔

میری ماں کا نام کیا تھا؟ میری ماں کا نام؟

وہ دس سال کا رہا ہوگا جب اُس کی ماں نے ایک اندھے سنگیت کار سے گانا سیکھنا شروع کیا۔ عام طور پر سماج میں ایک بیوہ کا اس قسم کی چیزوں میں دلچسپی لینا معیوب سمجھا جاتا ہے مگر اُس کی ماں ایک مشہور سماجی و سیاسی کارکن بھی تھی۔ اُس پر سماج کی ان گیدڑ بھبکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے ماتھے پر بندیا بھی سجاتی تھی۔ ادھیڑ عمر کا گنجا اور نابینا سنگیت کار سارنگی بجانے میں شہرت رکھتا تھا۔ سارنگی ایک خطرناک ساز ہے۔ وہ انسانی آواز کی نقل سی

کرتی ہے اور گانے والے کی آواز میں ایک بے تکا سا جھا کرلیتی ہے۔ وہ جب بھی سارنگی بجاتا تو اُسے خوف محسوس ہوتا۔ اُسے اُس کا گانا بجانا کبھی پسند نہیں آیا۔ طبلے پر تھاپ دیتے وقت جب وہ آلاپ کرتا تو اُس کی موسیقی کے تاروں سے کوئی بُری شے باہر نکل کر اپنے نہ دِکھائی دینے والے ارتعاشات سے ماحول کو بوجھل بنا دیتی۔ اُس کی پھٹی پھٹی گلے سے نِکلی آواز سامنے مودّب بیٹھی اُس کی ماں کے چوڑے، بندیا لگے ماتھے کو بے شرمی سے چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ سُر اور ے کے ساتھ، اُس کے ہاتھ کِسی بدنیتی کی طرف بڑھتے ہوئے خلا میں بازاری انداز میں کُھلتے اور بند ہوتے رہتے۔ اُس کی بے نور آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں پر ایک کینہ اور شیطنت بھری مسکراہٹ سانپ کی طرح رینگتی رہتی تھی۔

دراصل بے چارے اندھے اپنی تاریک دنیا کو جن لکیروں سے بھرتے اور سجاتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے صِرف ذہانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُنھیں آنکھوں کے علاوہ اپنے پورے جسم سے دیکھنا پڑتا ہے۔ آنکھوں کے علاوہ جسم کے کسی حصّے یا دُوسرے آلاتِ حواس کے ذریعہ دیکھنا خوفناک بات ہے۔ یہ خوفناک پن کبھی اُن کے چہرے پر اُترتا ہے اور کبھی اُن کی آواز میں۔

وہ گرمیوں کی سخت اور لُو سے بھری ہوئی دوپہر تھی۔ اُسکول میں کوئی بچّہ مرگیا تھا اس لیے وقت سے پہلے ہی چُھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ وہ بہت بھوکا تھا۔ اُس نے صُبح اسکول روانہ ہوتے وقت اپنی ماں سے دوپہر میں دال اور چاول کی فرمائش کی تھی۔ اسکول کی فاختئی رنگ کی یونیفارم پہنے، کندھے پر عُمر سے زیادہ بھاری کتابوں کا بستہ لادے اور بغل میں پانی کی خاصی رنگین بوتل دبائے وہ دوڑتا ہوا گھر کی طرف چلا آرہا تھا۔ بھری دوپہر میں چیل انڈا توڑ رہی تھی۔ دُھوپ چمکیلی نہیں تھی۔ وہ لُو کھا کر دُھندلی اور مٹیالی ہوگئی تھی۔ جیسے ہی وہ اپنی گلی کے سِرے پر پہنچا ایک کالے رنگ کا طویل قامت کُتّا اُس کے پیچھے غراتا ہوا دوڑا۔

اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ حواس باختہ ہوکر وہ اپنی پوری جان لگا کر گھر کی طرف بھاگا۔ کُتّا اُس کے تعاقب میں تھا۔ اُس کے پنجوں سے سڑک پر دُھول اُڑنے لگی۔ سڑک سُنسان تھی۔

مگر گھر کا دروازہ اور اندر سے بند تھا۔ زور زور سے ماں کو آواز دیتے ہوئے اُس نے ٹین کے کواڑ بُری طرح جھنجوڑ ڈالے۔ پھر دروازے کو بُری طرح پیٹنے لگا۔ ٹین کے دروازے کو پیٹنے کی مُہیب اور کھنکھناتی آواز گلی کے اِس سِرے سے اُس سِرے تک پھیلنے لگی۔ مگر گلی ویران پڑی تھی۔

اِتنی دیر میں کُتّا اُس تک پہنچ چُکا تھا۔ کُتّے نے اُس کی بائیں ٹانگ کو اپنے مُنھ میں لے لیا اور کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھائی گئی کسی جھوٹی ہڈّی کی طرح اُسے چچوڑنے لگا۔ وہ اپنے ہی گھر کی چوکھٹ پر گرا پڑا تھا۔ اسکول کا بستہ کندھے سے پھسل کر دُور جا گرا اور پانی کی خالی نیلی بوتل سڑک پر اِدھر اُدھر لڑھکنے لگی۔

وہ اپنی پوری طاقت سے چیختا اور روتا رہا۔ چیختے چیختے اُس کا حلق بیٹھ گیا اور دھونکنی چلنے لگی۔ دروازہ نہیں کُھلا۔

کُتّا اُس کی ٹانگ کو وحشی انداز میں بھنبوڑے جارہا تھا۔ اُس کے کالے سخت بال اُس کی پنڈلی کو چھیل رہے تھے۔ کُتّے کے بالوں میں لگی کِلنیاں اُس کے سارے جسم پر چڑھ آئیں۔

پتہ نہیں کُتّے نے اُس کی ٹانگ کب اور کیسے چھوڑی۔ لُو کے جھکّڑ تیز ہونے لگے۔ گلی میں دُھول کا بگولا اڑتا ہوا چلا گیا۔ آسمان زرد ہونے کی طرف جُھکا۔

ایک پل کو اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک کالی گندی نالی میں رینگ رہا تھا جس میں دال چاول بہتے چلے جارہے تھے۔

تب شاید صدیوں کے بعد گھر کا دروازہ کھلا۔ پہلے جو باہر آیا وہ ایک اندھا سنگیت کار تھا جو کسی سہمی ہوئی مگر چالاک بلّی کی طرح خاموشی سے اُسے پھلانگتا ہوا گھر کی دہلیز پار کرگیا۔

اُس کے بعد ایک عورت کا شرمندہ سا سایہ باہر آیا۔ عورت جس نے اپنے چوڑے سے ماتھے پر بندیا سجا رکھی تھی۔ عورت کے ہاتھ اُسے اندر اُٹھا کر لے جانے کے لیے بڑھے وہ شاید آہستہ آہستہ سِسک رہی تھی۔

مگر وہ گھر میں نہیں گیا۔ وہ تمام عُمر کبھی اُس چوکھٹ پر نہیں چڑھا جہاں ایک کُتّا اُس کی

ٹانگ چبا رہا تھا— وہ تو اُس کالی نالی میں اور آگے رینگتا چلا گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ کُتا ابھی تک مرا نہیں ہے۔ کُتوں کی آخر کتنی عمر ہوتی ہے؟ وہ اُسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ وہ کالے رنگ کا ہے۔ اُس کی بھوری آنکھیں ہیں۔ اُس کے بالوں پر بے شمار موٹی موٹی کِلّیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ وہ جب دوڑتا ہے تو اُس کے پنجوں سے سڑک پر دُھول اُڑتی ہے۔ آسمان زرد ہونے لگتا ہے۔

اُس رات اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی وہ ٹہل رہا تھا۔

دریا کے پاٹ کے بیچوں بیچ، میرے مالک کی استھیوں کا کلش بہتا چلا جا رہا ہے۔ ہم بندر بھی تیر سکتے ہیں مگر تین ٹانگوں سے یہ ممکن نہیں۔ دوسرے یہ بھی کہ اب اس تعاقب کا کوئی مطلب نہیں۔ گزرا ہوا وقت اب کبھی واپس نہیں آئے گا اور اگر آئے گا تو میرے یعنی "بندر کے مُردہ پنجے"[1] کی طرح یا ذریعے ہی آئے گا۔ ایسا گزرا وقت جب واپس آتا ہے تو وہ ہمیشہ نحس ہوتا ہے۔ ایک بدشگونی کو اپنے کاندھوں پر لیے ہوئے۔

مجھے اس بات کا بے حد ملال ہے کہ یہ ساتھ بے معنی ہی ثابت ہوا۔ انسانوں کی زبان سیکھ لینا یا اُن کی نقالی کر لینا کافی نہ تھا۔ انسانوں سے محبت یا نفرت کرنا بھی کافی نہیں تھا۔ اس کے آگے ایک پُراسرار زبان تھی جسے میں جان نہ سکا۔ اِنسان اپنے کاندھوں پر کون سے ناقابلِ فہم اور پوشیدہ دُکھوں کی صلیب لادے لادے پھرتا ہے۔ یہ میں نہ سمجھ سکا۔ وہ کیوں جیتے جیتے اچانک خود ہی مر جاتا ہے۔ یہ ایک اسرار ہے اور مرنے کے بعد وہ اس سے بھی بڑا اسرار بن جاتا ہے۔

آج مجھے یہ وہم بھی ہو رہا ہے کہ جیسے میں ابھی ابھی سرکس کے پنڈال کے نیچے بے تُکی اور مایوس کُن قلابازیاں کھا رہا ہوں اور اس شخص کے پُراسرار کرتبوں کے آگے میری کوئی حیثیت نہیں۔ استھیوں کا یہ بہتا ہوا کلس شاید اس شخص کا سب سے بڑا اور عظیم کرتب تھا۔

کاش کہ میں ڈگڈگی بجا کر تماشہ دکھانے والے کسی مداری کا ایک معمولی سا بندر ہوتا۔

۱...... بندر کا مردہ پنجہ: ڈبلیو ڈبلیو جیکب کی مشہور اور بھیانک کہانی۔

میری شکل بھی تماشے کے مسخرے پن کے لیے ہمیشہ سے بہت مناسب رہی ہے۔ تب میرے ذہن میں اتنی اُلجھن اور مایوسی شاید نہ ہوتی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں ایک حقیر اور معمولی بندر کسی کے آباؤ اجداد میں اپنا نام بھی شامل کر سکوں گا یا نہیں مگر "تیر پکش" میں یہ جو "کش" سے تالاب میں کھڑے ہو کر "ترپن" کیا جاتا ہے اور سورگ میں مُقیم پُرکھے اپنی پیاس بجھاتے ہیں تو اس شخص کے لیے یہ سب کون کرے گا؟

کتابوں میں کہیں لکھا ہے کہ میں انسان کا پُرکھا ہوں۔ کوئی سلسلہ ہے ضرور اگرچہ ٹوٹا ہوا۔ کوئی زنجیر ہے مگر گلتی ہوئی۔ افسوس کہ یہ سب انسان ہی بہتر جانتے ہیں۔

اگر میں ہی انسان کا پُرکھا ہوں تب میں اس کے پیچھے پیچھے کیوں چل رہا ہوں؟

اس کی استھیوں، اس کی خاک اور اس کی مٹی کا تعاقب کیوں کر رہا ہوں؟ اب اس مقام سے آگے بڑھنے کی سکت میرے تین کمزور پیروں میں نہیں ہے۔ میری گردن بُری طرح ٹیڑھی ہونے لگی ہے۔ بھوک اور پیاس کا احساس میرے حافظے سے غائب ہو چکا ہے۔ تیرہ دنوں میں میرے بال اتنے جھڑ گئے ہیں کہ میری کھال کالے چمڑے کی بد رنگ، پانی کی خالی پچکی ہوئی مشک کی طرح نظر آنے لگی ہے۔

دریا کے اُوپر کوؤں کا جُھنڈ شور مچاتا ہوا منڈلا رہا ہے۔ یہ دریا آگے چل کر شاید کسی دوسرے بڑے دریا سے جا ملتا ہے۔ جس کے کنارے اس سے بھی زیادہ چوڑے اور بلند ہیں۔ لال کپڑے میں بندھا استھیوں کا کلس سرا پانے کے لیے دُور پانی کی دُھند میں گُم ہو رہا ہے۔

میں اِسی جگہ کنارے پر ہی اپنی ٹیڑھی گردن سمیت بیٹھ جاتا ہوں۔ دریا کے گیلے ویران کنارے پر ایک اُداس، بیمار اور تھکا ہوا بندر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی اگلی معذور ٹانگ کنارے کی کچی دلدل میں دھنس گئی تھی۔ بارش کہیں نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں صرف اونٹ زندہ رہ سکتے تھے یا ببول۔

ہوا ساکت تھی۔ مگر ندی کے کنارے کسی نادیدہ بارش سے چوڑے اور مُہیب ہوتے جا رہے تھے۔ درخت اِس بارش میں ڈوب رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے باڑھ

آنے والی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ بارش نہ ہو کر کوئی دوسری زیادہ خطرناک شے ہو۔ کوئی بھی آفت کبھی بھی آ سکتی تھی۔ ندی کا پانی تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ موسم کسی بدشگونی کی طرف تیزی کے ساتھ جھک رہا ہے۔

اِس نادیدہ بارش اور باڑھ کے سامنے خاموشی سے بیٹھا یہ بندر دُور سے دیکھنے پر ایک بدرنگ کچے پتھر کی مورتی کی طرح نظر آتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے وہیں نصب۔ یہاں سے کبھی نہ اُٹھنے کے لیے کیوں کہ وہ شاید ہمیشہ سے اِس جگہ موجود تھا اور اسی لیے ہمیشہ یہیں بیٹھا رہے گا۔

قدموں کا نوحہ گر

"اور اب میرا کتا
اپنے منھ میں دبائے لیے چلا آ رہا ہے
میں جنھیں پھینک آیا تھا
ایک گندی نالی میں
مجھے معلوم ہے کہ وہ انھیں ڈال دے گا میرے قدموں میں"
(بہت پہلے کہی گئی ایک نظم سے)

اب جب کہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے قریب ہوں اور گھورے کے اس ڈھیر پر پڑے پڑے ایک بھیانک بدبو میں بدل چکا ہوں، تو شاید اپنی کہانی بیان کرنے کے لیے اس سے زیادہ ایمان دار وقت پھر کبھی میری زندگی میں نہ آ سکے۔ ہر ایک کو اپنی کہانی تب ہی بیان کرنی چاہیے جب وہ ایک بدبو، ایک بگولے یا پھر میلے پانی میں بدل گیا ہو۔

آخر کار کوڑے کے اس خطرناک ڈھیر میں لیٹے لیٹے آسمان کی طرف اسی طرح پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھتے رہنے کا کیا فائدہ جس طرح رات کے آخری پہر میں ستارے اس بے رحم زمین کو دیکھتے رہتے ہیں۔ میں تو اس زمین کی طرف اب نظر اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ میں اس سے رگڑ کھاتے کھاتے تنگ آ چکا ہوں۔

وہ کتنا طویل، خوفناک اور کرب ناک سفر تھا جو میں نے طے کیا۔ اگر چہ سفر میں دن اور رات دونوں شامل ہوتے ہیں مگر میرے اس سفر میں راتیں اس طرح آتی رہیں جیسے چراغ گل ہوتے ہیں۔ راتیں لگا تار میرا پیچھا کرتی رہیں۔ کون جانے یہ سلسلہ پھر کب شروع ہوجائے اور کوڑا بیچنے والے لڑکے آ کر ایک بار پھر مجھے بوری میں بند کر کے لے جائیں۔ اب اگر اپنی کہانی نہیں سنائی تو پھر شاید کبھی نہ سنا سکوں۔

کہانی کیسے سنائی جاتی ہے؟ کیا واقعی کوئی کسی کی کہانی سنتا ہے؟

مجھے ابتدا میں ہی اس کی وضاحت کر دینا چاہیے کہ جس طرح انسان کبھی کبھی اپنے آپ کو ''مختلف ضمائر'' میں تقسیم کر دیتا ہے اور اپنے اسم کی تلاش میں لگ جاتا ہے، اس سے بھی کہیں زیادہ مَیں یعنی ایک معمولی جوتا تو تمام زندگی صرف اذیت ناک مشغلے کو اپنی تقدیر بنائے زمین پر چلتا رہتا ہے۔ لہٰذا ابھی ابھی میں خود کا ایک ٹکڑا نوچ کر اسے اپنی پرچھائیں میں بدل لیتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ میری یہ پرچھائیں میری ہی طرح مایوس اور اکیلی ہے اور اسے اپنی یا میری کہانیاں سننے میں ضرور دلچسپی ہوگی۔ اس طرح میں محض اپنے سائے کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں جو یقیناً خود اس کی بھی ہے۔ اس لیے یہ کہانی ایک ایسے ماتمی مکالمے میں تبدیل ہوجاتی ہے جو کسی مشترک سانحے پر دو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے گلے مل کر اور رو رو کر تے ہیں۔

مگر ٹھہریے۔ ایک جوتے کا ایک اپنی داستان بیان کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اسے چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ اگر چہ میں اپنے سائے سے ہی مخاطب ہوں مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسروں کی موجودگی کا ہراساں کر دینے والا احساس ہے اس لیے بے خیالی میں مجھے ان دوسروں کو بھی مخاطب کرنے کی غلطی سرزد ہو سکتی ہے جب کہ میں جانتا ہوں کہ ان دوسروں کے لیے میری کہانی وہ ناقابلِ فہم اور کریہہ آوازیں ہیں جو سڑک پر رگڑ کھاتے ہوئے یا پھسلتے ہوئے میرے وجود سے پیدا ہوتی ہیں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ اس وقت تو میں واقعی بالکل اکیلا ہوں مگر ہمیشہ ہی ایسا تو نہ تھا لہٰذا اپنی کہانی کے اس پہلے حصے میں مَیں اپنے ساتھی کو بھی شامل کر رہا ہوں۔ میرا ساتھی یعنی میرا

نصف وجود۔ انسان کے دوسرے پیر کا جوتا۔ جسے میرے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ انسان کے دو ہاتھوں، دو پیروں، دو کانوں، دو آنکھوں، ناک کے دو نتھنوں اور جبڑوں میں دانتوں کی دو قطاروں کی طرح۔ اس لیے یہ واضح ہوجانا چاہیے کہ کہانی کے اس پہلے حصے میں ''میں'' صرف ''میں'' ہی نہیں ہوں اس میں وہ بھی شامل ہے۔ میں نے جان بوجھ کر ''ہم'' کا صیغہ استعمال نہیں کیا۔ مجھے ''ہم'' سے ہمیشہ غیریت کی بو آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ''ہم'' اجتماعیت کا نمائندہ ہے مگر مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ یہ انسانوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ ان کا کلچر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کو آخر اتنے ڈھیر سارے کلچر کی ضرورت کیوں رہتی ہے۔ بہرنوع میں اپنی کہانی میں ''ہم'' کی غیریت اور دوری کا شائبہ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔

ہم کی غلط فہمی نے ہی انسان کو کبھی اپنے آپ کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جس طرح خاوند اور بیوی ہمیشہ غیر ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے جسم کے حصے ہرگز نہیں ہوتے اور ان کا ہم انہیں ایک دوسرے سے بے وفائی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ''ضمائر جمع'' سے بڑی غلط فہمی دوسری کوئی نہیں ہوسکتی۔

پھر ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ کہہ پانے کے کرب سے پتہ نہیں کیوں مجھے ہی نوازا گیا حالانکہ وجود کا کرب میں نے اور اس نے ایک عرصے تک ساتھ ساتھ ہی جھیلا مگر وہ ہمیشہ بے زبان رہا۔ آج اگر وہ یہاں ہوتا تو اپنی کہانی ہر گز نہ سناتا۔ مجھے بھی نہیں۔ ابھی میرے ''میں'' دونوں شامل ہیں اور اس سے بڑھ کر اپنائیت تو وہ جوڑے بھی نہیں دکھا سکتے جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر گھوما کرتے ہیں۔ اپنے جوتوں کو ڈانس فلور پر گھسا کرتے ہیں مگر دونوں کی وفاداریاں کہیں اور ہوتی ہیں۔ ان کی آرزوئیں کہیں اور جا کر دم توڑتی ہیں۔ اس لیے ''میں'' ایک جوتا انسانوں کے ''ہم'' پر نفرت سے تھوکتے ہوئے اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور یہاں ''میں'' کا صیغہ استعمال کرنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

مگر افسوس کہ کہانی کے دوسرے حصے میں میں واقعتاً اکیلا ہوجاؤں گا۔ بالکل آج کی طرح اکیلا۔ مگر وہ ایک الگ داستان ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سفر کی روداد کس طرح بیان کروں۔ کیا اس پتھر کے زمانے سے جب انسان ننگے پیر رہتا تھا مگر پھر اس نے اپنے گھٹنوں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لیے جانوروں کی کھال سے ڈھکنا شروع کیا؟ ہاں کہانی کا آغاز قدرے بھونڈا ہوتے ہوئے بھی میری دانست میں مناسب ترین ہے۔ شاید انسانی پیروں کی خدمت کا یہی اولین سلسلہ تھا جس کو "موچی" نام کے عظیم پیشے نے آگے بڑھایا۔ جوتے کے حق میں چمڑے کا ہمیشہ ہی اہم رول رہا (چمڑے اور خون کا تعلق بہت واضح ہے اور یہیں سے میری کہانی میں پہلی بار خون کی بو شامل ہوتی ہے) مگر لکڑی اور کپڑے کے سینڈل اور چپلیں بھی چلن میں تھیں۔ مجھے اپنے دور کے رشتے دار "بوٹ" سے نفرت ہے جو گھٹنوں تک اونچے ہوتے ہیں مگر سوائے شکاریوں فوجیوں اور پولیس والوں کے بے رحم اور سخت پیروں کے وہ کسی پیر میں نہیں سجتے۔ بوٹ ہمیشہ زمین اور انسان دونوں کے دلوں کو دہشت سے کپکپادینے پر مجبور کرتے ہیں۔

میں تو خیر ایک ایسا جوتا ہوں جو تاریخی اعتبار سے بہت بعد کی پیداوار ہے اس زمانے کی جب فیکٹریوں میں مشینوں کے ذریعے بہت بڑی تعداد میں جوتے تیار کیے جانے لگے تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ہمیشہ اس بات کا شدت سے احساس رہا کہ میرا اصل خالق تو موچی ہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں پہنچتے ہی میں ایک روحانی کیفیت سے سرشار ہوجاتا ہوں۔ میں نے موچی کے بھدے اور کھردرے ہاتھوں کو اس وقت بھی چومنے کی کوشش کی ہے جب وہ میرے تلے میں چھوٹی چھوٹی کیلیں ٹھونکتا ہے یا موٹے سوئے سے میرے اندر ٹانکے لگاتا ہے۔ جب وہ مجھ پر پالش کرتا ہے تو اس کے محنت بھرے مگر محروم ہاتھوں کے لمس سے میرے جلد ہی نہیں میری روح میں بھی اجالا پھیل جاتا ہے۔

اکثر لوگ عبادت گاہوں، باورچی خانوں اور صاف ستھرے قالینوں والے ڈرائنگ روموں کے باہر مجھے اپنے پیروں سے اتار کر رکھ دیتے ہیں۔ مہنگے اسپتالوں کے اعلیٰ کمروں میں بھی مجھے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں انسان کے ننگے پیر کو مجھ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ کچھ سادھو فقیر قسم کے لوگ بھی مجھے پہننا پسند نہیں کرتے۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی مگر جہاں

تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ زمین اور انسانی پیر دونوں ہی کو پاک صاف مانا جاتا ہے جبکہ میں ان دونوں کے درمیان کی ایک کڑی، اپنے گندے ہونے کے مقدر سے کبھی چھٹکارا نہیں حاصل کرسکتا۔ صدیوں سے انسانوں کے پیروں کی بے لوث خدمت اور حفاظت کرتے رہنے کا یہی ایک صلہ ہے جو انسان نے مجھے دیا ہے۔ میں دلدل، کیچڑ اور خون سے بھیگی زمین پر چلتا اور دھنستا رہا ہوں مگر پاک صاف جگہوں پر جانے کی مجھے کبھی اجازت نہ ملی۔ اس کی مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔ آخر ایک حقیر سے جوتے کی شکایت کے معنی ہی کیا؟

میں نے ایک کتے کی طرح آدمی کے ساتھ وفاداری نبھائی ہے۔ انسان کو یہ یاد بھی نہ ہوگا کہ کس طرح اچانک ایک دن اس کے ارتقا کے سفر میں اس کے پیروں پر ایک گھنے چھتنار درخت کا سایہ بن کر چھا گیا تھا۔ میں انسان کے جسم کے آخری سرے پر جگمگاتا ہوا ایک ستارہ ہوں۔ کیا پاؤں انسانی جسم کی وسعت کی آخری حد نہیں؟ پاؤں جس کے بعد انسان ختم ہوجاتا ہے۔ جہاں تک دماغ کا سوال ہے تو وہ صرف انسان کی ابتدا ہے۔ ایک موہوم نقطہ جہاں سے وہ شروع ہوتا ہے اور جسے ایک بے ضرر معمولی ٹوپی بھی ڈھک لیتی ہے۔ بے وجہ ہی انسان کے دماغ کا دنیا میں اتنا پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے۔ انسانوں کے سروں کو ڈھکنے والی ٹوپیاں اور اس کی گردن کو تنی رکھنے پر مجبور کرنے والی، گلے میں لٹکتی ہوئی ٹائیاں اس بھیانک سفر کو کیا جانیں جو انسانوں کے پیروں میں فیتوں سے بندھے جوتوں نے طے کیا ہے۔ بھیانک سیاہ دلدل، سفید اور خاموش برف اور خون سے بھری اس زمین کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سفر۔

یہ زمین جس میں موت کی خوشبو ہے۔ وہ خون کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ وہ صرف ایک مذبح بننے کی طرف گامزن ہے۔ میں موت کی اس خوشبو کو اپنے تلے میں بسائے خون پر ہی چلتا رہا۔ خون کو ہی رگڑتا، پونچھتا اور یہاں تک کہ چھپاتا بھی رہا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کون کون سے پاؤں میں چلتا رہتا رہا۔ ایک جوتے کی زندگی میں کبھی کبھی اتنا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اسے اپنے پہننے والے پیر بھی نظر نہیں آتے۔ میں اکثر بے آواز رویا ہوں مگر آپ نے صرف زمین پر میرے گھسٹنے کی آوازیں سنی ہیں میری کراہیں نہیں۔

جب مجھے کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا گیا تھا اور میں غلاظت میں لپٹا خاموش پڑا تھا تو ایک دن کوڑا چننے والے چند بچوں نے آکر مجھے اپنی پھٹی پرانی بوری میں ڈال لیا۔ ان بچوں کے ہاتھ کوڑے میں پڑے شیشے یا ٹین کے کسی ٹکڑے سے ٹکرا کر کٹ گئے تھے۔ ان کی انگلیوں سے لگا تار خون بہہ رہا تھا۔ خون بہتی انگلیوں سے ان بچوں نے مجھے نہ جانے کون سے مقام پر لے جا کر بوری سے نکالا تھا۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ جوتا پیر کاٹ لیا کرتا ہے مگر یہ کاٹنا کسی زہریلے سانپ یا کیڑے کا کاٹنا نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک ایسی محبت آمیز جسمانی قربت کا نتیجہ ہے جس میں کبھی کبھی تشدد کی آمیزش نہ چاہتے ہوئے بھی ہو ہی جاتی ہے۔ انسانوں کو اس سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی اپنی محبوبہ کے ہونٹوں کو زخمی کرتے چلے آرہے ہیں ۔ جب قربت ڈھیلی پڑ جاتی ہے وقت کے ساتھ ساتھ تو محبوبہ کے ہونٹ صرف لپ اسٹک سے ہی زخمی رہتے ہیں۔ آپ کے پیار سے نہیں۔ اسی طرح جب ایک جوتا ڈھیلا پڑ جاتا ہے تو وہ کاٹنا بند کر دیتا ہے اور جوتے اور پیر کے درمیان ایک خالی ہوا آکر بیٹھ جاتی ہے دونوں کو گھورتی ہوئی ایک خالی بے رنگ ہوا۔

میں شروع شروع میں اس کے پیروں کو کاٹ لیا کرتا تھا۔ وہ ایک دولت مند شخص تھا مگر اس نے مجھے جوتوں کی ایک اوسط درجے کی دوکان سے خریدا تھا۔ میں خود بھی ایک اوسط درجے کا جوتا ہی تھا مگر میرا چمڑا بہت چکنا، چمک دار اور پہاڑی کوے کی طرح کالا تھا۔ مجھ پر اتنی اچھی طرح پالش کی گئی تھی کہ کوئی بھی شخص جھک کر اس میں اس طرح اپنا عکس دیکھ سکتا تھا جیسے کسی صاف وشفاف تالاب میں۔

میری ٹو کافی چوڑی اور پر وقار تھی اور ایڑی اونچی تھی۔ میرے فیتے بہت لمبے لمبے تھے جن سے میری خوبصورتی میں اضافہ ہوتا تھا بشرطیکہ انہیں سلیقے سے ایک پھول کی شکل دیتے ہوئے باندھ لیا جائے۔

وہ شخص پستہ قد تھا مگر مجھے اپنے پیروں میں ڈال کر قد آور نظر آنے لگتا تھا۔ میری سمجھ

میں یہ نہیں آیا کہ اتنا دولت مند بڑا آدمی ہوتے ہوئے بھی وہ آخر مجھے ہی کیوں خریدنے پر بضد تھا۔

''آج کل تم بیڈ روم میں جوتے پہنے کیوں گھسے چلے آتے ہو۔'' ایک رات اس کی بیوی نے اسے درشتگی کے ساتھ ٹوکا۔

کوئی اور تو یہ محسوس نہیں کرسکتا تھا مگر میں نے اس کے پیروں کو کانپتے ہوئے محسوس کیا۔

''ادھر آؤ'' اس نے آہستہ سے بیوی سے کہا۔

''کیوں؟''

''آؤ تو'' اس نے پھر کہا۔

''بس رہنے دو۔'' بیوی کے لہجے میں بہت تلخی تھی۔

وہ بیڈ روم کے چکنے ماربل کے فرش پر مجھے پہنے سیدھا اور قدرے تن کر کھڑا تھا مگر اس کے پیر ابھی بھی کانپ رہے تھے۔

بیوی بستر پر نیم دراز تھی۔ وہ ایک بھاری جسم اور پورے قد کی عورت تھی۔ جب وہ اس کے برابر کھڑی ہوتی تو اس سے اونچی نکل جاتی۔ میں نے غور کیا تھا کہ اس عورت کے کولہے ضرورت سے زیادہ بڑے اور پیچھے کی طرف نکلے ہوئے ہیں۔ ان کولہوں پر ایک قسم کی بے رحمی، بے مروتی اور بے وفائی تک کی چھوٹ سی پڑتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ اس کے کولہے اور اس کے ہونٹ آپس میں خطرناک حد تک مماثلت رکھتے تھے۔ ان ہونٹوں کو کوئی بھی مرد چومنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

''بس ایک منٹ کو آجاؤ'' وہ ہمت کر کے دوبارہ بولا تھا۔

''لو آگئی'' وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بستر سے اٹھی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی میں نے مرد کے قد کو عورت کے قد کے برابر کردیا تھا مگر اس کے پیر اب پہلے سے بھی زیادہ کانپنے لگے تھے۔ میں نے حتی الامکان اس کپکپاہٹ کو روکنے کی پوری کوشش کی۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟'' وہ طنزیہ مسکرائی جس میں اس کے بے رحم کولہوں نے پر اسرار

انداز میں ہل کر اس کا ساتھ دیا۔

''کچھ نہیں۔ یہ جوتے دیکھو۔'' وہ مایوس سا ہو گیا۔

بیوی نے اوپر سے نیچے تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے میری طرف نظریں مرکوز کر دیں۔

''میں نے اتنے گندے جوتے آج تک نہیں دیکھے۔ تم اپنے ساتھ دھول خاک لے کر گھر میں آتے ہو۔'' اس نے ہونٹ بھینچ کر جواب دیا مگر وہ بھینچ نہ سکے۔ وہ اس کے کولہوں کی ہی طرح فاحشانہ شان کے ساتھ آگے کو نکلے رہے۔

یہ تو خیر سچ تھا کہ میرے اوپر دھول خاک اور مٹی بہت جما کرتی تھی۔ اس میں کچھ تو اس کے چلنے کا انداز اور صفائی کی طرف سے بے احتیاطی کا دخل تھا اور کچھ میرا ڈیزائن بھی اس قسم کا تھا کہ دھول مٹی کے سالموں کو ہوا کے ارتعاشات کے ذریعے میرے اوپر اکٹھا کرتے جانے میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ہر جوتا ایسا نہیں ہوتا۔ میرے اندر ایک قسم کا دیہاتی مردانہ اور کھر کھرے قسم کا حسن تھا۔ زمین پر چلتے وقت میرے اندر سے کھٹ کھٹ کی جو آواز نکلتی تھی وہ ایک ایسی صلاحیت سے بھری ہوئی تھی جس کی دھمک زمین سے زیادہ فضا میں جذب ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ ایسی آواز پر آدھی رات کو جاگتے رہو، کی صدا لگانے والے چوکیدار کی لاٹھی بھی شرما سکتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر وہ اس طرح فرش پر خاموش نہ کھڑا ہو کر وہاں ٹہلنے لگتا تو ممکن تھا کہ میری آواز سے بیوی مرعوب ہو جاتی۔

''میرا خیال ہے کہ تم اب دوسرے کمرے میں سونا شروع کر دو۔ مجھے یہ سب بہت گھناؤنا سا لگنے لگا ہے۔'' اس بار بیوی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

اس کے ٹھنڈے ہوتے ہوئے پیچ میرے اندر پھر بری طرح کانپے۔ وہ تیزی کے ساتھ مڑا اور اپنی بیوی کے خطرناک کولہوں کو ہلتا ہوا چھوڑ کر بیڈروم سے باہر نکل گیا۔

اس دن کے بعد پھر وہ کسی رات وہاں نہیں گیا۔ اس عالیشان مکان میں ایک چھوٹا سا ویران کمرہ تھا۔ وہ اسی میں اپنا زیادہ تر وقت گزارنے لگا۔ کمرے میں ایک چھوٹا سا پلنگ اور

ایک بوسیدہ سی لکڑی کی میز کے سوا کچھ نہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ کمرہ کبھی نوکروں کے رہنے کے لیے بنایا گیا ہو۔

رات کو سونے سے پہلے وہ مجھے اتار کر میز کے نیچے رکھ دیتا تھا اور خود پلنگ پر لیٹ کر خراٹے لینے لگتا تھا۔ یہ خراٹے اداس تھے۔ آدھی رات میں اس کے ان اداس خراٹوں کی آواز میرے اوپر ٹپ ٹپ کرتی ہوئی ایک اذیت ناک اندھیری بارش کی طرح گرنے لگتی۔

اس شخص کے ساتھ میں نے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزارا۔ کبھی کبھی وہ مجھے پہن کر شام کے وقت کلب بھی جایا کرتا تھا۔ کلب میں ڈانس فلور پر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا مگر اس منظر کو صرف ایک جوتا ہی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ناچنے والے کے جوتے اس کے پیروں کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ وہ اس ڈسک جوکی سے کنٹرول نہیں کیے جا رہے تھے جس کے اشارے پر عورت اور مرد ناچ رہے تھے۔ بظاہر ضرور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوتے اپنے پیروں کے ساتھ ناچ رہے ہیں مگر ایسا تھا نہیں۔

جوتے کہیں اور جانا چاہتے تھے۔ وہ کوئی دوسرا رقص کرنا چاہتے تھے۔ تو کیا کوئی ''جوتوں'' کو بھی کنٹرول کر رہا تھا؟ کوئی نادیدہ، پراسرار، بہت دور بیٹھا ''شو جوکی۔'' جوتوں کی دنیا انسانوں کی دنیا سے اتنی مختلف ہے۔ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی اتنی مختلف! مگر آہستہ آہستہ اس نے کلب جانا بند کر دیا۔ وہ رات گئے تک اپنے آفس میں ہی بیٹھا رہتا۔ گھر آکر وہ کھانا بھی نہیں کھاتا تھا بس بے تحاشا چائے پیتا رہتا تھا۔

ایک رات جب میں میز کے نیچے سے اسے پلنگ پر لیٹا ہوا دیکھ رہا تھا، اچانک مکان میں ایک عجیب سی آہٹ ہوئی جیسے کوئی ایک خطرناک ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا ہو۔ اس کے وہ اداس خراٹے رک گئے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا پھر اس نے جھپٹ کر کمرے کی وہ کھڑی کھولی جو باہر بیڈروم کی طرف کھلتی تھی۔

تاروں کی چھاؤں میں میں نے بھی صاف صاف دیکھ لیا۔

ایک لمبا سا مردانہ سایہ اس کے بیڈروم سے نکل کر آہستہ آہستہ پائیں باغ کی طرف

رینگ رہا تھا۔

وہ خاموشی کے ساتھ دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ مگر اب اس کے خراٹے ندارد تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میری ایڑی اسے اتنا اونچا نہ کرسکی جتنا کہ وہ سایہ جو آدھی رات میں اس کی بیوی کے کمرے سے باہر آکر اندھیرے میں گم ہوگیا تھا۔

لوگ لمبے اور اونچے ہونا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ خدا کی برابری کرنا چاہتے ہیں افسوس کہ ایک کمزور سا جوتا اس مقصد میں ان کی بہت مدد نہیں کرسکتا۔

مگر رکیے۔ کیا آپ نے کبھی سنجیدگی سے سوچا ہے کہ جوتا ایک ہتھیار بھی تو ہے ایک ایسا ہتھیار جسے ہر انسان اپنے ساتھ لیے گھومتا ہے۔ جوتے کے لیے کسی لائسنس کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کے کمینے پن میں بھی میں نے اس کا ساتھ نبھایا ہے۔ کسی کو ذلیل کرنے کے لیے میری شکل اچانک مکروہ ہوجاتی ہے اور میرے تلے میں بڑے بڑے دانت نکل آتے ہیں جو کاٹنے سے زیادہ چڑانے اور ذلیل کرنے کے کام آتے ہیں۔ میں ایک گھٹیا ہتھیار میں بدل جاتا ہوں جس سے کسی کو صرف بے عزت کیا جاسکتا ہے، شہید نہیں۔ اس معاملے میں خنجر، تلوار اور بندوق وغیرہ کا رتبہ یقیناً مجھ سے بلند ہے۔

صبح ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی پر جوتا نکال لیا۔ وہ مجھے ہاتھ میں اونچا کیے ہوئے اس طرح تھامے ہوا تھا جیسے کوئی کسی مقدس پرچم کو سنبھالے ہو۔

بیوی کے سفاک ہونٹوں پر ایک سیاہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔

پتہ نہیں وہ اس مسکراہٹ سے خوف زدہ ہوا، یا پھر اس کے بے رحم کولہوں سے۔

میں اس کے ہاتھ میں اس طرح ہلنے لگا جیسے تیز آندھی میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا۔

''آخر کس بوتے پر؟ کیا آج کل وہ مریل چھپکلی تمہاری آگ ٹھنڈی نہیں کرپاتی؟''

بیوی نے کچھ اس طرح کہا جیسے وہ اس سے مخاطب نہ ہو کر مجھ سے ہو اور میں نے بھی نہ جانے کیوں خود کو لاجواب محسوس کیا۔

''کمینی۔ فاحشہ۔'' وہ بڑبڑایا۔ اور اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ مگر اس نے مجھ کو زمین پر نہیں

گرنے دیا۔

اس رات میز کے نیچے پڑا ہوا میں اسے لگا تار دیکھتا رہا۔ میں اس منحوس رات کا گواہ ہوں جو صبح ہونے تک ایک پراسرار سردی سے ٹھٹھرتی رہی۔ ایسی سردی جسے صرف ریڑھ کی ہڈی ہی محسوس کرتی ہے۔

شاید موت انسان کی وہ ناگزیر تخلیق ہے جسے ہر انسان کو بہرحال جنم دینا ہی پڑتا ہے۔ خدا نے ہر انسان کو یہ عطیہ بخشا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ ہر تخلیق کی طرح موت سے پہلے بھی تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ وہ نیند جس میں بھیانک خوابوں سے بھی نجات مل جائے، خواب آور گولیوں سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ایسی نیند کو انسان کو اپنے اندر سے باہر نکال کر اسے اوڑھنا پڑتا ہے۔ ایک چادر کی طرح۔ ہر تخلیق کی طرح موت کے بھی اسلوب، ڈکشن اور تکنیک الگ الگ ہیں۔

اس رات میں نے اسے خودکشی کرتے ہوئے دیکھا۔

کھڑکی کے باہر کوئی ہنس رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ ننگے پاؤں زہر کی نیلی شیشی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا تھا۔ کیا وہ ان لمحات میں مجھے اپنے پیروں میں پہننا چاہتا تھا؟

میں اس جگہ پڑا پڑا اسے ایک ٹک گھورتا رہا۔ ایک جوتے کی آنکھ انسانوں کی آنکھ کو نظر نہیں آتی ورنہ ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے زہر کی وہ نیلی شیشی فرش پر گر کر چکنا چور ہوجاتی۔

نہیں۔ اس کی آنکھوں میں بزدلی کے کوئی آثار نہ تھے۔ پہلی بار مجھے اس کا چہرہ ایک چھوٹے سے بچے کا سا نظر آیا جس پر معصومیت اور بہادری دونوں کا نور تھا۔ بیڈ روم کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ بند تھے مگر اس کے چہرے کی اس فیصلہ کن چمک نے کھڑکی کے بند پٹوں کو چیر کر باہر پھیلے گہرے اندھیرے کو روشن کردیا۔ اس روشنی میں باہر بھٹکنے والے بدکار سایوں کی ہنسی خوف زدہ ہوکر کونے میں دبک گئی۔

زہر کو اپنے منھ میں انڈیلنے کے بعد وہ اچانک میز کے قریب آیا۔ جھکا اور میرے اوپر

اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے کوئی بچہ اپنے ٹیڈی بیئر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ میرے کالے اور سخت چمڑے کے سوکھے ہوئے مساموں میں سے آنسوؤں جیسی کوئی شے باہر نکلنے کو ہوئی۔

رات بھر اس کی لاش فرش پر اس طرح پڑی رہی کہ اس کا سر میز کے نیچے تھا۔ خاص میری ''ٹو'' پر اور پاؤں بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر۔ زہر کی وجہ سے شاید اس کی آنتیں کٹ گئی تھیں اس لیے اس کے منھ سے خون کی ایک پتلی لکیر بہتی ہوئی مجھ تک چلی آئی تھی۔ میرا سارا تلا اس خون میں ڈوبنے لگا۔

کسی انسان کو کھالینے کے بعد اگر کوئی شے کھانے یا کسی کو دینے لائق بچتی ہے تو وہ صرف جوتا ہی ہے۔ یقیناً اس مشہور فلم کے سین کی طرح جس میں ''بھوک'' منانے کے لیے دو لوگ مجھے پکا کر کھاتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں ایڑی کی طرف زیادہ مزے کا ہوتا ہوں۔ میں اپنے گوشت کا ذائقہ جانتا ہوں کیونکہ ہر جوتے کا مقصد آخر کار خود کو نوچتے اور کھسوٹتے رہنا ہی ہے۔

اس لیے مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ اس کی موت کے ہفتے بھر بعد اس کی بیوی نے مرے ہوئے آدمی کے جسم کی کٹی ہوئی ایک بوٹی کی طرح بخشش یا خیرات میں دے دیا۔

مجھے اس پر کوئی ملال نہیں ہوا کیونکہ میں خود بھی اب اس منحوس گھر میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ غریب اور بہادر شخص مجھے پلاسٹک کے ایک میلے سے تھیلے میں ڈال کر بہت سنبھال کر تقریباً اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلا۔

تھیلے میں بند ہوئے میں نے اور میرے جڑواں نے ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھا۔ میں اس کے مقابلے میں زیادہ پھٹے حال نظر آتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں انسان کے بائیں پیر میں پہننے کے لیے بنایا گیا تھا۔ لوگ اکثر بائیں پیر ہی زیادہ زور ڈالتے ہیں اور گرتے پھسلتے بھی بائیں طرف ہی زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بائیں پیر والے جوتے کی ایڑی جلدی گھس جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے تلے میں جو خون سوکھ کر اب کالا پڑ گیا ہے، اس کی وجہ سے بھی میں نسبتاً زیادہ گندا محسوس ہوتا ہوں۔ میرا جڑواں

تو ابھی بھی نیا ہی نظر آتا ہے۔ مگر آگے چل کر ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب وہ خون میں بھیگا اور میں یونہی بے داغ فرش پر پڑا رہا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایک جوتے کا انسان کے پیر سے وہی تعلق ہوتا ہے جو انسانی شعور کا وقت کے ساتھ۔ جس طرح شعور وقت کے ساتھ ساتھ چلا کرتا ہے اسی طرح جوتا انسان کے پیر کے ساتھ۔ جس طرح انسان وقت کو ٹھوس روپ میں دیکھنے سے قاصر رہتا ہے، اس طرح ایک پیر بھی جوتے کے اصل وجود سے نابلد ہی رہتا ہے مگر یاد رکھیے کہ ہر جوتے کا ایک پیر ہوتا ہے۔ جو لوگ محض اندازے سے یا کاغذ پر پنسل سے اپنے پاؤں کے ناپ کا نقش دیتے ہوئے جوتا منگواتے ہیں ان کے پیر کو وہ کہیں نہ کہیں سے دباتا ضرور ہے۔ زیادہ تر ایڑی یا پنجے کی طرف سے۔ اس میں جوتے کا بہر حال کوئی قصور نہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ یہ ایک تشدد آمیز قربت ہے۔ مگر شاید ہی کسی کو یہ احساس ہوگا کہ صرف جوتے ہی نے نہیں، انسان کے پیر نے بھی جوتے کو کاٹا ہے۔ جوتے نے تو سانپ کے زہر کو اپنی رگوں میں پی لیا ہے اور انسان کے پیر کو ہر زہر سے بچالیا ہے۔ مگر انسانوں نے زمین پر جس غلط طریقے سے قدم رکھے ہیں، اس کی وجہ سے ان کے بے زبان جوتوں کے تلے میں کیلیں ابھر آئی ہیں جو یوں تو ان کے تلوے میں بھی چبھتی ہیں مگر ان کیلوں نے جوتوں کے وجود کو لہولہان کر ڈالا ہے پھر بھی وہ دنیا کے ان کبھی نہ ختم ہونے والے راستوں پر گھسٹتا اور رگڑتا ہوا چلتا ہی جاتا ہے۔

معاف کیجیے۔ یہ دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہرگز نہیں ہے۔ میں کہانی کی طرف واپس آتا ہوں حالانکہ یہ بھڑاس بھی کہانی کا ایک باب ہے۔

دراصل میں اس غریب اور بیمار شخص کے ناپ کا جوتا نہیں تھا۔ میں اسے آگے یعنی پنجے کی طرف تھوڑا دباتا تھا جس کی وجہ سے اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ پیدا ہوجاتی تھی۔ اس بات کے لیے میں آج بھی شرمندہ ہوں۔

وہ غریب اور بیمار شخص ایک سبزی فروش تھا۔ پو پھٹتے ہی وہ گھر سے نکلتا اور اپنا ٹوٹا پھوٹا ساٹھیلا لے کر سبزیوں کی آڑھت کی طرف چل دیتا۔ اس وقت شہر کی تمام سڑکیں سنسان ہوتیں

جن پر ٹھیلے خستہ حال لکڑی کے پہیوں کی آواز میری کھٹ کھٹ، کے ساتھ مل کر ایک ایسے گیت کا التباس پیدا کرتی جسے صبح کی عبادت کے لیے رچایا گیا ہو۔ ویسے کیا کبھی کسی نے غور کیا ہے کہ انسانی پیر میں کس کر فیتے سے بندھے ہوئے جوتے کی زمین پر چلتے رہنے کی آواز سے بڑھ کر دوسری کوئی موسیقی نہیں ہے۔ جوتے کی یہ آواز ایک تنہا سُر ہے جو کبھی خاموشی کی طرف نہیں بڑھتا۔ وہ بڑھتا ہے کسی پر اسرار اندھیرے کی طرف۔

آڑھت پر ہر جگہ رنگ برنگی سبزیوں کا ڈھیر سا لگا رہتا۔ ہر طرف ٹرک ہی ٹرک کھڑے نظر آتے جن سے تازہ سبزیوں کی بوریوں کو اپنے کاندھوں اور پشت پر لاد کر اتارتے ہوئے مزدوروں کا ایک جمگھٹا لگا ہوتا۔

وہ اپنا ٹھیلا کھڑا کر کے سبزیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھ جاتا۔

میرے تلے میں زمین پر بکھری ہوئی باسی اور سڑی ہوئی سبزیاں اور ترکاریاں کچلتی رہتیں وہ اکثر جن پر پھسلتے پھسلتے بچتا۔ کبھی کبھی وہ اکڑوں بیٹھ جاتا اور ان باسی اور سڑی ہوئی سبزیوں کو الگ کرتے ہوئے ایسی مولیوں، گاجروں اور آلو یا ساگ وغیرہ کو چننے لگتا جو خراب ہونے سے بچ گئے تھے۔

ایک دن وہ اکڑوں بیٹھا ہوا یہی کر رہا تھا کہ اس کی پیٹھ پر ایک سخت جوتے کی نوک پڑی۔ وہ باسی سبزیوں پر اوندھے منھ گر پڑا۔ اس کی آنکھوں، منھ اور ناک میں سڑے ہوئے ساگ کے پتے اور اُن میں بجبجاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سفید کیڑے گھس آئے۔

''کیوں بے۔ تو نے روز کا ڈھرّہ بنالیا ہے۔ مفت میں مال لے جاتا ہے؟''

اس کے پیچھے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کیم شحیم پہلوان جیسا نظر آنے والا آدمی کھڑا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتے ہوئے بمشکل اٹھ سکا۔

گرتے وقت شاید اس کی زبان دانتوں کے درمیان پھنس کر بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کے قابل رحم انداز میں کھلے ہوئے اور معافی مانگتے ہوئے منھ سے لگا تار خون بہہ رہا تھا۔ یہی نہیں اس کا سر بھی چوٹ کھا گیا تھا کیونکہ ماتھے پر بھی خون رس آیا تھا۔ میں نے غور کیا

کہ زمین پر پڑے ساگ کے ہرے ہرے لیس میں اس کے منھ سے نکلی خون کی سرخی بھی شامل ہوگئی ہے۔

زمین پر یہ کون سی پینٹنگ بن رہی تھی؟ کیا کسی ملک کے پرچم کے لیے کلر اسکیم تیار ہو رہی تھی؟

میں آڑھتی کے اس کمینے اور بے رحم جوتے پر جھپٹ کر وار کرنا چاہتا تھا مگر تب ہی میں نے محسوس کیا کہ میں جن کمزور پیروں میں بندھا ہوا ہوں، وہ اس کی اجازت مجھے کبھی نہ دیں گے۔

''سالے آئندہ یہاں سبزیاں بینتے نہ دیکھوں ورنہ تیری ماں.....'' انسان کے اس غیر انسانی بیٹے نے کہا اور پھر اپنے جوتے کی نوک سے زمین پر عورتوں مردوں کے پوشیدہ اعضاء کی نہایت صاف تصویر بنانے لگا۔

مزدوروں اور غریبوں کی کمر پر وار کرنے والا یہ جوتا ایک آرٹسٹ کا برش بھی تو تھا۔

اس صبح وہ خالی ہاتھ آڑھت سے واپس آیا۔ اپنے پھٹے ہوئے سر کے ساتھ سڑک پر اپنا خالی ٹھیلا کھینچتے ہوئے۔

ہر انسان کا سر پھٹا ہوا ہے اور اس سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ پھٹے ہوئے سر اور بہتے ہوئے خون کے ساتھ نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہیں۔ یہ ایک المناک مگر مضحکہ خیز سلسلہ بھی ہے۔ انسان کے قدموں کے اس سفر کا گواہ صرف ایک جوتا ہے۔ اس کے پیروں کے شعور کے ساتھ وقت کی طرح لپٹا ہوا۔

آہستہ آہستہ اس کی کھانسی بڑھنے لگی۔ شام ہوتے ہی اسے تیز بخار چڑھ آتا اور پھر رات بھر کھانسی کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس کی بیوی تمام رات جاگ کر اس کا سینہ سہلاتی رہتی جو ربڑ کے غبارے کی طرح پھولتا اور پچکتا رہتا۔

میں اس کے پلنگ کی پائتی پڑا پڑا اسے کھانستے ہوئے دیکھتا رہتا۔ انسان کی کھانسی میں موت اور خون کی بو چھپی ہوتی ہے۔ اس گرمی اور حبس کی طرح جس کے بالکل عقب میں ایک

خوفناک بارش کھڑی رہتی ہے۔ ایک ایسے اداکار کی طرح جو اشارہ پاتے ہی پردے کے پیچھے سے نکل کر اسٹیج پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ میں نے اس بو کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے محسوس کیا۔

یہ 'بو' اس دن بہت زیادہ تھی جب وہ سرکاری اسپتال کے ایک کمرے میں ڈاکٹروں کے ایک گروپ کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

سب سے بڑے ڈاکٹر کے ہاتھ میں اس کی ایکس رے رپورٹ تھی۔

''بیڑی پیتے ہو؟'' ڈاکٹر نے پولیس آفیسر کی طرح سوال کیا۔

''پیتا تھا صاحب مگر دو سال ہوئے چھوڑ دی۔'' اس نے مجرموں کی طرح اعتراف کیا اور اس کا سر اس جرم کے لیے شرمندگی سے جھک گیا۔ میں اسے اور وہ مجھے خالی خالی نظروں سے تکے جا رہے تھے۔

''ہوں'' ڈاکٹر نے غور سے ایکس رے کو روشن بلب کے پاس لے جاتے ہوئے کہا۔

''گٹکا کھاتے ہو'' ڈاکٹر اس بار تقریباً گرجا۔

''ارے صاحب بالکل نہیں۔ گٹکا تو آج تک چھوا بھی نہیں۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ اس کا سر گویا غرور سے اوپر اٹھ گیا۔ یہ اس کے جرم سے بری ہونے کا ثبوت تھا۔

''ہوں'' ڈاکٹر نے ایک طویل سانس لی اور پھر اپنے ماتحت ڈاکٹروں کو ایکس رے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کچھ سمجھانے لگا اور وہ سب بارعب انداز میں اپنے سروں کو جنبش دینے لگے۔

غریب سبزی فروش بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا کہ شاید آج اتنے بہت سے ڈاکٹر اسے اتنی توجہ کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ مگر میں جانتا تھا کہ بڑا ڈاکٹر ایک بہت ہی خطرناک بیماری کی علامات کے بارے میں اپنے ماتحتوں کو سمجھا رہا تھا اور وہ سبزی فروش ان سب کے لیے ایک مینڈک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔

اپنے ہاتھوں میں چند دوائیاں اور جسم میں چند نادیدہ سیاہ دھبے لیے وہ خوش خوش گھر واپس آیا۔

''اپنے لیے کوئی پھل بھی لے آتے۔'' اس کی بیوی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''پھل؟'' وہ اداس ہو گیا اور اسے اپنے ٹھیلے کے پہیے یاد آ گئے۔

اس شام جب وہ اپنے گھر کے کچے آنگن میں کھڑا تھا اچانک اسے بہت زور کی کھانسی آئی۔ اس نے کھنکار کر تھوکا تو سارا بلغم خون سے بھرا ہوا تھا۔

وہ گھبرا گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی یہ خون دیکھے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے خون کو میرے نیچے دبا دیا اور کچی مٹی میں اسے بری طرح رگڑنے لگا۔

اس پوری رات ایک سڑی ہوئی ہوا چلتی رہی۔ یہ حبس اور نمی کی چادر کے نیچے جمی ہوئی ہوا تھی۔ یہ ہوا جب بہتی ہے تو کچھ نہیں ہلتا۔ نہ کوئی چادر، نہ قمیص کا کالر، نہ کرتے کا دامن اور نہ سر کے بال۔ میں اس سڑتی ہوئی ہوا کے دو کناروں کے بیچ، اس کی پائنتی پڑا خاموش اسے بخار میں آہستہ آہستہ جلتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی بیوی کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ آج اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات میں کتنی بار اس کے منہ سے خون آیا۔ مجھے یاد نہیں۔ مجھے یاد تو صرف اتنا کہ ہر بار ایسا ہونے پر وہ بخار سے جلتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے مجھے تھام کر اس خون کو کچی زمین میں رگڑ رگڑ کر جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے بخار زدہ ہاتھوں کے لمس سے میں پگھل پگھل کر بہہ جانے کو ہوا۔

صبح ٹھیک اس وقت جب پو پھٹ رہی تھی اور جو اس کے ٹھیلا لے کر گھر سے نکلنے کا وقت تھا، اچانک اس کی کھانسی رک گئی۔ رات بھر اس کی بیوی کو اس نہ رکنے والی کھانسی نے اتنا نہیں چونکایا تھا جتنا کہ اس خاموشی نے۔

عجیب خاموشی تھی۔

وہ جلدی سے اٹھی۔

زمین پر پلنگ کی پائنتی کے پاس خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ میرا تلا اس خون میں چپکا

ہوا تھا۔

دور کسی مسجد میں فجر کی اذان ہوئی۔ اس کی بیوی کے بین بلند ہوئے۔

دیکھا آپ نے! میرے پیروں کے نیچے کیا کیا کچلا گیا، وہی مری گھاس، گوبر، کیڑے مکوڑے، سوکھے پتے، کیچڑ اور سڑی ہوئی سبزیاں۔ مگر کیا آپ واضح طور پر یہ محسوس نہیں کرتے کہ مجھے بار بار خون سے لتھڑنا پڑتا ہے۔ خون کو پھلانگنا پڑتا ہے۔

میں اس خون کو کتنی بار پھلانگوں؟

مرنے والے کی بیوی کا ایک غریب بھانجا کسی گاؤں سے آکر اس شہر میں کالج میں پڑھنے لگا تھا۔ سوئم کے روز جب وہ فاتحہ میں شرکت کے لیے آیا تو مرنے والے کی بیوی نے مجھے ایک گیلے کپڑے سے صاف کیا اور پھر اسے سونپ دیا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لڑکے کے کپڑے کے بنے ہوئے جوتے بالکل پھٹ گئے تھے دوسرے یہ بھی مردہ لوگوں کی بہت سی چیزیں دوسروں کو ثواب کی غرض سے دینے کا رواج تو رہا ہی ہے اور اگر وہ دوسرے اس کے مستحق ہوں تو عین نیکی ہی ہے۔

وہ لڑکا یقیناً مستحق تھا۔ ٹیوشن پڑھا پڑھا کر وہ اپنی تعلیم کا خرچ پورا کیا کرتا تھا۔ اکثر بے چارے کو فاقہ بھی کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ جس کوٹھری میں کرائے پر رہتا تھا، اس کا کرایہ بھی ادا کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ مگر وہ تھا بہت ذہین اور محنتی۔ میں اسے تمام رات لالٹین کی روشنی میں پڑھتے ہی دیکھتا تھا۔ جیسا کہ میرا مقدر رہا تھا، میں اس کے پلنگ کے نیچے پڑا پڑا تمام رات جاگ کر گزارتا تھا ایسا نہیں ہے کہ جوتے کو نیند نہیں آتی ہے جوتا بھی سوجاتا ہے، آپ کے وفادار گھوڑے یا کتے کی طرح مگر فی الحال زمین پر جو حالات چل رہے ہیں، ان میں ایک جوتے کی آنکھ لگ جانا ممکن نہیں ہے۔

وہ جس قسم کی کتابیں پڑھتا تھا وہ ایک قسم کی داخلی غلط فہمی پر مبنی تھیں۔ کتابوں میں چھپے ان الفاظ کا کوئی معنی نہیں تھا یہ صرف استعاروں کی اندھی فوج تھی جسے زمین پر بچھائی گئی بارود کی سرنگوں سے گزر کر پرزے پرزے ہو کر اڑ جانا تھا۔ مگر افسوس کہ یہ حقیقت بھی صرف ایک جوتا ہی

جانتا تھا۔

لڑکا شہر کے ایک بہت دولت مند اور بارتبہ شخص کی بیٹی کو بھی ٹیوشن پڑھانے جایا کرتا تھا۔ لڑکی عمر میں اس سے بس تھوڑی ہی چھوٹی ہوگی۔ جیسا کہ ان حالات سے اکثر ہوا کرتا ہے، دونوں میں زبردست عشق ہوگیا۔ اس عشق میں ان دونوں سے زیادہ لطف مجھے آتا تھا کیونکہ ان کی محبت کے درمیان میں وہی کام انجام دے رہا تھا جو ایک گلاب کا پھول انجام دیتا ہے۔

وہ لڑکی خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کی چال بہت پرکشش تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ زمین پر کسی ملکوتی حسن کی پرچھائیں کی طرح چل رہی ہو۔ یا پھر اس کے وہ دو پتلے پتلے سے ہاتھ جو اکثر لکڑیوں کی طرح نظر آتے تھے اور جن میں گوشت پوست کی ارضیت کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ ہاتھ دو سفید خشک لکڑیوں کی طرح پاکیزہ تھے۔ ایسے پاکیزہ ہاتھ جن میں کانچ کی چوڑیوں کو بجتے ہوئے یقیناً شرم آئے گی۔

وہ دونوں جب بھی ملتے تو لڑکی اس سے جوتے اتارنے کی فرمائش کرتی۔ لڑکا میرے فیتے کھول کر مجھے اپنے پیروں سے نکال لیتا۔ تب لڑکی آہستہ سے اپنے نازک پیر میرے اندر ڈال دیتی۔ میں اس کے پیروں سے بہت بڑا تھا۔ اس کے پیر جب میرے اندر داخل ہوتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ کوئی ملائم خرگوش میرے اندر چھپ کر سو گیا ہے۔

لڑکی کو یہ عجیب خبط تھا۔ شاید ہر سچے عشق میں ایک مقدس دیوانگی کا عنصر ضرور شامل رہتا ہے۔ مجھے پہن کر فرش پر چکر لگانا شروع کردیتی۔ وہ اس طرح چلتی جیسے اڑ رہی ہو۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے میں سخت زمین پر نہیں بلکہ ہوا کی ایک تنی ہوئی قنات پر چل رہا ہوں۔ مگر مجھے اس بات پر بہت زیادہ شرمندگی ہوتی تھی کہ میرے اندر ایڑی کی طرف کم بخت ایک کیل ڈھیلی ہو کر اوپر کی طرف ابھر آئی تھی۔ یہ کیل لڑکی کے نازک پیر کی ایڑی پر ضرور چبھتی ہوگی۔ مجھے اپنی خستہ حالی پر بھی شرم آتی تھی۔ لڑکے کو کبھی اتنی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ وہ مجھے کسی موچی کے پاس لے جاکر تھوڑی سے مرمت کروا دیتا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر یہ حالت رہی تو بہت جلد میرے تلے میں سوراخ ہو جائیں گے۔

لڑکا اسے فرش پر چلتا ہوا دیکھتا رہا۔

''چلو اب جیومٹری پڑھ لو۔'' آخر وہ تھک کر کہتا۔

''میں تو نہیں پڑھوں گی۔'' لڑکی اپنے قدم گنتے ہوئے کہتی۔

''پڑھ لو۔ تمہاری جیومٹری بہت کمزور ہے۔''

''اس جوتے کی جیومٹری کیا ہے؟ اچھا بتاؤ یہ تم نے کتنے میں خریدا تھا۔'' وہ مسکرا کر سوال کرتی۔

لڑکا خاموش اور اداس ہو جاتا تھا۔

پھر وہ فرش پر چکر لگاتے لگاتے تھک کر بیٹھ جاتی اور لڑکے کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگتی۔

یہ ان دو محبت کرنے والوں کا روز کا کھیل تھا جس میں کسی چاکلیٹ، آئسکریم، ریستوران یا بائیک کے بجائے ایک پھٹے حال جوتے کا ہی سب سے اہم رول تھا۔

سردی جا رہی تھی۔ یہ دن بڑے عجیب ہوتے ہیں، موسم گرم ہونے لگتا ہے۔ مگر اتنا بھی نہیں کہ لوگ اپنے سوئیٹر اتار پھینکیں۔ جب ہوا زیادہ گرم ہو جاتی ہے تو ان دنوں اولے گرتے ہیں۔ اس شام بھی ہوا گرم تھی اور آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایسے بادل حبس پیدا کرتے ہیں اور ہر چیز دھول میں لپٹی نظر آتی ہے۔ مگر وہ زیادہ دور نہیں تھی۔ یعنی بارش وہ اس حبس کے پیچھے ہی کھڑی تھی اچانک اس نے حبس کو ایک طرف کیا اور نکل کر سامنے آئی۔ زوردار گرج چمک کے ساتھ بارش ہو گئی۔

لڑکا لڑکی کے گھر جا رہا تھا۔ ادھر کی گلیوں میں پانی بہت بھر جاتا تھا۔ نالیاں اور پرنالے امنڈنے لگتے۔ ایسی ہی ایک سڑک پر وہ پانی میں پھنس گیا۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سڑکوں، گڑھوں، نالیوں اور ندیوں میں پانی بڑھنے لگا۔

لمبی ویران سڑک پر وہ گھٹنوں گھٹنوں چڑھ آتے پانی میں اپنی پتلون کے پائنچے اٹھائے خاموش کھڑا تھا۔ میں پانی میں ڈوب چکا تھا۔

اچانک رات آ گئی۔ بس ایسا لگا جیسے بارش رات میں بدل گئی تھی۔ آسمان پر ایک بار بادل بہت زور سے گرجے اور تب جا کر کہیں وہ اولے گرنا شروع ہوئے۔ گرتے اور ناچتے ہوئے، مردوں جیسے سفید اولے پانی کے اوپر تیر رہے تھے۔

آسمان سے زمین تک اولوں کی ایک سفید باریک سی چادر تن گئی اور جس کے ڈھیلے ہوتے ہوئے پنجوں سے نکل کر ہوا بھی چلنے لگی۔

سردی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ مجھ میں آ کر اکٹھا ہونے لگی۔

لڑکا سردی سے بری طرح کانپتا ہوا اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں سمیت ایک بند دوکان کے ٹین کے شیڈ کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ ہوا بہت تیز تھی اور شیڈ اس سے بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

بہت دیر بعد بارش رکی۔ میرے اوپر تھکن طاری ہونے لگی۔ میں پانی میں تر ہو کر بے حد بوجھل ہو گیا تھا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جس طرح زلزلہ آنے سے پہلے حشرات الارض بے چین ہو کر ادھر ادھر نکل کر بھاگتے ہیں اسی طرح ایک جوتا بھی زمین کے تمام پوشیدہ اور پراسرار ارتعاشات کو خوب سمجھتا ہے۔

اس رات بہت دیر ہو گئی تھی جب لڑکا لڑکی کے گھر پہنچا۔ میری مرضی نہیں تھی کہ اس وقت وہ وہاں جائے۔ ان جانداروں کو ہمیشہ عقل کا استعمال کرنا چاہیے جنہیں ہمیشہ خطروں کا سامنا رہتا ہے۔ حالانکہ قدرت تو کبھی عقل کے آگے سر نہیں جھکاتی۔ عقل خطرے کے بدلے میں ادا کیے جانے والا ایک ٹیکس ہے۔

یقیناً لڑکے نے یہ ٹیکس ادا نہیں کیا۔

''تم آج۔ ایسی بارش میں کیسے آ گئے؟'' لڑکی نے کہا اور اس کی آنکھیں غیر معمولی حد تک حساس نظر آئیں جیسے گہرے پانیوں میں رہنے والی مچھلیوں کی ہوتی ہیں۔

''آتا کیسے نہیں۔''

''نہیں۔ تمہیں اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔ پتہ ہے اسے خبر لگ گئی ہے اور میں آج گھر میں اکیلی ہوں۔''

"مجھے تمہارے اکیلے پن سے کوئی غرض کبھی نہیں رہی۔"

اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور میں تو بھیگ کر بالکل شل ہو چکا تھا۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"نہیں تو۔"

"کانپ جو رہے ہو۔"

"نہیں تو۔"

"اگر بخار آ گیا؟"

"نہیں آئے گا۔"

"تم ضدی ہو۔"

"تم آج جوتے نہیں پہنو گی؟"

"نہیں۔"

"کیونکہ وہ بھیگ گئے ہیں؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"تمہیں سردی لگ رہی ہے؟ تم کانپ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"میرے قریب آ جاؤ۔"

"نہیں۔ تم جوتے پہن لو۔"

"اچھا۔"

لڑکی اس کے قدموں کے پاس جھک آئی اور میرے فیتے کھولنے لگی جو گیلے ہونے کے باعث بڑی مشکل سے کھل پائے۔ وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کے جسم سے ٹپکتے ہوئے پانی نے فرش کو گیلا کرنا شروع کر دیا تھا۔

لڑکی نے اپنے دبلے پتلے، لکڑیوں جیسے دونوں ہاتھوں میں مجھے اٹھایا۔ پہلے اس نے اپنے دائیں پیر میں میرے نصف وجود، میرے جڑواں کو ڈالا پھر دوسرے ہاتھ سے مجھے اٹھا کر غور سے دیکھنے لگی۔

وقت محبت کے سکھ کے ساتھ، ہر قسم کی فکر اور اندیشے کو غبار کی طرح اڑاتا ہوا، بے نیازانہ، ایک مست جھومتے ہوئے ہاتھی کی طرح چلا جا رہا تھا کہ اچانک وقت پر دکھ ایک چمکدار خنجر کی طرح لپکا۔

(۲)

سب سے پہلے تو وہ ماں کی ایک گندی گالی تھی جو فضا میں گونج کر رہ گئی۔

کیا گالی سے زیادہ ہلاکت خیز دنیا کی کوئی اور شے بھی ہو سکتی ہے؟

گالی انسان کے سب سے بڑے کرشمے یعنی زبان کو اس طرح قتل کرتی ہے کہ اپنی موت کے ساتھ ہی زبان ایک خوفناک بھوت بن جاتی ہے۔ گالی زبان نہیں، زبان کا وہ بھوت ہے جو یوں تو انسان کے جسم کو ذلیل کرتا ہے مگر اس کی مار درحقیقت انسان کی روح کو سہنا پڑتی ہے۔

"تیری حرکت بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ آج تیری بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔ بھڑوے"

ایک ایسی آواز نے کہا جو جاہل عورتوں کی طرح بیٹھی ہوئی، مہین اور جلن اور حسد سے بھری ہوئی تھی۔ مگر جن ہونٹوں سے یہ آواز نکلی تھی وہ عورت کے ہرگز نہیں تھے۔

لڑکی گھبرا کر دور کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں اس کے ہاتھ سے نہ جانے کب زمین پر گر چکا تھا۔

ٹھہریے اور ہوشیار ہو جائیے کہ اسی مقام سے میرے خالص اکیلے پن کی ابتدا ہوتی ہے۔ میرے "میں" کے اندر سے میرا نصف وجود باہر نکل گیا ہے۔

لڑکا ننگے پاؤں اسی طرح، اسی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے کپڑوں سے ابھی بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ مگر وہ کانپ نہیں رہا تھا۔ وہ تو اس وقت بھی نہیں کانپا جب وہ فحش اور مہین آواز اس کی طرف

لوہے کی ایک سیاہ وزنی سلاخ لیے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

''نہیں۔ خدا کے لیے اسے نہیں مارو۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے۔'' لڑکی کی چیخ سے وہ کونا کانپ اٹھا جہاں وہ ایک پیر میں جوتا پہنے سہمی اور سمٹی کھڑی تھی۔

میں فرش پر تھوڑی دور پڑا بے بسی کے ساتھ یہ دل ہلا دینے والا منظر دیکھے گیا۔

لوہے کی وزنی سلاخ کی چوٹ کے نیچے میں نے اس کی سر کی ہڈیوں کو چٹختے ہوئے محسوس کیا۔ اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ہوا میں خون کی بو شامل ہو گئی۔

لڑکی کا منہ کسی ہذیانی چیخ کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کے پتلے پتلے لکڑیوں جیسے ہاتھ خلا میں پھیل گئے۔

لڑکے کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں بہتا ہوا خون کونے میں آ کر لڑکی کے قدموں کو چھونے لگا۔ اس کے ننگے پیر کو بھی اور اس پیر کو بھی جس میں جوتا۔ یعنی میرا ہم شکل یا میرا آدھا وجود موجود تھا۔

عورتوں جیسی وہ مہین مگر فاحشہ آواز لڑکی کو اس حالت میں کسی جانور کی طرح ہنکاتی ہوئی کمرے سے باہر دور ایک رکی ہوئی بارش کے نیچے پھیلے بیکراں اندھیرے میں لے گئی۔

اب میں اس تاریک کمرے میں اس کی لاش کے ساتھ بالکل اکیلا تھا۔ اب ''میں'' صرف ''میں'' تھا بالکل اس لاش ہی کی طرح اکیلا جس کی ہم شکل روح اس کے جسم سے نکل کر کہیں دور تاریکی میں مل گئی تھی۔

فرش پر خون اکٹھا ہوتا ہی جا رہا تھا وہ اس پانی سے گھل مل رہا تھا جو لڑکے کے بارش سے تر کپڑوں سے ٹپکا تھا۔ مگر یہ کتنی تعجب خیز بات تھی کہ اس بار خون کی ایک چھینٹ بھی مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ میں اس دفعہ بے داغ تھا۔ کیا اس لیے قدرت نے میرے ساتھ یہ مذاق کیا تھا کہ میری آگے کی تمام زندگی اپنے ساتھی کی تلاش میں گزرنا تھی؟ وہ جوتا جو لڑکے کے خون میں پوری طرح ڈوبا ہوا ہے۔ مجھے اس خون بھرے جوتوں کے نشان کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ وہ

نشان ہی اس تک پہنچنے کا ایک راستہ یا سراغ ہیں۔

اپنے ساتھی کی تلاش کے لیے میں نے اسی فرش پر پڑے پڑے انتہائی مجبوری کے عالم میں پتہ نہیں کس سے دعا مانگی۔ کاش میں چل سکتا۔ انسان کے پیر کا سہارا پائے بغیر ہی چل سکتا۔

اور پھر وہ کرشمہ ہوا جس پر کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ میرے اندر ایک سنسنی سی پھیلنے لگی۔ میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت کو اپنی ایڑی اور پنجے پر اس طرح اکٹھا کیا جس طرح کوئی برسوں پرانا فالج زدہ شخص بے بسی کے عالم میں کرتا رہتا ہے۔

مگر مجھے واقعی محسوس ہوا کہ میں چل سکتا ہوں۔ کیا کوئی بھٹکتی ہوئی آتما میرے اندر داخل ہو گئی تھی؟ مجھے نہیں معلوم مگر واقعتاً میں چلنے لگا۔ اکیلا اور بغیر کسی انسانی پیر کے میں اس جگہ کو چھوڑ کر چل دیا جہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں نے غور کیا کہ میرے چلنے سے زمین پر کوئی نشان نہیں پڑ رہا تھا۔ کیا میں اڑ رہا تھا؟ جس طرح پرندے زمین پر اپنے قدموں کے نشان نہیں چھوڑتے۔ برخلاف چوپایوں کے۔

اندھیرے میں اپنے جڑواں جوتے کے خون بھرے نشانوں پر میں چلتا ہی رہا۔ نہ جانے کتنی دیر تک اور کہاں تک۔ میرے سر پر آدھی رات سائیں سائیں کرتی رہی۔ مگر افسوس کہ وہ نشان ایک خاص مقام پر جا کر غائب ہو گئے۔ جہاں صرف ایک سوکھی جھاڑی کھڑی تھی۔

اس کے بعد مجھ پر کیا گزری، یہ بیان کرنا مشکل ہے، میرے حافظے میں صرف تصویریں اور آوازیں ہیں۔ کوشش کروں گا کہ انہیں سے اپنی داستان کو آگے بڑھا سکوں۔ مشکل یہ بھی ہے کہ ان تصویروں پر خون کے چھینٹے ہیں اور ان آوازوں سے خون کے بھبکے آتے ہیں۔

آپ اب یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آخر اس جوتے کے سر پر خون کیوں سوار ہے؟

نہیں یہ خون میرا تکیہ کلام یا لنک ہرگز نہیں ہے۔ اگر آپ ایک جوتے کے سالہا سال کے تجربے سے کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یقین کریں کہ یہ زمین صرف خون کی بارش مانگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر طرف خون ہی خون ہے اس راز کو ایک جوتے سے بہتر کوئی نہیں

جانتا۔

(تو خون کا بار بار ذکر کیے بغیر میں رہ نہیں سکتا اور آپ کو آزادی ہے کہ اگر اس سے آپ کے لطیف جمالیاتی احساس کو ٹھیس پہنچتی ہے تو آپ بیچ میں سے ہی اٹھ کر چلے جائیں میری داستان کو ادھورا چھوڑ کر)

اب آگے کی میری ساری داستان دراصل اُس کربناک سفر اور تلاش کی روداد ہے جس میں زمین نے میرے تلے کو بری طرح روند ڈالا ہے۔ میرے اندر پیوست تمام کیلیں اب زیادہ ابھر آئی ہیں۔ ان کیلوں پر انسانوں کے لٹکتے ہوئے گندے کپڑوں کا بھی بوجھ شامل ہے۔ میری سلائیاں ہر طرف سے ادھڑنے لگی ہیں۔ میرے لبے لبے فیتے دھجیاں بن کر سڑک پر رگڑتے رہتے ہیں۔ سڑک پر بغیر کسی انسانی پیر کا سہارا لیے چلتے جانے کی سکت بھی اب مجھ میں کم ہوگئی ہے۔ ویسے بھی کرشمہ اب کم ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہی یہ طاقت غیر محسوس طریقے پر میرے اندر داخل ہوجاتی تھی۔ مگر کیوں کہ میری زندگی کا مقصد صرف اپنے نصف وجود، کو تلاش کرنا تھا اس لیے پھر بھی میں چلتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی بار خون کے ان نشانوں کے اوپر چلا جو ایک سوکھی جھاڑی تک جا کر غائب ہوجاتے ہیں۔ مگر افسوس۔ افسوس۔

لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس کے بعد میری ہمت دوبارہ اس طرح چلنے کی ہوئی ہی نہیں۔ ہوا یہ کہ چاندنی رات میں ندی کے پرانے پُل پر ایک سنسان رات میں، میں اکیلا چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی گلی سے نکل کر پُل پر دو تین لوگ سامنے آگئے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے کوئی عجیب الخلقت جانور سمجھا تھا مگر بعد میں وہ قریب آئے میں انہیں صاف صاف نظر آگیا۔ کہ اس اکیلی سڑک پر ایک خستہ حال جوتا تقریباً رینگتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

انسانی پیروں کے بغیر جوتے صرف دوکانوں میں یا کہیں رکھے ہوئے ہی مناسب لگتے ہیں۔ انہیں اس طرح چلتے ہوئے دیکھنے کے لیے انسان کے حواس و اعصاب شاید کبھی تیار نہ ہوں وہ دہشت زدہ ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ کسی کے ایک پیر کا جوتا آدھی رات میں سڑکوں اور

گلیوں میں آپ ہی آپ چہل قدمی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لوگ خوف زدہ رہنے لگے۔ انسان سب سے پہلے جس بات پر وشواس کرتا ہے، اسی سے خوف بھی کھاتا ہے۔ وشواس اور خوف کا رشتہ بڑا بے تکا ہے۔ خوف کے اظہار کا سب سے پرانا، فطری اور روایتی طریقہ لرزنا اور کانپنا ہی ہے۔ جبکہ وشواس قبول کرلیے جانے کا اور اپنی دنیا میں داخل کرلیے جانے کا عمل ہے۔ کانپ کر اور لرز کر ہم اپنی روح کے صدر دروازے کی کنڈی نہ کھولنے کی ایک احمقانہ حرکت کرتے رہتے ہیں تاکہ آنے والا داخل نہ ہوسکے۔ باہر ہی کھڑا رہے۔

تب مجھے احساس ہوا کہ میرا اس طرح اکیلا سڑکوں پر گھومتے پھرنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے شہر کے امن و امان میں بری طرح خلل پڑ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے تہیہ کیا کہ اب بے حد ضروری ہونے پر ہی اپنی اس طاقت کا استعمال کروں گا۔ ویسے بھی یہ طاقت کسی خاص وقت میں ہی میرے اندر آتی تھی وہ کون سا وقت ہوتا تھا یہ میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا۔

وہ وقت جلد ہی آگیا۔ ان دنوں میرا جسم بالکل ہی جواب دے گیا تھا۔ میں کبھی کسی سڑک کنارے یا گلی میں نالی کے پاس خاموش پڑا رہتا۔ میرا تلا اب مجھ سے اکھڑ کر ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہلنے لگا تھا جسے جلد ہی گر جانا تھا۔ آخری بار ارادہ کر کے میں پھر ایک رات ہمت سے کام لیتے ہوئے اسی سوکھی جھاڑی کی طرف چلا۔ ان خون بھرے نشانوں پر قدم رکھتے ہوئے جو اب مٹنے لگے تھے اور صرف ایک جوتا ہی انہیں پہچان سکتا تھا۔

میں چل رہا تھا مگر میرے ساتھ چلنے والی ہمت میرے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے آگے آگے بھاگ کر میرا منہ چڑا رہی تھی۔ میں اپنی ہمت کا تعاقب کرنے کے لیے کھسیانا ہوکر پھولتی کانپتی سانسوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اندھیرے میں بکھری ہوئی ریت، اینٹوں کے ڈھیر، مٹی کے بڑے بڑے تودوں اور گوبر میں لپٹے ہوئے بھس اور گھاس کو میں پھلانگتا رہا۔ مگر مجھے یہ محسوس نہیں ہوا جیسے میں نے کسی ٹھوس مادے یا شے کو پھلانگا ہے۔ مجھے لگا جیسے میں نے اندھیرے کو کود کر پھلانگا ہے مگر جہاں رکا ہوں وہاں بھی میرے نیچے اندھیرا ہی ہے۔

کسی نہ کسی طرح اس سوکھی جھاڑی کے پاس پہنچ کر ایک بھیانک تھکن، اکیلے پن اور

ناامیدی کے گہرے احساس میں ڈوبتا ہوا میں بے دم ہو کر گر پڑا۔

اور تب میں زندگی میں پہلی بار اس طرح رویا۔ یہ رونا کوئی عام رونا نہیں تھا۔ یہ ایک بدنصیب، دم توڑتے ہوئے بوڑھے جوتے کا رونا تھا جو خلا میں یا شونیہ میں اوپر کی طرف اٹھتا جاتا ہے جسے سن کر ویران راتوں میں یا تو کتے روتے ہیں یا ٹوٹی ہوئی منڈیروں پر آوارہ بلّیاں۔

جب صبح ہوئی تو کسی نے ایک پھٹے حال، ایک پیر کے اکیلے اور بیکار جوتے کو وہاں سے اٹھا کر کوڑے کے ایک سڑے اور بدبودار ڈھیر پر ڈال دیا جس کے نیچے گندا پانی سڑ رہا تھا جس میں کیچوے اور دوسرے زمین کے کیڑے رینگتے پھرتے تھے۔ چیلوں اور کوؤں کا جھنڈ وہاں ہر وقت موجود رہتا تھا جن میں کچھ بگلے بھی شامل ہو گئے تھے۔

ایک عرصہ گزر گیا۔ ایک دن جب میں غلاظت میں لپٹا خاموش پڑا تھا تو کوڑا چننے والے کچھ بچے اپنی زخمی انگلیوں کے ساتھ مجھے اٹھا کر اور ایک بوری میں ڈال کر وہاں سے لے گئے تھے۔

میں اس جگہ کا نام نہیں جانتا جہاں لے جا کر مجھے اس بوری سے نکالا گیا تھا۔ دراصل میں بہت پہلے ہی مر چکا تھا۔ ایک جوتے کی موت انسانوں کی موت سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ بس اتنی ہی معمولی اور غم کی سنسنی خیزی سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ جوتے کی زندگی اور اس کی موت میں کوئی فرق محسوس کر پانا ممکن نہیں تو اس کے پہلے جنم کو دوسرے جنم سے کس طرح الگ کر کے دیکھا جائے۔ مگر بہرحال میں نے دوسرا جنم لیا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ کس طرح مجھے نہ جانے کون کون سی مشینوں میں ڈال کر پگھلایا گیا۔ میرا سارا جسم کالے رنگ کے چمکدار کولتار میں بدل کر بہنے لگا۔ اور میرے اندر سے ایسی بدبو پھوٹنے لگی جو ہڈیوں اور جانوروں کی سڑتی ہوئی کھالوں، سے نکلتی ہے۔ جس طرح انسان کو مٹی سے اور اجنّہ کو آگ سے بنایا گیا ہے اسی طرح میں ان کھالوں کی مخلوق ہوں جس کے پاس آنے کے لیے انسانوں کو اپنی ناک پر رومال رکھنا پڑتا ہے۔

اس پگھلے ہوئے کولتار کو ایک شکل دی گئی۔ یہ میرا دوسرا جنم تھا۔ میری شکل وصورت یا ڈیزائن اب بالکل دوسری طرح کا تھا۔ میرے اوپر بھورے رنگ کا ایک لیپ چڑھا دیا گیا۔ میں اب بجائے کالے کے ایک بھورا جوتا بن گیا۔ میری ٹو اب پہلے سے زیادہ چوڑی اور چوکور کر دی گئی۔ میری ایڑی کو ضرورت سے زیادہ اونچا بنایا گیا یا تو جدید ترین فیشن کی ضرورت کے مطابق کیا گیا ہوگا یا شاید ان اطراف میں بے حد پستہ قد لوگوں کی بہتات ہوگی۔

مگر میری روح؟ ہر جنم میں کمبخت روح تو وہی پرانی رہتی ہے۔ جلتی بجھتی، حافظے کی وہی پرانی زنجیر۔ ورنہ کرموں کا پھل کون بھوگے گا۔

افسوس کہ ایک گڑبڑ اور تھی اور وہ یہ کہ میری ہی طرح پتہ نہیں کون سے بدنصیب ایک پیر کے کسی جوتے کو بھی پگھلا کر میرا جڑواں بنا دیا گیا۔ یہ میرے زخموں پر نمک چھڑکے جانے کے برابر تھا۔ اگرچہ وہ دیکھنے میں بالکل میری طرح لگتا ہے مگر وہ میرے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ وہ کسی دوسری روح کا ٹکڑا ہے۔ وہ میرا اصل جڑواں نہیں ہے۔ اور یہ بہت بھیانک اور ساتھ ہی اباؤ پن کی بات بھی ہے کہ کوئی آپ کا بالکل ہم شکل ہو لیکن دراصل اس سے آپ کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ آگے چل کر میری زندگی میں ایسے ایسے خوفناک وقت آئے ہیں کہ مجھے چکر آ گئے ہیں اور میں اس پیر میں اچانک ڈھیلا پڑ گیا ہوں جو مجھے پہنے ہوا تھا مگر میرے اس نقلی ہم شکل کی غبی اور ٹھس روح پر کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ میں نے اسے کبھی پریشان یا ہراساں ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں اور میں پہلے ہی کی طرح ''میں'' ہوں۔ اکیلا بالکل اکیلا۔ مگر ممکن ہے کہ اس بے چارے کو بھی میری ہی طرح اپنے نصف وجود یعنی اصل جڑواں کی تلاش ہو۔ آخر اس تلاش کے واسطے ہی تو میں نے اپنے اس بھدے اور ناخوشگوار جنم کو بھی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ دوبارہ جنم لینے کے بعد اب میں صرف نچلے طبقے کے لوگوں کے ہی پیروں کے لائق ہوں۔ میں اب کسی دوکان کے شوکیس میں سجا کر رکھے جانے کے لائق نہیں کیونکہ بنیادی طور پر اب میں ایک سیکنڈ ہینڈ جوتا ہوں جسے فٹ پاتھ پر بیٹھے موچی یا اس کے ٹھیلے سے ہی خریدا جا سکتا ہے۔

تو اس طرح میں پھر تیار ہوا۔ ایک نئے عذاب کا طوفان جھیلنے کے لیے۔ میں پھر زمین پر چلنے کے تیار ہوا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کاش اس جنم میں میری آتما بھی بدل جاتی! میں تو اس بودھ بھکشو کی طرح تھا جس کے سر کے بال منڈوا دیے گئے ہوں۔ زبردستی۔ اور ہاتھ میں پیالہ تھما دیا گیا ہو۔ مگر اس سے بھی بھیانک بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بھکشو کی آتما نہیں بدلتی۔ اپنی خواہشات اپنے گناہوں اور دکھوں کا بوجھ اپنی کمر پر لادے، وہیں اسی طرح کھڑی ہوئی پریشان حال آتما۔ بدھانے آتما کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا مگر میں جانتا ہوں کہ وہ ہے اور یہ بھی کہ وہ کبھی نہیں بدلتی۔

افسوس کہ جب میرا دوبارہ جنم ہوا تو وہی لتاڑی ہوئی اور چڑ چڑی روح پھر سے میرے نئے مگر کمزور جسم میں داخل ہوئی۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ اب میرے پاس تصویروں اور آوازوں کا ایک ۔۔ ربط سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد نہیں کہ میں کون کون سے پیروں میں پہنا جاتا رہا اور کس طرح یہ پیر بدلتے گئے، ایک کے بعد ایک کر کے۔ میرا حافظہ اس مقام پر آ کر خاموش سا ہو جاتا ہے آخر ایک جوتے کے حافظے سے انسان کے حافظے کا کیا مقابلہ۔

میں صبح صبح چہل قدمی کرنے والوں کے پیروں میں بھی پہنا گیا ہوں حالانکہ میری ہیئت اس کے لیے مناسب نہیں تھی۔ وہ سب اپنا وزن کم کرنے کے لیے یا اپنی شکر نارمل کرنے کے لیے پارکوں میں اور سڑکوں پر ٹہل رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ دوڑنے لگتے ہیں۔ میں اس دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتا۔ میں کوئی اسپورٹ شو تو تھا نہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانوں نے دنیا کو اتنا خراب کیوں کر ڈالا ہے جس میں صحت ٹھیک رکھنے کے لیے بوڑھوں کو بچوں کی طرح دوڑنا پڑتا ہے۔ یہ مضحکہ خیز ہے۔

مجھے بھی ایک بوڑھا ہی پہن کر ٹہلنے نکلا کرتا تھا۔ اس کے مالدار بیٹوں نے اسے واکنگ شو خرید کر دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ مالدار بیٹوں کا آج کل ذرا ہاتھ تنگ تھا۔ مگر میرے

خیال میں وہ اپنے باپ کو ابھی تک زندہ رہنے کی سزا دے رہے تھے۔ شاید اسی لیے ٹہلنے کے مقصد سے یکسر غیر مناسب، ایک سیکنڈ ہینڈ بے حد اونچی ایڑھی والا جوتا ہی ان کو اپنے باپ کے لیے دستیاب ہو سکا تھا۔

مجھے کہنے دیجیے کہ بوڑھوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ ننگے پیر رہا کریں۔ جوتے ان کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتے۔ بوڑھے اکثر پھسل جاتے ہیں اور زیادہ تر اپنے کولہے کی ہڈی تڑوا بیٹھتے ہیں۔ انہیں گرنا اور پھسلنا بھی ہوتا ہے کیونکہ ایک بوڑھے آدمی اور ماں کے پیٹ میں سوئے ہوئے بچے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ بوڑھے دراصل واپس لوٹ رہے ہیں اس خوبصورت اندھیرے کی طرف جو اب ان کی ماں کی کوکھ سے نکل کر اس وسیع و عریض دنیا کے کسی کونے یا پھر خلا میں اکٹھا ہو گیا ہے۔

جوتے ان بوڑھوں کے لیے خطرناک شے ہیں۔

ایک دن صبح صبح وہ پارک میں اس وقت لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جب پیچھے سے آتی ہوئی ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر کی ماڈرن عورت نے تقریباً اسے دھکا ہی دے دیا۔ وہ آگے نکل جانا چاہتی تھی۔ بوڑھا اسے شاید نظر نہیں آیا۔ ہوا کا جھونکا نظر نہیں آتا۔ اسے محسوس کیا جاتا ہے۔ میں بھی ایک پھسلتے ہوئے ہوا کے جھونکے کو بھلا کس طرح سنبھالا دے سکتا تھا۔ کولہے کی ہڈی اس طرح ٹوٹی جیسے انڈے کا چھلکا ٹوٹتا ہے۔

تقریباً دو ماہ تک بستر پر پڑے پڑے اس کے سارے جسم میں ایسے انوکھے زخم پیدا ہو گئے جن میں خون نہیں پہنچ پاتا۔ ایسے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ ان زخموں سے بڑی سڑاندھ نکلتی ہے اور ان میں کیڑے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان بھیانک زخموں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مریض کو بار بار بستر پر کروٹ دلائی جاتی رہے۔

مگر وہ ایسی کوئی کروٹ نہیں لے سکا۔ میں نے اسے صرف ایک کروٹ لیتے دیکھا تھا۔ جب ایک رات آخر اس نے اسی اندھیرے کی طرف کروٹ لے لی اور میں نے اس کے پلنگ کے نیچے لیٹے لیٹے یہ سب دیکھا۔

ایک جوتے پر جو دکھ گزرے ہیں وہ آپ کو ایسے لگ رہے ہوں گے جیسے آپ نے انہیں خوابوں میں دیکھا ہو۔ آپ کو یہ ہرگز اصل نہیں لگ رہے ہوں گے۔ مگر مجھے اس سفر کا ہر دن بری طرح اکیلا کر دیتا تھا۔

اب لاکھ کوشش کرنے پر بھی میں یہ نہیں یاد کر پا رہا ہوں کہ میں اس بڑھئی کے پیروں میں کس طرح پہنچا تھا جو صبح ہوتے ہی اپنے اوزار کاندھے پر لاد کر ایک عالیشان کوٹھی کا صدر دروازہ بنانے کے لیے نکل جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ مجھے اتار کر ایک طرف رکھ دیتا اور خود اپنے رندے سے اس مردہ درخت کے تنے کو تراشنے لگتا جس میں ایک خوبصورت، نقشین بلند دروازہ چھپا ہوا تھا۔ میں لکڑی کے اڑتے ہوئے برادے کی ایک کتھئی اور دبیز چادر کے نیچے چھپ کر اسے کام کرتے دیکھتا رہتا۔ ان دنوں دنیا میں مجھے بہت سے جوتوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

شاید پہلی بار زندگی میں میں نے بے روزگار نوجوانوں کے سڑک پر گھستے ہوئے جوتوں کو دیکھا۔ قلیوں، مزدوروں اور رکشہ چلانے والے لوگوں کے غریب جوتوں کو دیکھا۔ میں نے شوکیس میں سجے ہوئے مہنگے اور خوبصورت ترین اور بے حد مضبوط جوتوں کو دیکھا۔ اس بات پر مجھے ایک کمینی مسرت کا بھی احساس ہوا کہ ان جوتوں کو بھی کم کم ہی سہی مگر زمین پر تو بہر حال اترنا پڑے گا۔ کوئی بھی شخص یا شے اپنے اندر سے چاہے کتنی خوبصورتی باہر نکال کر لے آئے مگر وہ اس خوبصورتی سے پوری طرح اپنے آپ کو نہیں ڈھک سکتا۔

اس کا کوئی نہ کوئی حصہ تو اس خوبصورتی سے باہر ایک زائد آنت کی طرح نکلا ہی رہتا ہے۔ بڑھئی کے ٹی وی پر میں نے فیشن شو میں استعمال ہونے والے، عورتوں کے عجیب وغریب جوتے دیکھے جو ان کی کمر اور کولہوں میں ایک نقلی شہوانیت اور فحش قسم کی بلنت پیدا کر دیتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اس لائق کبھی تھا ہی نہیں کہ اس گھٹیا کام میں کسی عورت کے لیے مفید ثابت ہوتا۔

میں نے شہر میں مارچ کرتی فوجوں کے بُوٹ دیکھے۔ گشت لگاتے ہوئے پولیس والوں کے جوتے دیکھے۔ رات میں "جاگتے رہو" کی صدا لگاتے ہوئے غریب چوکیدار کے جوتے

دیکھے جو اس کی لاٹھی سے زیادہ بہادری کے ساتھ سڑک پر دھمک پیدا کرتے تھے۔ سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوئے فقیروں کے جوتے دیکھے جو ان کے بھیک کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے زیادہ قابلِ رحم نظر آتے تھے میں نے جنازے میں پیچھے پیچھے چلتے ہوئے قبرستان تک جانے والے اور وہاں سے واپس آنے والے جوتے دیکھے ہیں۔ میں خود بھی قبرستان کی خاموش مٹی اور خزاں کے گرتے ہوئے پتوں پر چلا ہوں۔ میں نے پاگلوں کو اپنے جوتے سر پر رکھے یا گلے میں ٹائی کی طرح لٹکائے ہوئے پاگل خانے کی دیوار پر سے کود کود کر بھاگتے دیکھا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر پلیٹ فارم کی بھیڑ میں ایک چھوٹتی ہوئی گاڑی سے ہارتے ہوئے جوتے دیکھے۔ جلوسوں اور قافلوں میں چلتے اور تھکتے جوتے دیکھے۔ کسی بارات میں روشنی کے ہنڈے اپنے کاندھوں پر اٹھائے پیچھے پیچھے چلتے جانے والے مزدوروں کے جوتے دیکھے۔

پیروں سے مفلوج لوگوں کو خالی خالی نظروں سے اپنے پرانے جوتوں کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا ان کے جوتوں کو ان کے فالج زدہ پیروں پر گھورتے دیکھا۔

اس خونی اور بے ایمانی دنیا میں بچوں کے کھیلنے کے حق پر اپنا قبضہ کرتے ہوئے ہٹے کٹے بالغ لوگوں کے کھیل کے میدان میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرتے ایک بے ہنگم سی اچھل کود کرتے ہوئے جوتے دیکھے۔

میں نے جنگ میں ہار کر بھاگتے ہوئے سپاہیوں کے سہمے ہوئے جوتے دیکھے۔ میں نے جنگ، فساد، زلزلے، باڑھ اور قحط کی زد میں آئے جوتوں کو دیکھا جن سے دنیا کی تمام خون ریزی کی تاریخ بیان کی جاسکتی ہے۔

مگر میں آج تک کسی ایسے شخص کے جوتے نہیں دیکھ پایا جسے کبھی پھانسی پر چڑھایا گیا ہو اس کے جوتے کیا سوچتے ہوں گے؟ وہ جلاد کے جوتوں کی طرف کیسی نظروں سے دیکھتے ہوں گے؟

میں نے بھاری بھاری کتابوں کے بستے اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے اسکول جانے والے بچوں کے چھوٹے، معصوم اور تھکے ہوئے جوتے دیکھے۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ ملال رہا کہ میں

اپنے سائز کی وجہ سے کبھی کسی بچے کے پیر میں نہ آ سکا۔ ہاں مگر ایک وقت ایسا آیا جب میری یہ تمنا پوری ہوگئی مگر کیونکہ میں ایک نیا جوتا نہیں تھا اس لیے یہ تمنا تو شاید میں اپنے دل ہی میں لیے ہوئے چلا جاؤں گا کہ کاش میں کسی بچے کے لیے عید، ہولی یا کرسمس کے موقع پر خریدا گیا ایک نیا نویلا جوتا ہوتا اور تیوہار سے ایک رات پہلے وہ بچہ مجھے اپنے تکیے کے پاس رکھتا اور رات میں بار بار جاگ کر میرے وجود کو چھونے کی کوشش کرتا۔ یا پھر میں ایک بالکل ہی ننھا منا سا جوتا ہوتا جسے وہ بچہ اپنے پاؤں میں ڈالتا جو ابھی اپنی ماں کی گود سے زمین پر نہیں اترا۔

ویسے بچوں کے لیے اب بازار میں بہت خوبصورت جوتے آ گئے ہیں۔ وہ مرغی کے چوزوں کی طرح ہیں۔ ''چوں چوں'' اور ننھے رنگین بلبوں کو اپنے تلے میں بار بار جلاتے اور بجھاتے ہوئے۔

اس بچے کے جوتے بھی ایسے ہی تھے جسے اسکول سے واپس گھر آتے وقت ایک تیز رفتار کار کچل گئی تھی۔ بچے کے سر سے نکلے خون میں اس کے پیروں کے ساتھ ساتھ اس وہ ننھے ننھے جوتے بھی رنگ گئے تھے اور نہ جانے کس زاویے سے ان پر دباؤ پڑ جانے کے باعث وہ لگاتار مرغی کے چوزوں کی طرح ''چوں چوں'' بول رہے تھے اور ان کے تلے میں لگی روشنی بار بار جل بجھ رہی تھی۔ سڑک پر خون کا ڈھیر بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

میں کسی کے پیروں میں بندھا چلا جا رہا تھا۔ افسوس کہ میں وہاں رک کر ان ننھے منے جوتوں کے لیے کوئی ماتم نہ کر سکا۔

میں تو کوڑھیوں کے سڑتے ہوئے پیروں کے لیے بھی کبھی رک کر ماتم نہ کر سکا۔ ان کے پیروں میں گندی اور غلیظ پٹیاں بندھی ہوئی دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کاش میں اتنا نرم جیسے بس ہوا کا بنا ہوا ایک نادیدہ جوتا ہوتا جو کوڑھی کے پیروں کو ڈھک لیتا تاکہ وہ لوگوں کے لیے نفرت اور کراہیت کا سبب نہ بنتے۔ مجھے پتہ نہیں کہ کوڑھیوں کے گلتے ہوئے پیروں کے لیے کوئی جوتا بازار میں آ گیا ہے یا نہیں اگرچہ نقلی پیروں میں فٹ کر دیے جانے والے جوتے تو اب عام ہیں۔

سن لیں کیونکہ میں ایک جوتا ہوں۔ انسان کے پیر میں پڑا ہوا۔ صرف زمین پر ہی گھسٹتا ہوا۔ اس لیے مجھے زمین پر زیادہ تر صرف جوتے ہی جوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ادھر سے ادھر جاتے ہوئے، ایک دوسرے کے نشانوں کو مٹاتے ہوئے، زمین پر بے شمار کیڑے مکوڑوں کی شکل میں بکھرے ہوئے بھانت بھانت کے جوتے۔

ایک شام جب بڑھئی میرے اوپر جمی ہوئی برادے کی تہہ کو جھاڑ کر مجھے پہننے کے بعد اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر روانہ ہوا تو پتہ چلا کہ شہر میں فساد پھیل گیا ہے۔ وہ حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ سب مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ سڑکوں پر اچانک بہت سے آوارہ کتے نمایاں ہوگئے۔ کتے تب ہی نمایاں ہوتے ہیں جب انسان دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ آگے جا کر اس نے محسوس کیا کہ وہ غلط علاقے میں پھنس گیا ہے۔ چاروں طرف گھیرا بندی کر دی گئی تھی۔ دور کہیں آگ کی لپیٹیں اور دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ کہیں کہیں سے شور کی آواز بھی آ رہی تھی۔

ایک اندھیری گلی سے نکل کر وہ جیسے ہی شاہراہ پر آیا کچھ لوگ اس پر چھرا لے کر پل پڑے۔ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ بھاگا۔ اس کے منہ سے ہذیانی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کی پشت پر چمکدار چھروں کے پھل لہرا رہے تھے۔ وہ شاید پھر بھی بھاگ کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا اگر ٹھیک اسی وقت اس کا پاؤں نہ مڑ جاتا۔

میں نے حتی الامکان اس کے پیر کو سیدھا رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مگر میں اس خطرناک موچ کو نہیں روک سکا جو اچانک اس کے ٹخنے میں آ گئی تھی۔

اب وہ نہیں دوڑ سکا۔ وہ اس جگہ ایک پیر پر کھڑا ہو کر، اپنے دونوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر چُھروں سے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ موچ والا پیر زمین پر رکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ زمین کی کشش ثقل درد اور دکھ سے ہار گئی تھی۔ وہ زندہ چیزوں کو اپنی طرف نہیں بلاتی تھی۔ وہ صرف مردوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

اس طرح ایک پیر پر کھڑا ہو کر، اچھل اچھل کر، ہاتھ جوڑتے ہوئے، وہ سرکس کے کسی

جوکر کی طرح نظر آیا۔ مگر ٹھیک اسی وقت ایک مذہبی خوفناک نعرے کے ساتھ نہ جانے کتنے چھروں نے اسے کاٹ کر رکھ دیا۔ ہوا میں پھر وہی میری جانی پہچانی خون کی بو شامل ہوگئی

آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کے غبار بڑھتے چلے گئے۔ سارا شہر اس میں ڈوب کر رہ گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ مجھے اس کے بعد کون سے پیروں میں پہنا گیا مگر مجھے یہ یاد ہے کہ یہ فساد بہت دنوں تک جاری رہا۔ لوگ جلائے جاتے رہے۔ قتل کیے جاتے رہے۔ کوئی اس قتل عام اور تباہی کو روک نہ سکا۔ شاید شہر کا نظم و نسق "جیرالڈ شاستری"[1] کے گوریلے چلا رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لاشیں ٹھکانے لگانا مشکل ہوگیا۔ شہر سے دور بھورے رنگ کی چٹانوں کے بیچ ایک کھڈ میں لاشوں کو ایک کے اوپر ایک کرکے ڈالا جانے لگا۔ چلچلاتی دھوپ میں لاشیں سڑنے لگیں، آسمان سے اتر کر چیلیں ان چٹانوں پر اکٹھا ہونے لگیں پورے شہر میں بدبودار ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں۔

ہزاروں سال پہلے کسی زمانے میں کئی نسلوں پہلے انسان نے اپنی ہی ذات "انسان" کو زمین کے نیچے کھنڈر کر دفن کردیا تھا اور آج پھر ایک بار انسان نے وہی کیا تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ آج یہ کام انسان نے اپنے جوتے کی نوک پر انجام دیا تھا۔

میں نے دیکھا وہ قطاریں بنا بنا کر لاشیں ڈھو رہے تھے۔ آسمان میں چاند ڈوب رہا تھا۔ اس کی مردہ روشنی میں مجھے اس امر کا عرفان ہوا کہ آدمی اب ایک نسل نہیں رہا۔ وہ دو الگ الگ قسم کے وحشی درندوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ جو مجھے اپنے پیروں میں پہنے ہوئے، ان چٹانوں پر کھڑا ہوا لاشیں ڈھرنے کے احکام دے رہا تھا، پتہ نہیں کون سا درندہ تھا۔

میرے تلے کے نیچے برابر "کر کر" کی آواز آرہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں سڑتی ہوئی اور منھ ٹیڑھا ہوئی لاشوں میں پیدا ہوجانے والے کیڑے بلبلا رہے تھے مجھے بہر حال اطمینان تھا کہ وہ انسانوں کے مقابلے میں بے ضرر تھے۔

مگر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے ایک چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ اس مقام سے تھوڑا آگے ایک گڈھا کھود کر اس میں لاشوں کے پیروں سے اتارے گئے جوتے اکٹھا کرکے

۱۔۔۔۔ جیرالڈ شاستری، ابن صفی کے ایک فاشسٹ کردار اور خطرناک مجرم کا نام ہے۔

ان میں آگ لگا دی گئی تھی۔ شاید یہ فساد میں لاشوں کی شناخت مٹانے کا کوئی انوکھا طریقہ تھا۔ انہیں خوف تھا کہ جس طرح کسی سانپ کی آنکھوں میں اسے ہلاک کرنے والے کی تصویر بن جاتی ہے، اسی طرح ایک جوتے میں انسان کے مردہ پاؤں کی تصویر ہر وقت موجود رہتی ہے۔

چاروں طرف چرانده پھیل گئی۔

جوتوں کے اس جلتے ہوئے ڈھیر سے بہت روشنی نکلی اور تب میں نے اداس ہوکر سوچا کہ فساد اور لڑائیاں شہر کو صرف تباہ ہی نہیں کرتے وہ اسے روشن بھی کردیتے ہیں۔ اس روشنی میں زمین پر بے شمار تعداد میں بکھرے ہوئے آپس میں ایک دوسرے کو روندتے، کچلتے اور کاٹتے ہوئے انسانی قدموں کے بے تکے سائے گزرتے نظر آئے۔

مجھے ہوش نہیں کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہا۔ ان دنوں شدت سے میری خواہش تھی کہ کاش میں تھوڑے دنوں کے لیے پاگل ہوجاتا۔ مگر مجھے اپنا مقصد یاد آتا۔ اپنی وہ تلاش یاد آتی۔ آخر میں یہ سب اپنے نصف وجود کو تلاش کرنے کے لیے ہی تو استقلال کے ساتھ برداشت کررہا تھا اور یقیناً میری کھوج جاری تھی میرا سفر جاری تھا۔ یہاں میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ جوتے کبھی کبھی پاؤں کے مخالف بھی چلا کرتے ہیں؟

ان ہی دنوں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے خلاف کئی بار مجھے "شانتی مارچ" میں بھی چلنے کا اتفاق ہوا۔ سخت تیز دھوپ میں تپتی ہوئی سڑک پر سارے جوتے مل کر خود بھی ایک دہشت ہی پیدا کررہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس شانتی مارچ اور ایک فوجی مارچ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جس کی دھمک سے اکثر ندیوں پر بنے ہوئے کمزور پل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔

امن کے لیے کی گئی اس مارچ میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی شامل تھے۔ ان کے معصوم پیر فیتوں سے کس کر باندھے گئے جوتوں کے اندر تھک کر سوج گئے تھے۔ بچوں کو کسی شانتی مارچ میں چلنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ایک بے تکا ظلم تھا۔

ایسے ہی ایک شانتی مارچ میں چلتے چلتے میں نے صاف طور پر دیکھا کہ وہ جو اس مارچ

میں شامل ہیں اُن سب جوتوں کو میں نے خشک بھوری چٹانوں کے درمیان سڑتی ہوئی لاشوں کے اوپر سے گزرتے بھی دیکھا تھا۔

اور تب میں دراصل اس شانتی مارچ کی مخالف سمت میں چلنے لگا۔ اس منافق پاؤں کے خلاف جو شانتی مارچ میں جوش وخروش کے ساتھ آگے بڑھتا ہی جارہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ انسان کے حافظے کے بارے میں جو من ترانیاں کی جاتی ہیں وہ سرے سے غلط ہیں۔ انسان سب کچھ بے شرمی کے ساتھ بھول جاتا ہے یا پھر ممکن ہے کہ زندگی گزارنا بجائے خود ایک بے غیرتی کا عمل ہو۔ آہستہ آہستہ لوگ وہ سب بھولتے گئے جس کا میں چشم دید گواہ ہوں مگر ایک جوتے کی گواہی انسانوں کے لیے کیا کوئی معنی رکھتی ہے؟

مگر میں شاید خود بھی کوئی کم بے غیرت نہیں تھا۔ اتنا سب کچھ دیکھ کر اور جھیل کر بھی میں چیتھڑے چیتھڑے نہ ہوا اور کسی نہ کسی طرح اس قصائی کے پاس پہنچ گیا جس کی آنکھیں ہمیشہ لال رہتی تھیں۔

اپنا بغدہ اٹھا کر جب وہ مجھے اپنے پیروں میں ڈالتا اور مذبح کی طرف چلتا تو اس کی چال میں ایسا غرور آجاتا جیسے وہ سرحد پر جنگ لڑنے جارہا ہو۔ سڑک پر چلتے وقت اسے راستے کی ہر شے کو اپنے قدموں تلے کچلتے جانے کی عادت تھی۔ گھر پر رہ کر وہ زیادہ تر فرش پر کاکروچوں کو مسلتا رہتا یا پھر دیوار پر چپکی ہوئی چھپکلیوں کو جوتے سے مار مار کر گرایا کرتا۔ ایک رات جب ایک چوہیا اس کے پلنگ کے نیچے بڑی دیر سے کھڑپڑ کر رہی تھی تو وہ کسی بلی کی طرح تاک لگا کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی اسے مناسب موقع ہاتھ آیا، اس نے پھرتی کے ساتھ مجھے اٹھا کر پوری طاقت کے ساتھ چوہیا کو میرے نیچے دبا دیا۔ بھورے رنگ کی اس چوہیا کے منہ میں روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دبا ہوا تھا یقین کریں کہ میں نے اوپر کو اٹھنا چاہا تھا مگر اس کے ہاتھ کی زبردست طاقت کے سبب میں وہیں دب کر رہ گیا۔ چوہیا کی کھال اور میرے تلے کے درمیان کی دوری کم ہوتی گئی۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے روٹی کا ٹکڑا نکل کر میرے نیچے چپک گیا اور

خون کی ایک لکیر باہر آگئی۔ اس کے دانت بھنچ گئے اور وہ ایک ہلکی سی آواز نکال کر ختم ہوگئی۔

یہی نہیں ایک بار سڑک پر چلتے وقت وہ ایک کتے کی لاش کے اوپر سے بھی گزرا۔ کتے کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور اس کی انتڑیاں سڑک پر پھیلی ہوئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بچ کر نکل سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ کتے کی انتڑیوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔

مگر میں ٹھنڈے دل سے یہ بھی سوچتا ہوں کہ شاید یہ اس کی بے رحمی نہ ہو کر صرف اس کی عادت تھی۔ عادت میں کسی بھی جذبے کی آمیزش نہیں ہوتی۔ عادت محض ایک خبط ہے۔ افسوس کہ اس دنیا کو اچھی یا بری بنانے میں انسانوں نے اسی خبط سے کام لیا ہے۔

اب ذرا رکیے اور سوچیے کہ میرے تلے اور خون کے درمیان یہ کیسا پراسرار رشتہ بن گیا ہے؟

اب تو آپ شکایت نہیں کریں گے کہ میرے سر پر آخر خون کیوں سوار ہے؟

یقین کیجیے میری کہانی حرف بہ حرف سچی ہے اور جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے اسی کو سو فی صد ایمانداری کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔

ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے۔ اس سے زیادہ خون تو آگے آنے والا ہے۔

مذبح شہر سے کافی دور تھا مگر اس کی بساندھ اس کے آنے سے بہت پہلے ہی شروع ہوجاتی تھی۔ صبح صبح پو پھٹنے سے کچھ پہلے ہی وہ وہاں پہنچ جاتا۔ اگر آسمان پر چاند ہوتا تو ابھی پوری طرح ڈوبا نہ ہوتا۔ مذبح کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ جس کا پانی بالکل سیاہ تھا۔ تالاب کے کنارے بیری کا ایک درخت تھا جس کی ٹہنیاں پانی کے ایک حصے پر جھک آئی تھیں اور اسے اور بھی زیادہ سیاہ بنا رہی تھیں۔ اس کالے پانی میں تو چاند کا عکس بھی پڑتا نظر نہیں آتا تھا۔ آس پاس دھان کی بھوسی بکھری ہوئی تھی اور ادھر ادھر کچھ سینکوں والی چٹائیاں بھی پڑی تھیں۔

وہ اس بیری کے درخت کے نیچے جا کر رکتا یہاں کی ساری زمین دلدلی تھی۔ اس دلدل میں میرا تلا تقریباً پوری طرح دھنس جاتا۔

اور تب ایک دن میں نے غور سے دیکھا۔ یہ دلدل خون سے لت پت تھی۔ وہ تالاب نہیں تھا۔ وہ جانوروں کے خون کو روکنے یا اکٹھا کرنے کے لیے کھودا گیا ایک گہرا گڑھا تھا۔

تو یہ تھا مذبح کا تالاب جس میں روشنی کی کرن نہیں پہنچتی۔ اس میں تو چاند کا عکس تک نہیں پڑتا۔ ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کی چیخیں اس تالاب کی سطح پر کوئی ہلچل پیدا نہیں کرتیں بس بیری کی ٹہنیاں جھک کر اسے اور بھی سیاہ کر دیتیں۔

میرے چاروں طرف ایک بھیانک اندھیرا چھا گیا۔ ماں کی کوکھ سے بھی پہلے کا اندھیرا۔

میری کیفیت ایسی ہوگئی جو انسانوں کی تیز بخار کے وقت ہوتی ہوگی۔ تب پھر بہت دیر بعد شاید زمانے بعد سورج طلوع ہوا جس کی روشنی کے ساتھ ساتھ چیلیں اور کوے درختوں سے اتر کر وہاں منڈلانے لگے۔

تالاب کے کنارے جانوروں کی اتاری گئی کھالوں کے ڈھیر رکھے تھے۔ میرے حافظے نے بہت بے چین ہو کر کروٹ لی۔

کیا میں یہاں پہلے بھی آیا تھا؟ اس مقام سے میرا کوئی بہت پرانا تعلق تھا۔ اتنا ہی پرانا جتنی کہ یہ زمین ہے۔ ٹھیک اسی وقت مجھے اس امر کا بھی بخوبی احساس ہوا کہ جاندار اور بے جان اشیاء کے درمیان کوئی رشتہ قائم کرنے کے لیے چلو بھر خون کی موجودگی اشد ضروری تھی۔ اس سیاہ اور خونی تالاب کے اندر کوئی گہری اور نہ دکھائی دینے والی سرنگ تھی جس میں ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کے ڈکرانے کی آواز پہنچ کر ایک گونجتی ہوئی موسیقی میں بدل جاتی ہے۔ اس موسیقی کے سُر تال اس تعلق کے جشن کا اعلان نامہ ہیں جو زندہ اور بے جان اشیاء کے درمیان انسان نے اپنی بے رحم، خطرناک اور خود غرض تخلیقی قوت کے ذریعے پیدا کیا اور اپنی دوکان کے شوکیس کو نئے، خوبصورت اور بھانت بھانت کے جوتوں سے بھر کر رکھ دیا۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میری رنگت اب بھوری نہیں رہی۔ وہ سیاہی مائل سرخ ہوگئی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اب میں بساندہ بھرے خون میں پوری طرح ڈوب چکا ہوں۔

اب ذرا مجھے دم لینے دیجیے۔ دراصل اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں ان آخری بدنصیب پیروں کا بھی قصہ سنا ڈالوں جن کے بعد مجھے کسی نہیں پہنا۔ شاید یہی وہ پیر تھے جن میں آ کر میں خوش رہا۔ انسان ایک جنم میں ایک ہی زندگی جی سکتا ہے مگر جوتا ایک کے بعد ایک کئی پیروں کو جی سکنے پر قادر ہے۔

دراصل وہ قصائی صوم صلوٰۃ کا بھی بہت پابند تھا۔ جمعے کی نماز تو اس سے کبھی قضا ہی نہیں ہوئی۔ گوشت تو وہ اس لیے کاٹتا تھا کہ لوگ گوشت کھاتے تھے اور چمڑے کا استعمال کرتے تھے۔ گوشت کاٹنا تو اس کا پیشہ تھا اور ہر اس پیشے کی طرح جو حلال اور محنت کی کمائی پر مبنی ہو، اس کے پیشے کا بھی احترام کرنا چاہیے۔

کسی سرپھرے شاعر نے اپنے کمزور لہجے میں کہا تھا:

''ہم بہشت میں کیچڑ میں سنے جوتوں کے ساتھ ہی قدم رکھ سکتے ہیں۔''

مگر عبادت گاہیں بہشت نہیں ہوا کرتیں۔ کیا کبھی کسی نے غور کیا ہے کہ عبادت گاہوں کے باہر اتنی بڑی تعداد میں اتار کر رکھے گئے جوتے دیکھنے میں کیسا اداس منظر پیش کرتے ہیں (ویسے تو اتار کر رکھا گیا ہر جوتا اداس ہی نظر آتا ہے۔)

اکثر جوتوں کو عبادت گاہوں کے باہر سے ہی چرایا جاتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اپنے بھونڈے شاعرانہ مذاق کا اظہار کر کے میں نے آپ کی سمع خراشی کی ہے مگر یقین ہے کہ آپ اس بے حیا جوتے کو اس طرح معاف کر دیں گے جیسا کہ اب تک کرتے آئے ہیں۔

اس جمعے کو جب قصائی محلے کی مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا تو مسجد کی دیوار کی اوٹ سے میلا سا لباس پہنے ایک شخص برآمد ہوا۔ مسجد کی سیڑھیوں پر وہ بلی کی طرح چپکے چپکے چلا جہاں نمازیوں کے جوتے ایک کے اوپر ایک بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔

بس اس کے ہاتھ میں میں ہی آ سکا۔ اس نے مجھے چرا لیا اور اپنے پاجامے کے نیفے میں چھپا کر مجھے اپنے گھر لے آیا۔

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک پیشہ ور چور تھا۔ دن میں تو وہ سڑک کے کنارے بیٹھ

کرتالوں کی مرمت کرتا اور ان کی کھوئی ہوئی چابیاں بنایا کرتا مگر آدھی رات میں نکل کر وہ لوگوں کے گھروں میں چوریاں کرتا۔

مجھے اکثر اس بات کا بھی شائبہ گزرا کہ جب وہ مجھے پہن کر رات کے اندھیرے میں نکلتا تو کچھ اداس سا ہوجاتا۔

چوری کوئی ایسا پیشہ نہیں ہے جس کے لیے آپ باقاعدہ صبح کا ناشتہ کرکے اپنا بریف کیس ہاتھ میں لیے ہوئے جوش وخروش کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں۔ شاید ایک قسم کا احساس جرم اس کے چوری کے لیے جانے والے قدموں کے ساتھ ساتھ لپٹا ہوا چلتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے کپڑوں میں کسی بھی قسم کا ہتھیار، یہاں تک ایک حقیر سا چاقو بھی پوشیدہ نہیں ہوتا تھا ہاں وہ اپنے ہاتھ پیروں پر کسی بدبودار تیل کی مالش ضرور کیا کرتا تھا جس سے کہ پکڑے جانے پر وہ کسی چکنی اور لیس دار مچھلی کی طرح گرفت سے نکل جائے۔

وہ گھر سے اس وقت نکل کر چلنے کو تیار ہوتا جب اس کے دونوں بچے پوری طرح سو جاتے۔ اور سڑک پر چوکیدار کی لاٹھی کی آواز سنائی دینے لگتی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی بیوی مجھے ہاتھ میں لے کر اس کی نظر اتارتی۔ جی ہاں۔ یہ تو سب کو معلوم ہوگا کہ ایک جوتے سے کسی شخص کے اوپر لگی بری نظر اتاری جاسکتی ہے۔ جوتوں سے بری اور بدنیت نظریں خوف کھاتی ہیں۔ اسی لیے لوگ اکثر اپنے نئے یا زیر تعمیر مکانوں کے اوپر بھی ایک جوتا ٹانگ کر لٹکا دیتے ہیں۔

دراصل چور بے حد پھرتیلا واقع ہوا تھا۔ گھروں کی دیواروں، منڈیروں اور بجلی کے کھمبوں پر وہ کسی بندر سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چڑھ اور اتر سکتا تھا۔ جوتوں سمیت دیوار پر کسی چھپکلی کی طرح چڑھتے چلے جانے کی اس کی مہارت تو قابلِ دید تھی۔ چور کی بیوی شاید اسی لیے اس کی نظر اتارتی ہوگی کہ اس کی اس بے پناہ مہارت اور صلاحیت کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ چور نے آج تک کسی کو جان سے مارنا تو دور کسی

پر ہاتھ تک نہ اٹھایا تھا۔ یوں بھی وہ گھر کی بہت معمولی معمولی اشیاء کی ہی چوری کرتا رہتا تھا۔ مثال کے طور پر لوٹا، صابن دانی، چھتری، مرغیاں، الگنی پر لٹکتے کپڑے، انگیٹھی، گلاس، لکڑیاں، جھاڑو اور جوتے وغیرہ۔ کم از کم میں جب تک اس کے پیروں میں رہا، میں نے اسے انہیں چیزوں کو چراتے ہوئے دیکھا ہے۔

مجھے اس کے پیروں میں رہ کر بس ایک ہی تکلیف ہوتی تھی۔ رات میں جب وہ گھر سے باہر چوری کرنے کے ارادے سے نکلتا تو گلیوں میں اس طرح چلتا کہ میرے اندر سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے۔ یہ ایک جوتے کے لیے بہت اذیت ناک ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس طرح میری سانسیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتی ہیں یا پھر زمین سے بری طرح رگڑ کھا کھا کر زخمی ہوتی رہتی ہیں۔

مگر جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں اس چور کے گھر خوش رہا۔ میرا خیال ہے اپنی تمام زندگی میں مسرت کے جو ایک دو لمحات مجھے نصیب ہوئے ہیں وہ اس چور کے گھر میں ہی گزرے ہیں۔

اس کی ایک وجہ تو چور کے دو معصوم بچے تھے جو روز اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں مجھے پہن کر آنگن میں کھیلا کرتے تھے۔ میں کیونکہ ان کے پیروں سے بہت بڑا تھا اس لیے انہیں اس کھیل میں بہت مزہ آتا تھا۔ چور کا ایک بچہ سرکاری اسکول میں پڑھنے بھی جاتا تھا۔ مگر دوسرا جو اس سے عمر میں ایک سال بڑا تھا، گھر پر ہی رہتا تھا۔ دراصل وہ بے حد ہکلاتا تھا۔ کسی بات کا جواب دیتے وقت اس کا سر گھومنے لگتا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا اور آنکھوں میں ایک ناقابلِ فہم سی اذیت کے آثار نمایاں ہوجاتے۔ ایسے وقت اس معصوم بچے کی لکنت اسی کے منہ اور حلق سے نکل کر اس کے نیکر اور اس کی پنڈلیوں پر سے رینگتی ہوئی میرے اوپر آکر اکٹھا ہونے لگتی اور میں اس افسردہ لکنت کے بوجھ سے دب کر اور بھی کمزور سا جوتا نظر آنے لگتا۔

لوگوں کو خیال تھا کہ کیونکہ چور ایک اچھا آدمی نہیں تھا اس لیے خدا نے اسے اس معذور بچے کی شکل میں اس کے اعمال کی سزا دی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے بلکہ یہ تو میرے دل پر نقش ہے کہ وہ رمضان کا ہی مہینہ تھا جب ایک دوپہر، اچانک چور کے اس ہکلے بچے نے اپنی ماں سے ''پلاؤ'' کھانے کی فرمائش کی۔

ان دنوں ان کے گھر کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ کوئی عمدہ قسم کا پکوان تیار کر سکتے۔

شام کو جب چور گھر آیا تو بیوی نے کہا۔

''بڑا پلاؤ پکانے کو کہہ رہا ہے۔''

''پلاؤ؟'' چور افسردہ ہوگیا۔

''ہاں۔ اصل میں کل سامنے والوں کے یہاں پلاؤ کی دیگ پکی تھی۔ انھوں نے سب کا روزہ افطار کرایا تھا مگر نہ ہمیں بلایا اور نہ ہی ہمارے گھر کچھ بھیجا۔'' بیوی نے شکایت کی۔

''بچا نہ ہوگا۔'' چور نے کہا۔

''بس بڑے نے دیگ کی خوشبو سونگھ لی ہے۔ وہ تو یہاں تک آ رہی تھی۔ کم بخت نے اس وقت سے پلاؤ، پلاؤ کی رٹ باندھ لی ہے۔ آج کل گھر میں فاقوں کی نوبت ہے۔ میں بغیر سحری کے روزے رکھ رہی ہوں۔ شام کو سوکھی روٹی سے افطار لیتی ہوں۔ جو بھی ہوتا ہے وہ تمھارے اور بچوں کے لیے ہی بچا کر رکھ دیتی ہوں اور وہ کہہ رہا ہے کہ پلاؤ پکاؤ۔'' بیوی بڑبڑانے لگی۔

''تم روزے مت رکھو۔'' چور نے لگاوٹ اور سادگی کے ساتھ کہا۔

''بس خاموش رہنا۔ کافر کہیں کے۔ نہ روزے کے نہ نماز کے۔ مجھے بھی بہکا رہے ہو۔ شیطان تمہاری زبان میں گھس گیا؟'' بیوی کو بہت غصہ آ گیا جسے اتارنے کے لیے وہ اس ہکلے بچے پر جوتا لے کر پل پڑی۔ پھر اچانک کوئی خیال آتے ہی رونے بیٹھ گئی۔

چور نے شرمندہ ہو کر اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے شرمندہ سر کی پرچھائیں میرے اوپر ایک مہیب سیاہ بادل کی طرح جھک آئی۔

چور اس رات چوری کرنے کے لیے نہیں نکلا۔ شاید وہ رمضان میں کوئی گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پلنگ کے نیچے لیٹا تمام رات اسے کروٹیں ہی بدلتا دیکھتا رہا۔ صبح جب سحری کا اعلان ہوگیا اور مسجد سے لاؤڈ اسپیکر پر سحری کے اوقات بتائے جانے لگے تو وہ خاموشی کے ساتھ اٹھا اور بیوی کو بتائے بغیر گھر سے باہر نکل آیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ اس لیے گلیاں سنسان تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جاگ کر سحری کھا رہے ہوں گے۔ وہ خاموشی کے ساتھ مسجد کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔

مسجد میں رونق نہ تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ جہاں مسجد کے مینار سے ملحق سیڑھیاں تھیں جو امام صاحب کے حجرے پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ چور کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت حجرے میں سحری کے واسطے انواع واقسام کی خوردنی اشیاء موجود تھیں۔

وہ دبے پاؤں ان سیڑھیوں پر چلنے لگا۔ مینار کے اوپر لگے لاؤڈ اسپیکر سے ایک بار پھر سحری کے ختم ہونے کا اعلان کیا گیا اور پھر ایک خوش لحن بچہ نعت پڑھنے لگا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ امام صاحب اندر نہ تھے۔ چور کو محسوس ہوا جیسے اس کے بچے کی ہکلاہٹ دور ہوگئی ہے۔ نعت پڑھتا ہوا وہ خوش لحن بچہ اس کا ہی بچہ ہے جس کا دل پلاؤ کھانے کو چاہ رہا ہے۔

وہ پھرتی کے ساتھ حجرے میں داخل ہوگیا۔

واقعی چاروں طرف کھانے پینے کی بہت سی اشیاء سلیقے کے ساتھ رکابیوں اور سینیوں میں ڈھکی رکھی تھیں۔ وہ ان میں پلاؤ تلاش کرنے لگا۔ تقریباً دیوانوں اور جنونیوں کی طرح۔ اور اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ایک چھوٹی سی المونیم کی رکابی میں رات کا باسی اور ٹھنڈا پلاؤ رکھا ہوا تھا اس نے رکابی کو کس کر پکڑ لیا۔

ٹھیک اسی وقت حجرے میں امام صاحب کئی لوگوں کے ساتھ داخل ہوئے اور انھوں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

''اس چوٹے کو پکڑ کر یہیں باندھ دو اور جوتے مار مار کر اس کی کھال گرا دو۔'' امام صاحب نے گرج کر حکم دیا۔

چور نے ایک ہاتھ میں پلاؤ کی رکابی کو کس کر پکڑ لیا اور پھر کسی چھلاوے کی طرح حجرے کی عقبی دیوار میں لگی کھڑکی کی طرف چھلانگ لگادی۔

کھڑکی کے باہر دیوار سے ملے ہوئے بجلی کے بے شمار ننگے تار جھول رہے تھے۔ چور کے حلق سے دل ہلا دینے والی چیخیں نکلیں۔ اس کے پیر ان تاروں میں الجھ کر رہ گئے۔ میں اس کے پیروں کے نیچے ناچتی ہوئے چنگاریوں میں ڈوب گیا۔ میں ایک بار پھر مکمل طور پر سیاہ ہو چکا تھا۔

وہ کسی بے جان چھپکلی کی طرح دیوار سے نیچے زمین پر گر پڑا۔ اس کے سر پر پلاؤ کے سفید سفید موتیوں جیسے چاول اور بوٹیاں بکھر کر رہ گئیں۔ مسجد میں فجر کی اذان ہوئی۔

مگر پتہ نہیں وہ کیسا سخت جان یا بے غیرت واقع ہوا تھا کہ زندہ بچ گیا۔

اسپتال لے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی دونوں ٹانگیں پوری طرح جھلس کر مفلوج ہو چکی ہیں اور اس کی زندگی بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ یہ ٹانگیں کاٹ کر اس کے جسم سے الگ کردی جائیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ رمضان کے مہینے میں مسجد میں چوری کرنے کی یہ وہ سزا تھی جو اسے قدرت نے دی ہے تاکہ دوسرے چوروں کو بھی اس سے عبرت حاصل ہو اور وہ کم از کم عبادت گاہوں میں چوریاں کرنے سے توبہ کرلیں۔

مگر میں قدرت کی دی ہوئی اس سزا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ سرکاری اسپتال کی بوسیدہ سیڑھیوں پر اس کے جوتے اور اس کے دونوں کٹے ہوئے پیروں میں سے خون نکل نکل کر گٹھری کے باہر چو رہا تھا۔

چور کے کٹے ہوئے پیروں اور ان کے سامنے رکھے اس کے جوتوں کے درمیان اب ایک لامتناہی پر اسرار فاصلہ تھا جہاں سے وہ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔

اس کے بعد جب میری گٹھری کھلی تو میں نے خود کو ایک بار پھر اس گھورے پر پڑا پایا ہے۔ میرا نقلی جڑواں بھی ادھر ہی کہیں غلاظت میں دبا پڑا ہوگا۔ اور کیا عجب ہے کہ اسپتال

والے ان کٹے ہوئے پیروں کو بھی یہیں سڑنے گلنے کے لیے ڈال گئے ہوں۔ چیل کوے تو یہاں بھی آتے ہیں اور گھورے کے اندر بڑے بڑے بجو اور خوفناک چوہے بھی اپنی خوراک تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

رات تقریباً گزر ہی گئی ہے۔ میری کہانی بھی تقریباً ختم ہو رہی ہے۔ بس دو ایک باتیں اور ہیں جن کا تعلق کہانی سے ہی ہے۔

انسان کے دل میں دکھ کے جتنے کانٹے ہیں، میرے خیال میں اس کے پیروں میں اس سے بھی زیادہ کانٹے ہوتے اگر جوتا نہ ہوتا۔ انسان کی معراج زمین پر چلنا ہی تھا۔ ہوا میں اڑنا تو بہت معمولی اور بزدلانہ بات ہے۔ اڑنے والی اشیاء بہت ہلکی ہوتی ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان کبھی اس نکتے کو سمجھ نہ سکا۔ وہ پیدائشی طور پر خود غرض اور بزدل ہے اسی لیے اڑنا چاہتا ہے۔ یاد رکھیے کہ انسان خدا تک صرف اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب اس کے پاؤں زمین کی دلدل میں پوری طرح دھنسے ہوئے ہوں۔ اس انداز میں کھڑے ہو کر ہی اسے اپنے قد کو اونچا کرنا ہے۔

اسے اپنی چال کا بھی بہت احترام کرنا چاہیے۔ انسان کی چال خدا کی طرف سے دیا گیا اسے سب سے بڑا عطیہ ہے۔ جو ایک حیوان سے مختلف ہے اور اس درخت سے بھی جو صرف زمین کے اوپر اور نیچے ہی چلتا ہے۔

جوتا زمین پر انسان کی اس پر اسرار اور بامعنی چہل قدمی کا صرف سچا گواہ ہی نہیں، وہ تو اس کے قدموں کے دکھوں میں بھی ساجھا کرلیتا ہے۔ زمین کے اذیت ناک واروں کو اپنے اوپر سہتا ہوا، لگا تار خون میں نہایا ہوا، انسانی قدموں کا یہ تنہا نوحہ گر، ایک جوتا۔

کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ گھورے پر لیٹے رہنا ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ آخر ہر جوتے کو ایک نہ ایک دن اسی جگہ آنا ہے۔ اگرچہ یہ گھورے کا ڈھیر بھی دنیا کا ہی حصہ ہے مگر میں اس دنیا کو ناقابلِ معافی سمجھتا ہوں جو بے حد خوبصورت ہے اور جس میں تمام عمر میں اپنی قید اپنے ساتھ لیے لیے ہی گھومتا پھرا ہوں۔ میں رگڑ کھاتے کھاتے تنگ آ گیا۔ میرے

اندر ناسور بن گئے۔ جتنی کیلیں میرے اندر ٹھونکی گئی ہیں اور جتنے پتھروں، کنکریوں کی چبھن کو میں سالہا سال سے سہہ رہا ہوں، اتنی دنیا کی کسی صلیب اور کسی تابوت کو بھی نہیں سہنا پڑی ہوں گی۔ میرے زخموں سے خون رستا ہے۔ یہ خون انسانوں کو ہی نہیں، مجھے بھی نہیں دکھائی دیتا کیونکہ میں اپنے ہی خون پر چلتا رہتا ہوں، اسے چھپاتا رہتا ہوں۔ کچھ اس طرح جیسے کوئی اپنی آنکھ کا آنسو اپنی ہی قمیص کی آستین سے پونچھ ڈالے۔

ایسی دنیا سے گھبرا کر میں نے کئی بار سوچا کہ بس اب مجھے بھی ایک پکی موت آجانا چاہیے انسانی روح نے بار بار جنم لے کر بھی کرب کا ایسا لامتناہی سفر طے نہیں کیا ہوگا جو ایک تنہا جوتے نے کیا ہے کیونکہ جوتا انسان نہیں ''شے'' ہے اور ''شے'' کا حافظہ اس کا ساتھ چھوڑ کر کہیں اور کبھی نہیں جاتا۔

مگر موت کی اس خواہش کے باوجود میں زبردستی زندہ رہنے پر صرف اس لیے مجبور ہوں کہ مجھے اپنے اس نصف وجود کو کھوج نکالنا ہے۔ میں اس سے پہلے نہیں مرسکتا چاہے سڑکیں گرم کولتار کی ٹھیں مارتے ہوئے دریاؤں ہی میں کیوں نہ بدل جائیں۔

اس کی تلاش میں بیتے، اس مہیب اور کربناک سفر میں بس دوبارہ مجھ پر اس کے موجود ہونے کا شائبہ گزرا۔

ایک تو ان دنوں جب فساد کے بعد شہر میں خطرناک باڑھ آئی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ میں نے اسے باڑھ کے پانی میں بہتے ہوئے دیکھا۔ باڑھ کا پانی جیسے جیسے بڑھتا ہے وہ گندا ہوتا جاتا ہے۔ میں کسی کے پیروں میں بندھا ہوا ندی کے ایک اونچے سے کراڑے پر کھڑا ہوا تھا۔

بس ایک لمحے کے لیے میں نے اس کی جھلک دیکھی پھر وہ بہت تیزی کے ساتھ بہتا ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں جاکر غائب ہوگیا جو ندی پر جھک آیا تھا۔

پاگلوں کی طرح میں نے اس کے پیچھے دوڑنا چاہا مگر اس دن مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں نے کسی پیر کو نہیں بلکہ ایک پیر نے ہی مجھے کس کر جکڑ رکھا تھا۔ لیکن اب میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ شاید باڑھ کے اس پانی میں مجھے کسی اور چیز پر اس کا دھوکہ ہی ہوا۔ وہ شاید صرف میرا وہم تھا۔

دوسرے یہ کہ کبھی کبھی میں نے ایسی آوازیں بھی سنی ہیں جیسے کہ وہ سڑک پر چل رہا ہو، مگر نظر کچھ نہیں آیا۔ بس ایسے وقت میں ایک تیز، پراسرار اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ضرور مجھے چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ کیا کسی جوتے کی سڑک پر چلنے کی آواز ہوا کے جھونکے سے بھی مشابہ ہوسکتی ہے؟

ایک بھیانک مایوسی سے دوچار ہوتے ہوئے میں اس ماضی کو یاد کرتا ہوں جب دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ دو پیروں میں الگ الگ، زمین پر چلتے ہوئے، دو جڑواں بھائیوں کی طرح مگر افسوس کہ دونوں کے دُکھوں کی داستان بالکل الگ الگ ہے۔ اس پر جو گزری ہوگی، وہ مجھ پر نہیں گزری۔ اتنے دنوں سے دونوں ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر اپنی اپنی زندگی ڈھوتے رہے۔

اس کا تلا اس بدنصیب لڑکے کے خون سے تر ہے اور میں اسے کھوجنے کے لیے خون سے بھری کتنی زمینوں پر چلا ہوں۔ مجھے یاد بھی نہیں۔ سیڑھیاں، کنویں، میدان، نالے، ندیاں، کھڑکیاں، دیواریں اور قبرستان سب کھنگال ڈالے مگر وہ نہیں ملا۔ آہستہ آہستہ زمین ان خون بھرے نشانوں کو بھی چاٹ گئی۔ مٹی کی نئی پرتیں انہیں نہ جانے کہاں لے گئیں۔ اب وہ نشان نظر بھی نہیں آتے۔ محسوس بھی نہیں ہوتے جو پہلے ایک سوکھی جھاڑی کے پاس جاکر غائب ہوجاتے تھے۔

زمانہ گزر گیا۔ یہ دوسرا جنم بھی ختم ہونے کو پہنچا۔ وقت کے کتنے پرانے ٹیلوں کے پیچھے کھڑا میں ایک کمزور، بوڑھا اور حقیر کب تک اسے ڈھونڈتا رہوں گا۔

شاید بار بار اپنے وجود کو کولتار میں بدل دینے کے بعد بھی یہ بھیانک، اداس اور اکیلا سفر جاری رہے گا۔ مگر جس دن یہ تلاش مکمل ہوجائے گی اس دن انسان بھی دوسرے انسان کے ساتھ ایک بہتر سودا کرسکے گا۔ کوئی میرے بدلے جب خون سے بھیگے میرے نصف وجود کو مجھے واپس کردے گا۔ شاید دنیا اس عجیب و غیرب سودے کے ذریعے ہی مکمل ہوگی اور سارے معنی،

سارے مفہوم خود کو آشکار کردیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو وہ دن دور نہیں جب آدمی کو اس زمین کے اوپر نہیں بلکہ اپنی نسل کی حفاظت کے واسطے زمین کے نیچے جا کر رہنا پڑے گا۔

پو پھٹ رہی ہے۔ رات بیت گئی۔ رات بیت جانے کے بعد ساری کہانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ خون میں شرابور، میری یہ کہانی بھی ختم ہوگئی۔ آسمان میں بہت سے ستارے ڈوب گئے ہیں۔ ستاروں میں بھی مٹنے اور بننے کا عجب سلسلہ جاری ہے۔ پرانے، بہت سے ستارے بھٹک کر نہ جانے کون سے اجنبی سیاروں کے قافلے میں جا ملے ہیں۔

میری تھکن ناقابلِ برداشت حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی زندگی میں کبھی کبھی میری کہانی کی یاد روشن ہو جایا کرے گی۔ ہاں مجھے احساس ہے کہ میری کہانی میں تکرار بہت تھی۔ کیونکہ یوں تو یہ میری کہانی تھی مگر میں نے اسے ایک جنونی گیت کی طرح گایا۔ ایسا گیت جس کا سُر آدمی کے گھٹنوں میں گھومتی ہوئی پیالیوں اور ہڈیوں میں پوشیدہ ہے اور جو کوئی آواز نہیں بلکہ صرف اور صرف بہتا ہوا خاموش خون ہے۔

کیا وہ اپنی زخمی انگلیوں کے ساتھ ایک بار پھر یہاں آئیں گے؟

''میری کہانیاں: ایک مایوس کن بیان''

جرمنی کے سخت گیر نقاد ''مارسل رائخ'' نے اپنی کتاب The Author of himself میں لکھا ہے'' ادیب اپنی تخلیقات کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا کہ پرندے علم طیور کے بارے میں''

میرا خیال ہے کہ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی مارسل رائخ سے تھوڑا بہت متفق تو ہونا ہی پڑے گا۔ کہانی لکھتے وقت ہم ہمیشہ ایک سناٹے کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

یہ ایک قسم کا سنگیت ہے جس کی انتہا خاموشی پر ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے ''ملارمے'' نے کہا ہوگا کہ اسرار صرف سنگیت میں ہی نہیں ہوتا، ادب میں بھی ہوتا ہے ۔لکھنا واقعی اکیلا ہو جانا ہے اور وہ بھی ایک جلتے ہوئے بخار میں اچانک اکیلا ہو جانا۔

'' مجھے بے اختیار فرنانڈو پیسوا، (پرتگال کا نوبل انعام یافتہ شاعر) یاد آتا ہے حال ہی میں اس کی موت کے بعد جب اس کا صندوق کھولا گیا تو اس میں سے ایک ڈائری برآمد ہوئی ۔ اس ڈائری میں فرنانڈو پیسوا نے ایک جگہ لکھا ہے'' ایک مکمل دنیا میں نثر کے علاوہ اور کوئی کلا نہ ہوگی۔ اس دنیا میں شاعری صرف بچوں کے لیے ہوگی جو انھیں نثر کے لیے تیار کرے گی۔''

فرنانڈو پیسوا کی بات سے بہت غلط فہمیاں پھیلنے کا اندیشہ ہے مگر میرے خیال میں شاید وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ فکشن میں شاعری کی طرح الہام نام کی کوئی شے نہیں ہوتی اور اس میں

شاعری، مذہب، فلسفہ اور یہاں تک کہ سائنس کی طرح بھی اونچے منبر سے بات کرنے کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ فکشن کی صداقت مطلق العنان نوعیت کی نہیں ہے۔ دراصل صداقت کی اس جابرانہ شخصیت اور کردار سے بچنے کے لیے ہی فکشن وجود میں آیا ہے۔ یہ کسی ''واحد سچ'' کی ڈکٹیٹرانہ شخصیت اور اس کے آہنی بازوؤں سے نکل کر آزاد ہونے جیسا ہے۔ یہ آزادی ایک 'مکتی' ہے۔ ایک لافانی موت اگر چہ فکشن ایک جھوٹ ہے مگر اس کے چاروں طرف سچ کا ایک پر اسرار سا غبار ہے۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ لکھنے والے سے اُس کی تخلیقات کے بارے میں کوئی سوال کرنا بھی بے معنی سا ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

میں پھر فرنانڈو پیسوا کی طرف واپس آتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کا یہ مقولہ بھی اس کی شاعری ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی اس بات سے متفق ہوا بھی جائے یا نہیں مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ کہانیاں بہر حال وہ نثری تحریریں نہیں ہیں جو کسی مکمل دنیا میں قیام رکھنے کے لائق ہوں یا دنیا کو مکمل بنانے میں ہی ان سے زمان و مکاں کے کسی نقطے پر کسی قسم کی مدد مل سکتی ہو اور پھر دنیا کیا کبھی مکمل ہو جائے گی؟

اپنی کہانیوں کے حوالے سے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ کہانیاں گذشتہ پانچ سال میں لکھی گئی ہیں۔ اب یہ میرے ذہن اور میرے شعور سے باہر نکل گئی ہیں۔ یہ جس کاغذ پر لکھی گئی تھیں وہ زرد ہونے لگا ہوگا۔ قلم کی سیاہی بھی آہستہ آہستہ اڑنے سی لگی ہوگی۔ آج یہ کہانیاں پکی روشنائی میں اس جگہ موجود ہیں مگر دنیا کے مکمل ہوتے ہوتے یا اس کے بگڑتے بگڑتے وہ یہاں بھی نہیں رہ جائیں گی۔

آئین اسٹائن نے ایک بہت معنی خیز بات کہی تھی، ''ماضی چاہے کتنا ہی ضدی ہو۔ وہ حال اور مستقبل کے درمیان صرف ایک داخلی غلط فہمی ہے۔''

اس لیے شاید یہ کہانیاں میرے لیے صرف داخلی غلط فہمیوں کے ایک جھوٹے سلسلے کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اگر چہ آپ کے لیے یہ ایک نئی کتاب کی صورت میں موجود ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کہانیوں میں شاعری کی طرح الہام نام کی کوئی شے ہے اور جہاں تک اوپری منبر کا سوال ہے تو وہاں تک چڑھنے میں ہی میری سانس پھول جاتی ہے اور پیر کانپنے لگتے ہیں۔ مگر یہ پوری طرح شعوری بھی نہیں ہیں۔

کہانی لکھنے والا تابوت بنانے والا بڑھئی نہیں ہے جو مردے کے جسم کے سائز کی پیمائش کرنے کے بعد تابوت میں فیصلہ کن کیلیں گاڑ دیتا ہے اور اس عمل کے بارے میں وہ آپ کو سب کچھ بتا سکتا ہے۔ مگر تابوت میں لیٹی ہوئی لاش ایک اسرار ہے تابوت ہرگز نہیں۔

مگر بہر حال یہ کہانیاں 'ڈچ تحریریں' بھی نہیں ہیں۔ ڈچ تحریریں صرف نشے میں لکھی جاتی ہیں۔

اس لیے افسوس کہ اپنی کہانیوں کے بارے میں کہنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص جو ایک مدت تک کسی خطرناک، پر اسرار بخار کی زد میں رہا ہو۔ جو بستر پر پڑا ہو، ایک ٹک ایک نیم تاریک کمرے کی چھت کو گھورتا رہا ہو۔ جس کے منھ کا مزہ غائب ہو چکا ہو، صحت یاب ہونے کے بعد کھلے آسمان کو دیکھنے کے بعد اور سڑک پر بے فکری سے چل لینے کے بعد، اس بخار کے بارے میں صرف ایک جھوٹا اور بخار سے بیگانہ بیان ہی دے سکتا ہے۔

جھوٹ وہ سب سے بڑا مابعد الطبیعاتی سچ ہے جس کے ساتھ انسانی وجود کا اٹوٹ رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ جاپان کے عظیم فلم ساز 'کروساوا' نے اپنی شہرہ آفاق فلم 'روشومن' کے حوالے سے کہا تھا۔

''انا ایک ایسا گناہ ہے جسے انسان جنم سے ہی اپنے ساتھ لیے چلتا ہے۔ انا سے آزاد ہو پانا سب سے مشکل ہے۔ انسان کے دل کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جھوٹ کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہاں تک کہ ایک مرا ہوا شخص بھی جب اس دنیا سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ جھوٹ کا ہی سہارا لیتا ہے۔ جھوٹ کے بغیر اس دنیا میں کسی کا کوئی مکالمہ ممکن نہیں۔ (روشومن کے ایک مردہ کردار کی طرح۔)''

مجھے ڈر ہے کہ میں ان کہانیوں کے بارے میں جو بھی کہوں گا وہ ایک جھوٹ اور بیگانے

بیان کے سوا کچھ نہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ میں کسی قسم کا سوانحی بیان بھی دینے سے کترا رہا ہوں۔ کیونکہ بقول چسلاوی وش سوانحیں بھی جھوٹی ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے الگ الگ ابواب پہلے ہی سے متعین شدہ ایک سلسلے سے جڑے ہوتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نا جانے کون سے نادیدہ سلسلوں اور رشتوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔

مگر میرا لکھا یہ فکشن (یہ سات کہانیاں) جھوٹ نہیں ہیں۔ بقول 'لوزا' یہ وہ زندگی ہے جیسی کہ دراصل وہ نہیں تھی اور اس لیے اسے ایجاد کرنا پڑا۔ ایک بار پھر دہراتا ہوں کہ شاعری کی طرح فکشن میں الہام نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

کیا یہ کسی قسم کی مایوسی یا قنوطیت ہے؟ ہرگز نہیں ۔ ایک سچا اور حقیقی قنوطی کبھی لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ کیوں کہ سچے قنوطی کے لیے ترسیل نام کی کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔

مگر یہ ایک کرب ناک سفر ضرور ہے۔ ''برے موسم میں'' کی آٹھ کہانیاں اور اب ''تفریح کی ایک دوپہر'' کی یہ سات کہانیاں ہر بار ایک نیا دکھ اپنی نیلی قمیص پہن کر میرے سامنے سر جھکا کر دو زانو بیٹھ جاتا تھا اور پرانے دکھوں کو اسی طرح در بدر کر دیا کرتا تھا جس طرح گھر کی پرانی اشیاء گھر سے باہر کر دی جاتی ہیں۔ مگر اب سارے دکھ بے گھر ہیں، میری دنیا ٹھوس ہوگئی ہے۔ ان بے گھر، دکھوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں بھٹک رہے ہیں؟

پتا نہیں کس نے ان کہانیوں کے حوالے سے کہا تھا کہ خالد جاوید ''دکھ'' کو ایک (Thesis) تھیسس بنا کر لکھ رہا ہے۔ وہ ''دکھ'' کا ''مہا کاویہ'' لکھ رہا ہے۔

افسوس کہ یہ غلط ہے۔ نہ کوئی تھیسس نہ کوئی مہا کاویہ بس میرے حافظے اور شعور سے باہر پریت کی طرح بھٹکتی ہوئی میری کہانیاں! میں جھوٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تک کہ یہ سطریں بھی جھوٹ سے خالی نہیں بس اتنا ضرور ہے کہ میں اس جرم کا اعتراف بھی کرسکتا ہوں۔

آخر میں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ شمس الرحمان فاروقی (جن کے نام یہ کتاب منسوب ہے) شمیم حنفی، وارث علوی، قاضی افضال حسین، عتیق اللہ، آصف فرخی (جن کا میں اس طور پر بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پاکستان میں ان کہانیوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا) فہمیدہ ریاض، نرمل ورما، اجمل کمال اور میرے بھائی نذرالحسن صدیقی کی چند مخصوص اور خلوص آمیز آراء اگر ان کہانیوں کو نہ حاصل ہوتیں یا دوستوں میں خورشید اکرم، اکرام خاور، شکوہ محسن مرزا، فرحت احساس اور رضوان الحق کی بے پناہ حوصلہ افزائیاں مجھے نہ ملتیں تو میں اس سفلے پن سے بھری ہوئی طمانیت سے بھی محروم رہتا جس کے زیرِ اثر میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے اور اس کا مجھے بخوبی احساس ہے کہ ہر قسم کی طمانیت کم از کم اس بے رحم اور بے ہنگم دنیا میں اپنی ماہیت میں بہر حال سفلے پن اور گھٹیا پن سے ہی معمور ہوتی ہے۔

شرم سار

خالد جاوید

تاریخ

۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء

دہلی

پس نوشت: میں ایک بار پھر شمیم حنفی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے سرورق کے لیے مشہور و معروف ایرانی مصور اور کارٹونسٹ ''بڈ جان'' کی ڈرائنگ عنایت کی۔ یہ ڈرائنگ انھیں ہندوستان کے نامور مصور اور 'بڈ جان' کے دوست آں جہانی 'بکی پٹیل' نے تحفتاً پیش کی تھی۔

طور پر بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پاکستان میں ان کہانیوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا) فہمیدہ ریاض، نرمل ورما، اجمل کمال اور میرے بھائی نذرالحسن صدیقی کی چند مخصوص اور خلوص آمیز آراء اگر ان کہانیوں کو نہ حاصل ہوتیں یا دوستوں میں خورشید اکرم، اکرام خاور، شکوہ محسن مرزا، فرحت احساس اور رضوان الحق کی بے پناہ حوصلہ افزائیاں مجھے نہ ملتیں تو میں اس سطلے پن سے بھری ہوئی طمانیت سے بھی محروم رہتا جس کے زیر اثر میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے اور اس کا مجھے بخوبی احساس ہے کہ ہر قسم کی طمانیت کم از کم اس بے رحم اور بے ہنگم دنیا میں اپنی ماہیت میں بہر حال سطلے پن اور گھٹیا پن سے ہی معمور ہوتی ہے۔

شرم سار

خالد جاوید

تاریخ

۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء

دہلی

پس نوشت: میں ایک بار پھر شمیم حنفی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے سرورق کے لیے مشہور و معروف ایرانی مصور اور کارٹونسٹ ''بذ جان'' کی ڈرائنگ عنایت کی۔ یہ ڈرائنگ انھیں ہندوستان کے نامور مصور اور 'بذ جان' کے دوست آں جہانی 'مکی پٹیل' نے تحفتاً پیش کی تھی۔

خالد جاوید ۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو بریلی (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ سائنس سے گریجویشن کرنے کے بعد فلسفے میں ایم اے کیا۔ کئی سال تک بریلی کالج میں فلسفہ پڑھایا۔ اس کے بعد ایک سال تک دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔

کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۰ء میں ''بُرے موسم میں'' کے عنوان سے بمبئی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد خالد جاوید کا شمار ہندوستان میں اردو کے اہم ترین نوجوان افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ اُن کی کہانیاں ہندی میں بھی شائع ہوئی ہیں۔

زیرِ طبع تصانیف میں مضامین کا مجموعہ ''کہانی، موت اور آخری بدیسی زبان'' اور ''ہم عصر مغربی فلسفے کی تاریخ'' کے علاوہ نظموں کا ایک مجموعہ ''لوگ تم پر ہنسیں گے تو کیا'' بھی شامل ہے۔ خالد جاوید نے ستیہ جیت رے کے نمائندہ افسانوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

ISBN: 978-969-568-007-0

Pak Rs: 250/-